مُحبت اب اور نہیں

مریم جہانگیر



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

محبت اب اور نہیں

مریم جہانگیر

میں نیل کرائیاں نیلکاں میرا تن من نیلوں نیل

مینوں ہجر دی سولی چاڑھیا میری اک نہ سنی دلیل

کمرے کی مدہم روشنی میں وہ لڑکی اپنی ذات سے بے گانی ہو کر ناچ رہی تھی۔ نجانے یہ کیسا ناچ تھا جس کے ہر ردھم سے خود اذیتی جھانک رہی تھی۔ موسیقی کی چیرتی ہوئی آواز کمرے کی سماعت پہ گراں گزر رہی تھی۔ موسیقی کے دیواروں سے کلام کی طرح جیسے تان اور سروں کو سرور مل رہا تھا اسی طرح ایک درد اس کے اندر بھی موجود تھا جسے وہ ہر صورت باہر لانا چاہتی تھی۔ اندھیرے کو روشنی کی ایک رمق چاہیئے تھی لیکن یہ رمق ڈھونڈنے کا نجانے کون سا راستہ تھا۔ اس کے پاؤں فرش پہ یوں تھرک رہے تھے جیسے وہ پانی پہ چل رہی ہو۔

اسی جے رل کے بیندے نظارا عشق دا لیندے

وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں ایک دوسرے میں پیوست کر کے سینے کے قریب لے آئی۔ کسی کھوئی ہوئی شے کو اپنے پاس واپس لانے کی ناکام سے کوشش پہ اس کے دماغ کا ایک کونا اس کی بے بسی پہ ہنس رہا تھا۔

تو میرا ساتھ نبھاندو گلے نہ دل وچ رہندے

کھلے بال گلے میں جھول رہے تھے۔ یہاں وہاں سر کو گھماتے ہوئے اس نے آئینے میں اپنی خالی آنکھوں کو دیکھا۔ بالوں کی کئی لٹیں اس کے لبوں سے لپٹ رہی تھیں لیکن اس کو غیر متوقع طور پہ کوئی الجھن نہ محسوس ہوئی۔ اس کی وحشت کو مغنیہ کی آواز ہوا دے رہی تھی۔ اور وہ اپنی جان کو اذیت دے کر ماضی کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

تو ہتھی آپ اجاڑے۔۔۔

اس نے سنگھار میز پہ پڑی پرفیوم کی شیشیاں نیچے گرا دیں۔ وہ ٹوٹ چکی تھیں بالکل اس کے دل کی طرح چور چور ہو گئی تھیں۔ وہ انہی کے پاس بیٹھ گئی۔

دو دل ہسدے وسدے۔۔۔

ٹوٹے ہوئے کانچ کے ٹکڑوں پہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ زور سے رکھے۔ لبوں سے درد کو برداشت کرنے پہ کوئی آہ نہ نکلی۔ اس کی بند آنکھوں کے پپوٹوں پہ اتنا سکون تھا جیسے وہ مرگ الموت میں مبتلا ہو اور ابھی بڑی ہی مشکل اسے سجدہ کرنے کی اجازت ملی۔ تیمم کرنے کے لئے اس کے پاس مٹی کی جگہ کانچ ہو۔

اوکیہڑی سوکن میری۔۔۔

اس کے ہاتھوں سے خون رس رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اگر آنکھیں بھی خون بہا سکتی تو کم از کم اس وقت اس کی آنکھیں تو ضرور ہی بہاتی۔

تواو داناں تے دس دے۔۔۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ اب اپنے چہرے پہ پھیرے۔ چہرہ بھی خون آلود ہو چکا تھا۔

میں تیری کملی ہوئی۔۔۔۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ کندھوں پہ جا رہے تھے اور پھر ہوا میں دور تک جا رہے تھے۔ جیسے وہ خود سے کچھ جھٹکنا چاہتی ہو۔

وے تینوں خبر نہ کوئی۔۔۔

اب اس کا رقص فرش کی جگہ کانچ کے ٹکڑوں پہ تھا۔ رستے ہوئے پیروں سے اسے رتی برابر بھی تکلیف نہیں پہنچ رہی تھی۔ میٹھا میٹھا سا چین تھا جو اس کے اندر اتر رہا تھا۔ وہ جھومتی رہی اور جھومتے ہی جھومتے میز پہ پڑے موبائل کے پاس آن رکی۔ ایک لمحے میں اسے اپنی مٹھی میں دبوچا اور دوسرے لمحے دیوار پہ دے مارا۔ موبائل سے نکلتی آواز کی لہریں معدوم ہو گئی تھی۔ اب کمرے میں خاموشی تھی۔ چند ہی ثانیے میں خاموشی بھی نہ رہی۔ اس کی سسکیاں گونجنے لگی۔ وہ سر گھٹنوں میں دیئے باآواز بلند خود کلامی کر رہی تھی۔

"لوگ تکلیف تکلیف کرتے ہیں۔ تکلیف یہ نہیں ہوتی کہ آپ یک طرفہ محبت کریں اور دوسرے کے دل میں آپ کے لئے محبت نہ جاگے۔ تکلیف یہ بھی نہیں ہوتی کہ آپ کسی کو پسند کریں، ہمت اکھٹی کریں، اس سے اظہار کر دیں اور وہ آپ کو ٹھکرا دے۔ تکلیف تو یہ ہوتی ہے کہ آپ محبت اور اس کے وجود سے بے خبر اپنی زندگی کو اپنے طریقے اور اپنے اصولوں سے گزار رہے ہوں اور کوئی اچانک سے آپ کی زندگی میں آ جائے۔ آپ اسے روکنے کی کوشش کریں لیکن وہ آپ کی زندگی میں گھستا ہی چلا جائے۔ آپ کے ہاتھ کو اتنی نرمی اور اتنی محبت سے تھام لے کہ آپ اس سے اپنا ہاتھ چھڑا ہی نہ سکیں۔ آپ کو خوابوں کے راستے پہ لے کر چلے، آپ کے راستے میں کہکشاں بچھائے، آپ پہ اپنی جان لٹائے، پھر جب آپ کو اس کی عادت ہو جائے، آپ کے دل کی بنجر زمین پہ محبت کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ آپ کو اس کی ضرورت محسوس ہونے لگے، آپ کو اس کی عادت پڑ جائے تو وہ شخص منہ موڑ لے۔ اس شخص کے منہ موڑتے ہی وہ کونپلیں یکدم سے درخت بن جائیں اور آپ کی ساری ذات پہ حاوی ہو جائیں۔ پھر وہ درخت آکٹوپس بن جائے اور آپ کی ہڈیوں کو دبوچنا شروع کر دے۔ آپ اس شخص کی طرف دیکھیں اور وہ آپ کے منہ پر تھوک دے۔۔۔۔

"یہ ہوتی ہے تکلیف!

یہ ہوتی ہے اذیت!

اسے کہتے ہیں ٹھکرانا!

اسے کہتے ہیں مرنا!"

اس نے اپنا سر اٹھایا تھا۔ آنسوؤں کی لکیریں چہرے پہ نقش تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھ پھر کانچ پہ رکھے اور دبانے لگی۔ خود کلامی جاری تھی۔

"کانچ کیا تکلیف دیتا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔۔۔ انسان کیا تکلیف دیتا ہے؟ وہی تو تکلیف دیتا ہے۔۔۔۔ سب کچھ چھین لیتا ہے آنکھ سے خواب، سانس سے امید اور اذیت سے اس کے ہونے کا احساس بھی۔ اللہ جی آپ سے ٹھیک پوچھا تھا فرشتوں نے کہ کیوں بنا رہے ہیں انسان کو۔ اس نے واقعی فساد ہی کرنا تھا۔ یہ فساد ہی کر رہا ہے۔"

"اس نے نیچے فرش سے اپنا دوپٹہ اٹھایا۔ سر کے گرد لپیٹا۔ کونے میں بچھی جائے نماز پہ جا بیٹھی۔ اس کے راز و نیاز شروع ہو گئے۔ اللہ جی آپ کے لئے کیا نا ممکن ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ پھر ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔ آپ کی ساری خدائی سے مجھے ایک وہ شخص کیوں نہیں مل سکتا۔ میں نے اتنی دعائیں مانگی ہیں۔ میں نے اتنے وظیفے کئے ہیں کہ مجھے لگتا ہے میری انگلیوں کے پوٹے بھی گھس گئے ہیں۔ تیری اتنی ثناء بیان کرنے کے بعد بھی مجھے وہ کیوں نہیں مل سکتا۔ ایک مشرک صنم صنم کرتا رہے اس کے منہ سے غلطی سے احد نکل جائے تو اس کو تو فوراً جواب دیتا ہے اور ایک میں ہوں اللہ اللہ کر رہی ہوں۔ تجھے میرے اس مانگنے سے کیوں کوئی سروکار نہیں ہے۔ اگر وہ شخص میرے حق میں بہتر نہیں ہے اچھا نہیں تو یا اللہ تو تو خالق کائنات ہے ناں؟ ہر شے تیرے ایک کن کی محتاج ہے۔ تو اسی کو میرے حق میں بہترین بنا کر مجھے عطا کر دے۔ اللہ جی کیا میرے نو سال ضائع چلے گئے ہیں؟ میں اسے ایک سمجھ کر، واحد جان کر اپنی زندگی کا مرکز مان کر اس کے سامنے گھٹنے ٹیکتی رہی ہوں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے احساس نہ ہو۔ اگر اس کا احساس مر بھی گیا ہے تو اللہ جی تو تو ہی القیوم ہے ناں؟ اس کا احساس زندہ کر دے۔ اللہ جی آپ تو مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں اس کے دل میں میری محبت کو یوں زندہ کر دیں کہ وہ سر کے بل چلتا میرے پاس آئے۔ کچھ اور نہیں تو بس وہ مجھے اپنا لے۔ مجھے خود سے کاٹ کر نہ پھینکے۔ مجھے اپنے جوتوں کی جگہ پہ رکھ لے لیکن مجھے خود سے دور نہ کرے۔ اللہ جی میرے پاس تو مانگنے کے لئے دعا میں اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اللہ جی میں کیا مانگوں گی؟"

وہ مسلسل رو رہی تھی۔ "اللہ جی مجھے تکلیف ہو رہی ہے" وہ اونچی آواز میں پکار رہی تھی، خود اذیتی کا درد اس کی آواز میں شامل تھا۔ "اللہ جی اس سے دور ہونے کا سوچ کر مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ میرا جسم کسی گاڑی کے نیچے کچلا جا رہا ہے اور اس گاڑی کے ہر پہیے پہ ہزاروں نوکیلے کیل ہیں۔ وہ سب میری بوٹیوں میں گھستے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ جی مجھے اس سے دور نہ کر۔ اللہ جی مجھے یہ تکلیف نہ دکھا۔"

وہ سجدے میں گر گئی۔ "اللہ جی آپ تو اپنے بندوں کو ستر ماؤں سے زیادہ چاہتے ہیں۔ میں بھی آپ کی بندی ہوں۔ آپ کو مجھ پہ رحم کیوں نہیں آرہا؟ آپ جانتے ہیں میرے آنسوؤں میں کھوٹ نہیں ہے۔ میرے جذبے پاکیزہ ہیں۔ میں نے کبھی اس کا یا کسی بھی اور کا برا نہیں چاہا۔ مجھے اس تکلیف سے نکال دیں۔ مجھے اس ڈر سے نکال لیں کہ وہ مجھ سے چھین لیا جائے گا۔ اللہ جی وہی تو میرا جینے کا مقصد ہے۔ میں تو اس کی پسند کے رنگوں کے علاوہ رنگ نہیں پہنتی۔" اس نے اپنا سر سجدے سے اٹھایا۔ آنسوؤں سے تر چہرہ وحشت زدہ لگ رہا تھا۔ کچھ چھن جانے کے خوف سے اس کی آنکھیں خالی سی لگ رہی تھیں۔ اس نے اپنی گردن بائیں طرف موڑی۔ دیوار کے ساتھ پڑے قد آدم شیشے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ ایک اور آنسو اس کی آنکھ سے بہہ نکلا۔ "اللہ جی میں نے خوبصورتی بھی اسی کے لیے تجھ سے مانگی کہ میں اس کو خوبصورت لگوں۔ میں اس کو اچھی لگوں۔ میں نے ایک ایک قدم ناپ تول کر اٹھایا۔ مجھے وہ صرف اس دنیا میں ہی نہیں آخرت میں بھی چاہیے۔ میری انگلیوں کی پوروں میں ہے وہ شخص۔" وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں اپنی آنکھوں کے سامنے کیے زارو قطار روئے چلی جا رہی تھی۔

"میں اسے دیکھے بغیر تصویر کر سکتی ہوں، مجھے اس کی پلکوں کی لمبائی معلوم ہے، اس کے لبوں کا کٹاؤ مجھے ازبر ہے، میں اس کی کشادہ پیشانی پر پڑنے والے بل گنے بغیر بتا سکتی ہوں۔ مجھے تو اس کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔ مجھے نو سال کے لیے وہ دے کر کیسے مجھ سے تو وہ لے سکتا ہے اللہ جی ابھی تو وہ میرے ہاتھ میں تھا، ابھی کل تک وہ میرے ساتھ تھا۔ وہ میرا سب کچھ ہے۔ وہ میرا اس دنیا میں جینے کے لیے سہارا ہے۔ وہ میری آرزو ہے 'وہ میری پہلی محبت ہے۔ پہلی محبت کے حوالے سے آزمائش نہ ڈال۔ مجھے وہ دے دے۔ میں وہ سب کروں گی جو تو چاہتا ہے۔ اللہ جی میں نے آج تک کوئی چیز اتنی شدت سے نہیں مانگی 'کسی بھی چیز پہ آ کہ میں اٹک نہیں گئی 'لیکن اس شخص کو میں مسلسل مانگ رہی ہوں 'اللہ جی وہ شخص میری آنکھوں میں آن بیٹھا ہے 'میں اس کے سوا کچھ بھی دیکھ نہیں سکتی۔ اللہ جی وہ میرے ہاتھوں میں ہے، میں اس کے علاوہ کسی کو چھو نہیں سکتی۔ اللہ جی وہ میرے قدموں میں ہے، میں کسی اور راستے پر جا ہی نہیں سکتی۔ اللہ جی وہ میری آواز میں ہے، اس کے علاوہ میں کسی اور کے سامنے بیان نہیں ہو سکتی۔"

وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ زمین پر گرا دیئے تھے اور ہاتھوں پر اپنا سر گرا کر اسی شدت سے رونا جاری رکھا ہوا تھا۔ اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ہچکی باندھ چکی تھی، وہ مسلسل ہچکیوں میں اللہ جی اللہ جی کی گردان کیے جا رہی تھی۔

کمرے کے درو دیوار دیر تک سنتے رہے کہ وہ اللہ سے سوال پوچھتی رہی اور یقین دہانیاں لیتی رہی کہ اللہ جی وہ مجھے نہیں چھوڑ سکتا ناں؟ اللہ جی وہ میرا ہے ناں؟ اللہ جی وہ پہلے جیسا ہو جائے گا ناں؟ اللہ جی اس معاملے میں آپ مجھ پر آزمائش نہیں ڈالیں گے ناں؟

کمرے کی کھڑکی سے چاند نے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ پچھلے کئی سالوں سے اس کے ہونے پہ بھی انہی مناجات میں کھوئی ہوئی تھی اور آج اسے کھونے کے بعد بھی دعائیں ہی مانگ رہی تھی۔ ہوا کی رتھ پر کمرے میں جائے نماز پر جذب ہوئے آنسو فضاؤں میں شامل ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کن من کن من بارش شروع ہو گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

نہیں تھا زور اس کی ستم نوازیوں کا مگر

مجھے بھی حوصلے میرے خدا سے ملے

کالے سیاہ بالوں کی پونی ٹیل بنائے وہ تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔ پیچھے آتا لڑکا اس کی سبک رفتاری کا ہمنوا بننے کی ناکام کوشش کر تا ہلکان ہوا۔

پاکیزہ پاکیزہ میری بات تو سنو'' وہ اسے یوں پکار رہا تھا کہ آواز حلق سے نہیں دل سے نکلتی محسوس ہوئی۔ "

"بولو اب کیا تکلیف ہے؟" اس نے رکے بغیر مڑے بغیر آفتاب نور کو جواب دیا۔

"میں تمہارے حوالے سے واقعی سریس ہو" وہ یقین دہانی کروانے لگا۔

"عمر دیکھی ہے اپنی اور میری' یہی باتیں تم زیادہ نہیں بس دو سال بعد سوچنا اور تم خود ہنسو گے۔" پاکیزہ ابھی بھی نہیں مڑی۔ اس کی فولڈ آستین سے جھانکتی سانولی سلونی نازک کلائیاں سورج کی چمک میں پر کشش معلوم ہو رہی تھیں۔

"تم مجھے آزما لو۔ دو سال چھوڑو، چار سال آزما لو۔ میں تمہیں ہمیشہ تمہارے پیچھے ہی ملوں گا۔ میں ہمیشہ تمہیں تمہارے ساتھ ہی ملوں گا۔ میرا تمہارا ساتھ آج کا تو ہے نہیں ہم نرسری سے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ تمہیں مجھ پہ یقین کیوں نہیں آجاتا۔" آفتاب کے لہجے میں اصرار کی لو ٹمٹمائی۔

ایک لمحے کو پاکیزہ کا دل بھی جذبات کی شدت محسوس کرنے کی خاطر بے تاب ہوا۔ ذہن کے نہاں خانوں پہ اچانک سے بچپن کی بنیادوں نے دستک دی۔ وہ پھسلتے پھسلتے سنبھلی۔ آفتاب نور نے اسی کمزور لمحے میں اپنے قدم پاکیزہ کے قدموں کے ساتھ ملا ہی لیے۔ پاکیزہ کی منزل آچکی تھی۔ سانولی سی لڑکی چھلاوے کی طرح تیزی سے چلتی ہوئی اس کے پہلو سے اپنا آپ بچا کر نکل گئی۔

سنو ناں؟'' وہ پھر گویا ہوا۔

"سننے کے لئے رکھا ہی کیا ہے۔'' وہ تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہوئے اونچی آواز میں بولی۔

ابھی تو میں نے کچھ کہا ہی نہیں۔'' کتنی ان کہی باتوں نے اس کے اندر سر اٹھایا اور وہ گھرے کالے بالوں کی پونی ٹیل بنائے لڑکی کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم کچھ کہو بھی تو فرق نہیں پڑتا۔'' جواب بالکل صاف اور سپاٹ ملا۔

فرق کیوں نہیں پڑتا۔ میں اپنے منہ سے اعتراف کر کر تھک چکا ہوں۔ اور تم کہتی ہو کہ فرق ہی نہیں پڑتا؟ میں کہہ رہا ہوں میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' آفتاب اس کے کھرے جواب سے بے قرار ہوا۔

وہ سکول کی گھنٹی کے قریب تھی۔ دروازے کے پیچھے پڑے ہتھوڑے کو دھان پان سی لڑکی نے اٹھا کر زور سے گھنٹی پر دے مارا۔ ٹن کی بازگشت سے پورا سکول لرز اٹھا۔

"میں تمہارا بہت خیال رکھوں گا۔ ہر اتوار کو کپڑے میں دھوؤں گا۔ جو تم چاہو گی ہمیشہ وہی ہو گا۔ میں ایسے کپڑے لوں گا جن کو استری کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ تم ایک دفعہ مان جاؤ میں باقی ساری دنیا کو منالوں گا۔ صبح نوکری پہ جاؤں گا، واپس آکر برتن بھی دھو دوں گا۔ تمہاری پیاری آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں آنے دوں گا۔ تم لیٹے لیٹے تھک جاؤ گی تو تمہارے پاؤں بھی دباؤں گا۔ پلیز پاکیزہ مجھے سیریس لو۔ میں واقعی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" آفتاب کی بڑبڑاہٹ مسلسل جاری تھی۔ وہ ایک ذہین لڑکی کو لالچ دے رہا تھا،

پاکیزہ کو ہنسی آگئی۔ اس نے مڑ کر آفتاب کو دیکھا۔

"تم اگر میرے ساتھ کلاس میں میرے ساتھ داخل ہوئے اور سب کی سوالیہ نظریں ہم پر اٹھی تو میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔" بے ساختہ مسکراتے لبوں کے ساتھ آنکھوں میں بلا کی سختی امڈ آئی۔ اب آفتاب کو وہیں رکے رہنا تھا اور پاکیزہ کو اکیلے ہی کلاس ہفتم میں داخل ہونا تھا۔

فلک اپنی تمازت کے سندیسے زمین پہ بھیجتا اس پریت کے انوکھے ڈھنگ دیکھتے حیرت زدہ ہوا۔

"آٹھویں جماعت میں پڑھتے یہ بچے دنیا کی سرد و گرم سے انجان اپنے اپنے دائرے میں اپنا اپنا کھیل کھیل رہے تھے۔ دونوں انجام نہیں جانتے تھے۔

ایک تعلق کو تڑپ رہا تھا اور دوسری لاتعلقی چاہتی تھی۔

ایک کو مثبت جواب چاہیئے تھا اور دوسری سوال سننے کی خواہش بھی نہیں رکھتی تھی۔

ایک کے اندر احساسِ محرومی سر کھولے بیٹھی تھی اور دوسری کو احساسِ محرومی کا شکار ہونے سے ڈر لگتا تھا۔

!وہ دونوں بھاگ رہے تھے اور جس چیز سے بھاگ رہے تھے۔۔۔ وہی ان کے سامنے آنے والی تھی

☆☆☆☆☆☆☆☆

ہر لفظ کتابوں میں تیرا عکس لئے ہے

اک پھول سا چہرہ مجھے سونے نہیں دیتا

پاکیزہ اپنے نام کے جیسی ہی تھی 'صاف شفاف سی، اجلی سوچ والی، مستحکم سی، ذہین اور بلا کی پر اعتماد۔۔۔ اس کی سانولی رنگت میں نمک سی کشش تھی۔ دیکھنے والے ایک دفعہ اس کے دائرے میں داخل ہو جاتے تو اس کی چمکتی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس ملکے ترش سے ذائقے کو چکھ لینا چاہتے لیکن وہ حسین نہیں تھی کہ کوئی اسے دیکھ کر اس کا ہو جائے۔ وہ ذہین تھی، فطین تھی، خوش

اخلاق تھی اور خوش گفتار بھی۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ وہ بس نمک تھی، نمک جیسی تھی۔ اس کا ہونے کے لئے اسے پسند کرنے کے لئے ذائقے کی بہترین حس کا ہونا بھی ضروری تھا۔ ویسے بھی کون تھا ایسا جو اس کو چکھنے کی جسارت کر سکے؟ یہاں تو کوئی ایسا بھی نہیں تھا جو سکون سے اس کے نمکین روپ سے اپنی آنکھیں سینک سکے۔ وہ فوراً اپنے اوپر پڑنے والی نظروں کو اپنی گرفت میں لے لیتی تھی۔ اور مقابل کو پھر ایسا جواب دیتی تھی کہ دوبارہ وہ سوال اٹھنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔

وہ ذہین تھی اور خوش اخلاق بھی لیکن اس کی سب سے بڑی طاقت اس کا تنہا ہونا تھا۔ وہ اکیلی تھی 'بہت شروع سے اکیلی۔۔۔ اس نے اپنی ذات کے اندر اپنا سارا جہاں بسا رکھا تھا_ اسے کسی دوسرے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اکیلے رہتے رہتے اسے چودہ سال کی عمر میں ہی تنہا رہنا آ گیا۔ گھر میں ایک ہی پھوپھو تھی اور پوری دنیا میں ان کے علاوہ اور کوئی بھی رشتے دار نہ تھا۔ والدین کی وفات کے بعد اس نے ایک پھوپھو کا ہی چہرہ دیکھا تھا۔ ایک مسکین سا تنہا سا چہرہ جو سامنے کھل کر نہیں آتا تھا اور صاف چھپتا بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا وہ کچھ بھی بن جائے گی لیکن اپنے چہرے پہ اس چہرے کے رنگ نہیں چڑھنے دے گی۔ حقیقت میں تو وہ خود بھی اس چہرے کے اصل رنگوں سے واقف نہیں تھی۔ اسی چھپن چھپائی میں یہ دونوں ساتھ رہتے ہوئے بھی اکیلی اور اکیلے رہتے ہوئے بھی ساتھ تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تمہاری کج ادائیاں کوئی اور سہہ کر دکھائے تو مانو
یہ جو ہم میں تم میں نباہ ہے میرے حوصلے کا کمال ہے

"پاکیزہ بیٹا آپ اٹھو اور اپنے پیچھے کی سب rows کے سٹوڈنٹس سے سبق سن لو۔" سر اسد نے پاکیزہ کو اٹھایا۔

"انمول بیٹا آپ اس طرف سے سبق سن لو'' دوسری طرف کے لیے کلاس کی دوسری بہترین لڑکی کو اٹھایا گیا۔

پاکیزہ اٹھی اور یکے بعد دیگرے اپنے ہم جماعتوں سے سبق سننے لگی۔ آگے کی نشستیں لڑکیوں اور پیچھے کی نشستیں لڑکوں کے لئے مختص تھیں۔

" ابھی سبق سنتے وہ کلاس کے درمیان میں ہی پہنچی کہ اسے شناسا آواز سنائی دی۔" پاکیزہ

پاکیزہ نے آواز کے تعاقب میں مڑ کر اس کا چہرہ دیکھا۔ سفید رنگت میں سرخیاں گھلی ہوئی دکھائی دی۔ آنکھوں کے ڈورے بھی کچھ کچھ سرخ سے لگے۔

"ہاں بولو" اس نے رسما جواب دیا۔

''مجھ سے سبق تم سن لو'' وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ پاکیزہ سے فیور مانگنے لگا۔

ایک لمحے کو پاکیزہ کا دل نرم پڑا پھر اس نے اپنا چہرہ موڑ لیا۔ ''تمہاری لائن سے انمول سن رہی ہے، اسی کو سناؤ۔''

وہ چاہتی تو آفتاب سے سبق سن لیتی۔ اسے سر اسد اور انمول دونوں نے کچھ نہیں کہنا تھا لیکن وہ اپنے گرد کھینچے گئے دائرے سے باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی۔ اس نے اس جملے کو بھی نظر انداز کر دیا۔

"سبق تو میں تمہیں ہی سناؤں گا ورنہ نہیں سناؤں گا۔" وہ سبق سنتی رہی' اسکی پشت آفتاب کی طرف تھی لیکن وہ بغیر دیکھے بھی بتا سکتی تھی کہ انمول سبق سننے آفتاب کے سر پہ پہنچ گئی ہے۔

"آفتاب تم سناؤ۔" انمول نے آفتاب کو پکارا۔ وہ لاشعوری طور پر پیٹھ کیے کان کھولے کھڑی رہی۔

"میں نے نہیں سنانا۔" آفتاب نے دوٹوک جواب دیا۔

"کیوں نہیں سنانا؟؟" انمول نے حیرت سے پوچھا

"نہیں مجھے نہیں سنانا۔" آفتاب نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیتے ہوئے کہا۔

سزا کے لئے وہ خود کو خود ہی نامزد کر رہا تھا لہذا انمول اگلے ہم جماعت کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پاکیزہ کو معلوم تھا کہ وہ کھڑا ہے۔ وہ جو شہر کی مہنگی ترین اکیڈمی hawks میں پڑھتا تھا اور بات بات پہ میری اکیڈمی کا نام تو سنا ہو گا جیسا شوخا جملہ بولتا تھا۔ کلاس میں کھڑا ہو تھا۔۔۔ بمشکل اسے نظر انداز کر کے پاکیزہ اپنی سیٹ پر واپس آئی۔ کلاس میں چار پانچ لوگ کھڑے تھے جن کو سبق نہیں یاد تھا۔

آج سر اسد کو ان بچوں کی لاپرواہی پہ غصہ ہی آ گیا۔ انہوں نے پتلی سی چھڑی اٹھائی اور پیچھے کھڑے لڑکوں کے پاس چلے گئے۔ اوپر سے سخت اور اندر سے حلوہ سی لڑکی کا دل کانپا۔ اس کے تصور میں بڑی بڑی آنکھوں میں تیرتے سرخ ڈورے آ گئے۔ اس نے پیچھے مڑ کر پھر بھی نہ دیکھا۔ چھڑی مارنے کی آواز آ رہی تھی۔ ہر لڑکے کو تین یا چار چھڑیاں پڑی تھیں۔ پاکیزہ نے آواز سے ہی اندازہ لگایا۔

" کبھی پڑھ کر نہیں آتے، کبھی سناتے نہیں ہیں۔" انمول نے تبصرہ کیا۔ وہ بھی جانتی تھی کہ آفتاب نے جان بوجھ کر سبق نہیں پاکیزہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ساتھ ہی تفریح کی گھنٹی بجی۔ سنایا۔

پاکیزہ لنچ لینے کلاس سے باہر نکل آئی نجانے کیوں اس نے ایک کی جگہ دو جوس لئے۔ کلاس کے دروازے کے ہینڈل کو تھامے اس نے اسی سوال کو خود سے پوچھا تو اسے جواب مل گیا۔ وہ آفتاب سے معافی مانگنے والی تھی۔ کلاس کے اندر داخل ہوئی تو وہ اسے نظر نہ آیا۔ اس کی نشست پہ نظر خود ہی بھٹک گئی لیکن اس کا توبستہ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

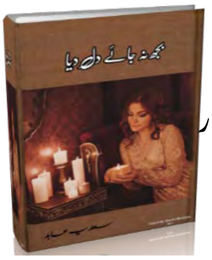
بچھڑے تو قربتوں کی دعا بھی نہ کر سکے

اب کے تجھے سپردِ خدا بھی نہ کر سکے



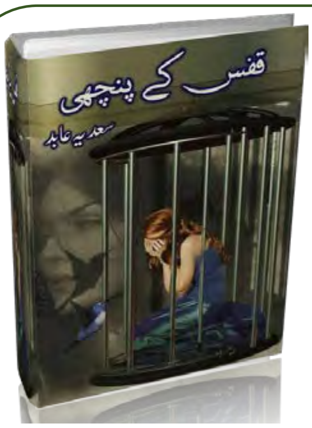
عہدِ وفا

ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا مُنفرد ناول، مُحبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



بُجھ نہ جائے دِل دیا

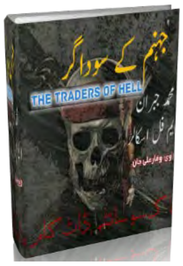
سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، مُحبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



قفس کے پنچھی

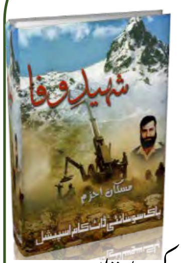
سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے جلد، کتابی شکل میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔

آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



جہنم کے سوداگر

مُحمد جبران (ایم فِل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔



شہیدِ وفا

مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

آپ بھی لکھیے:

کیا آپ رائٹر ہیں؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پر پبلش کروانا چاہتے ہیں؟؟؟

اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس میں شمار ہوتی ہے۔

صبح کے پرندے رزق کی تلاش میں چہچہاتے اڑتے فلک کو حسین بناتے نظر آئے۔ان کے نغموں سے کانوں میں رس سا گھلنے لگا۔

کلاس کے عقب میں لگی کھڑکیاں مسلسل کھل رہی تھیں اور بند ہو رہی تھیں۔ان کے شور نے ایک بے سروپا ہنگامہ برپا کیا ہوا تھا۔وہ آسانی سے ان دو مختلف آوازوں کے درمیان کے فرق کو اپنے مزاج پہ اثر انداز ہوتا محسوس کرتی رہی۔ابھی تک کوئی اور ہم جماعت آیا بھی نہیں تھا۔سکول لگنے میں پندرہ منٹ رہتے تھے۔پاکیزہ جو کہ ہفتم جماعت میں ہونے کے باوجود ہیڈ گرل تھی پہلے ہی آچکی تھی۔اس کے آنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ہیڈ گرل تھی۔وجہ وہ معافی تھی جسے مانگنے کا ارادہ وہ باندھ چکی تھی لیکن موقع مکھن لگے بال کی طرح ہاتھ ہی نہیں آرہا تھا۔اس نے آگے بڑھ کر کھڑکیوں کے پٹ بند کر دیئے۔

وہ لاشعوری طور پر کبھی کلاس کی دیوار پہ سجی گھڑی کو دیکھتی اور کبھی کوریڈور میں آویزاں گھڑیال پر نظریں جا ٹھہرتیں۔آج اسے انتظار تھا۔سو ہواؤں نے بھی مدھم رفتار تھام لیا اور وقت بھی ہلکے ہلکے پانیوں پہ بہتا چلا گیا۔کتنا ہی آہستہ کیوں نہ بہتا اس کو آخر بیت جانا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے کلاس کھچا کھچ بھر گئی۔کوریڈور میں بھی مختلف قدموں کی دھمک ابھرتی اور معدوم ہوتی رہی۔سب آگئے بس ایک وہ ہی نہیں آیا تھا۔پاکیزہ نے سارا دن اپنے جذبات پہ قابو پائے رکھا۔آخری پیریڈ میں بطور خاص کسی ٹیچر نے آفتاب کے دوست حمزہ سے آفتاب کے متعلق پوچھا تو اس کے کان کھڑے ہو گئے "سر اس کو بخار ہے۔اسی لیے وہ کل بھی ہاف لیو لے کر گیا تھا۔"

پاکیزہ دل ہی دل میں خود کو ملامت کرنے لگی۔''وہ تو ہے ہی بے وقوف،کہہ رہا تھا تو میں سن ہی لیتی سبق۔''اس کے اندر ندامت نے سر اٹھایا تھا۔''ہے تو میرا ہم جماعت ہی۔اگر میں خود اس کو راستہ نہیں دوں گی تو وہ بھلا کیسے گزرے گا لیکن تھوڑی بہت انسانیت مجھ میں بھی ہونی چاہیئے۔انسانی ہمدردی کے تحت ہی اس کے کانپتے ہاتھ دیکھ لیتی۔سبق سن لیتی تو بخار میں بے چارے کی سینکائی تو نہ ہوتی۔"

اگلے دو دن مزید وہ نہ آیا تو مجبوراً پاکیزہ نے حمزہ سے آفتاب کے گھر کا نمبر لے لیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

زباں خاموش آنکھوں میں نمی ہو گی

یہی بس اک داستانِ زندگی ہو گی

چولہے پر پڑی چائے کی دیگچی میں سے بھاپ نکل کر مختلف شکلیں بدلنے لگیں۔ہلکی سی آنچ پہ مسلسل پڑی ہوئی چائے آدھی رہ چکی تھی۔پاس کھڑی بندی اپنے ہوش و حواس میں ہوتی تو شاید دیگچی کو اس دہکتے رہنے کے عذاب سے نجات دے دیتی۔پاکیزہ اچانک سے باورچی خانے میں داخل ہوئی اور معمول کا منظر دیکھ کر چونکی۔

"پھوپھو"پاکیزہ نے پکار سے ان کو حال میں واپس لایا اور چولہا بند کر دیا۔

"تمھیں پتہ ہے پاکیزہ زندگی میں ہم کبھی کبھی اپنے دائرے میں رہتے ہوئے اسی دائرے کے ہو کر رہ جاتے ہیں - ہم لاکھ سر پٹختے ہیں، آہ و بکاہ کرتے ہیں، تڑپتے ہیں لیکن دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے - پہلے پہل ہمارے خواب بھاپ بن کر دائرے سے باہر نکلتے ہیں، اس سے ہمیں لگتا ہے کہ آزادی بس ملنے ہی والی ہے۔ ہمارے پر نکل آئیں گے اور ہم اڑنے لگ جائیں گے لیکن جوں جوں وقت بیتتا ہے ہماری خواہشیں اسی بھاپ کی طرح اڑ جاتی ہے، ایک دن ہماری زندگی ہمارے بے خواہش جسم سے بھی نکل جاتی ہیں لیکن دائرہ وہی رہتا ہے وہیں کا وہیں۔" تسکین طبعی طور پہ اسی باورچی خانے میں موجود تھی لیکن ان کا ذہن کسی اور ماحول میں سانس لیتا محسوس ہوا۔

پینتالیس کے ہندسے کو عبور کر کے اب اکثر ہی وہ ایسی لایعنی باتیں کرنے لگ جاتی اور پاکیزہ خاموشی سے سنتی رہتی۔ اس کی تنہائی میں اجنبی آوازیں اکثر نعمت معلوم ہوا کرتیں۔

"خالہ دائرہ آتا کہاں سے ہے؟" پاکیزہ نے چولہے کو بند کر کے دیگچی سے چائے کو کپ میں انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"دائرہ ہمارے باہر سے ہمارے ماحول سے آتا ہے۔ تم نے سرکس میں رنگ ماسٹر دیکھا ہے۔ لوگوں کو ہنسانے کیلئے ایک رنگ کے اندر وہ جوکر بنا کیسے کیسے کرتب دیکھاتا ہے۔ اس کا رنگ، اس کا دائرہ کہاں سے آتا ہے۔ یہ لوگوں کا رویہ لوگوں کی طلب ہوتی ہے جو اسے دائرے کے اندر قید کر دیتی ہے - پھر اس سے پوچھا جائے کہ تم یہ کام کیوں کرتے ہو؟ اسی دائرے میں کیوں رہتے ہو؟ وہ کوئی سچا مجبوری کا رونا روتا ہے یا اپنی عزت رکھنے کے لئے اس دائرے میں رہنے کو اپنا جنون بتاتا ہے۔ سچ تلخ ہے لیکن ہے تو یہی کہ وہ دائرے میں نہ رہے تو اس معاشرے میں جی بھی نہ سکے۔ ہمارے دائرے بھی ویسے ہی ہیں۔ ہم سب اپنی اپنی زندگی کے سرکس کے رنگ ماسٹر ہیں۔ ہمارے گرد دائرے لوگوں کے ڈر سے بنتے ہیں لیکن ہم کہتے ہیں ہم بڑے تہذیب والے ہیں۔ ہم نے اپنی حدود خود قائم کی ہیں۔ جو زیادہ ستے ساوترے بنتے ہیں ان کے مطابق یہ دائرے وہ اللہ جی کی خوشی کے لئے اپنے گرد قائم کر لیتے ہیں۔" تسکین کا دھیان پاکیزہ پہ نہیں تھا اور نہ ہی چائے پہ۔ اس کا دماغ کسی کو دکھائی نہ دینے والے دائروں پہ تھا۔

"کیا کوئی دائرے سے باہر نہیں آ سکتا؟" پاکیزہ بات سے بات نکال رہی تھی کہ شاید اسی طرح کوئی سرا پکڑائی دے۔

"ہر دائرے میں کسی ایک جگہ کوئی تو کمزور جوڑ ہوتا ہے - باہر آنے والے اسی دائرے سے باہر آتے ہیں۔ جو لوگ دائرہ نہیں توڑتے دائرہ ان کو توڑ دیتا ہے لیکن ایک بات پھر بھی طے ہے دائرہ کوئی بھی توڑ و دکھ تو ہوتا ہے۔ کبھی لوگوں کے لئے بنے دائرے توڑتے توڑتے اپنے اندر کوئی نیا دائرہ بن جاتا ہے۔ کبھی اپنے لئے کوئی دائرہ توڑتے کو اپنے اوپر کوئی نیا خول چڑھ جاتا ہے۔" تسکین شہادت کی انگلی پیالی کے کناروں پہ پھیرنے لگی۔

دروازے کی گھنٹی بجی - پاکیزہ دروازہ کھولنے باہر گئی۔ اس کے جاتے ہی تسکین نے چائے کی پیالی سنک میں الٹ دی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اک حسرت ہے انہیں منانے کی ہمیں

پر وہ اتنے اچھے کہ کبھی خفا نہیں ہوتے

"ہیلو۔۔۔اسلام علیکم "موبائل فون کان سے لگائے وہ ہولے ہولے کپکپارہی تھی۔کسی لڑکے کے گھر پہلی دفعہ فون کر رہی تھی۔ نجانے کون فون اٹھاتا اور اسے کیا کیا تاویلیں سنانی پڑتیں۔

"وعلیکم السلام "نسوانی آواز نے مصروف انداز میں جواب دیا۔

"میں پاکیزہ بات کر رہی ہوں - مجھے آفتاب سے بات کرنی ہے۔وہ دو تین دن سے سکول نہیں آرہا۔اس کا پتہ کرنا تھا۔"پاکیزہ نے کال کرنے کا رٹا ہوا سبب ایک سانس میں بتادیا لیکن دوسری طرف سے اسے کوئی جواب نہ ملا۔شاید انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ آفتاب کو دو تین آوازیں دے دی گئیں - وہ کھانستا ہوا فون کے پاس آیا۔

"ہیلو" آفتاب کی بھیگی سی آواز اسپیکر میں ابھری۔

"ہیلو میں پاکیزہ بات کر رہی ہوں۔تم سکول نہیں آرہے تھے سوچا پوچھ لوں۔'' وہ معافی مانگنا بھول گئی۔اس کے خیال میں کال کرنا ہی بہت بڑی بات تھی۔

"اب تو میں بالکل ٹھیک ہو گیا ہوں۔مجھے یقین نہیں آرہا تم نے واقعی مجھے فون کیا ہے۔تم کیسی ہو؟" آفتاب کی بھیگی آواز میں بشاشت جھلکنے لگی۔اس کے لئے پاکیزہ کا فون کرنا اتنا ہی اہمیت رکھتا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" پاکیزہ نے مروتا یک لفظی جواب دیا۔

"تم نے حمزہ سے نمبر لیا اس نے مجھے بتایا تھا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ تم کال کرو گی۔میرا دل خوش ہو گیا ہے۔کاش میں تمہیں بات کرتے ہوئے دیکھ سکتا۔تمہارے ایکسپریشنز نوٹ کر سکتا۔"" وہ چپک نے کی کوشش کرنے لگا۔پاکیزہ کو ڈر سا لگا کہ اگر اس کے گھر میں کسی نے اسے یہ سب بولتے سن لیا تو۔۔۔یہی سوچ کر اس نے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

"سکول آؤ گے تو بات ہو گی اللہ حافظ" آفتاب کے اللہ حافظ کہنے سے پہلے وہ فون رکھ چکی تھی۔وہ مزید اس لڑکے کو چپکنے کی اجازت انہیں دے سکتی تھی۔

یہ بھی اکیسویں صدی کا معجزہ ہی ہے کہ میڈیا کی یلغار نے چودہ سال کے بچوں کو لڑکا اور لڑکی میں فرق بتادیا ہے۔بچوں اور بچیوں کو لڑکا اور لڑکی بنادیا ہے۔آج کل کے ہر لڑکے کو لگتا ہے کہ آنچل میرے لئے لہرا رہا ہے، لڑکی مجھے دیکھ کر دوپٹہ ٹھیک کر رہی ہے، مجھ سے بات کرنے کے لئے آہستہ چل رہی ہے، مجھ سے بات کرنے میں دلچسپی ظاہر کرنے کے لئے مجھے مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی ہے۔لڑکیوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ہر سیٹی میرے لئے بج رہی ہے، گلی کے کونے میں لڑکوں کا جھمگٹا میری ایک جھلک دیکھنے کے لئے کھڑا ہے، صرف مجھے ہی یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھا جارہا ہے۔

دور کہیں بہت سی سیٹیاں ایک ساتھ بج رہی ہیں اور آواز قریب آتی جا رہی ہے۔۔ پتہ نہیں یہ آوازیں ہمیں سنائی کیوں نہیں دیتی!

☆☆☆☆☆☆☆☆

اس کے سبب ان سے بھی ملنا پڑا مجھے

وہ لوگ مجھ کو جن سے کوئی واسطہ نہ تھا

وہ سکول آیا تھا۔ مکمل ٹھیک نہیں تھا لیکن اس کا ایک ایک انداز بتا رہا تھا کہ وہ پاکیزہ کے لئے سکول آیا ہے۔ پاکیزہ کتراتی پھر رہی تھی ۔روزِ اول سے اس کی عادت رہی تھی کہ کلاس میں داخل ہو کر پاکیزہ کے بینچ کے پاس رکتا اور اسے سلام کرتا پھر آگے چلا جاتا۔ اس سلام کا جواب پاکیزہ نے کبھی نہیں دیا لیکن وہ برابر سلامتی پہنچاتا رہا۔

آفتاب نور خود کیا تھا۔۔ اپنے نام کی طرح روشن، چمکتا ہوا! سفید رنگت، حسین آنکھیں، لمبی بھنوئیں، کھڑی ناک، متناسب لب ،کوئی ایک چیز بھی اس کے نقش و نگار میں ایسی نہیں تھی جسے صفر اعشاریہ ایک فیصد بھی تبدیلی کی ضرورت ہو۔ ظاہری طور پہ وہ مکمل تھا۔ مکمل سے کہیں زیادہ سحر انگیز۔۔۔! قد کاٹھ ایسا نمایاں کہ اس کی سائے میں پناہ لینے کا دل کرتا۔ مضبوط ہاتھوں کی رگیں ابھری دکھائی دیتی اس طرح گردن پر بھی رگوں کا جال تنا ہوا نظر آتا۔ خاص طور پر جب وہ ہنستا تو یہ رگیں اور بھی نمایاں ہو جاتیں ایسے میں وہ عادتا اپنے ہاتھوں کی انگلیاں اپنے گالوں پر رکھ لیتا۔ یوں معلوم ہوتا کہ روئے ارض پہ اگر کوئی معصوم ہے تو بس یہی ہے۔

اس عام سے سکول میں وہ یونہی پڑھ رہا تھا ورنہ بہترین سے بہترین افورڈ کر سکتا تھا۔ مالی آسودگی نے اس کی شخصیت میں مقناطیسی ہیرے جڑ دیئے تھے۔ دیکھنے والے کہتے تھے کہ اس سکول میں رہنے کی وجہ پاکیزہ ہے۔

اسی کے متعلق سوچتی اور سر کو مسلسل جھٹکتی وہ سٹاف روم میں جا پہنچی۔ اس نے اپنی کلاس کے لئے رجسٹر لینا تھا۔

"بات سنو پاکیزہ۔" اسے بلانے والی میڈم نزہت تھی۔

"جی میم۔" ان کا شمار سکول کی ان استانیوں میں ہوتا جن سے وہ کتراتی پھرتی کیونکہ ان کو اپنے لب و لہجے پہ قابو نہ رہتا اور اکثر کوئی نہ کوئی متنازعہ بات ان کے نام سے گردش کر رہی ہوتی۔

"آؤ بیٹھو میرے پاس" انہوں نے اسے اشارہ کیا۔ وہ ناچار بیٹھ گئی۔

"آفتاب ہفتہ پہلے میرے پاس آیا تھا۔ جانتی ہو کیا کہہ رہا تھا؟" انہوں نے جانچتی نظروں سے اس لڑکی کا جائزہ لیا۔

"نہیں۔۔ کیوں؟ کیا ہوا؟" اس حوالے سے پاکیزہ کی کبھی کسی ٹیچر سے بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہچکچائی، بات اب کوٹھے پہ چڑھ رہی تھی۔

"وہ کہتا ہے میں جب بھی زندگی میں شادی کروں گا، پاکیزہ سے کروں گا۔ پھر پتہ ہے میں نے اسے آگے سے کیا کہا۔ میں نے کہا اگر پاکیزہ نہ مل سکی تو۔۔۔اس نے کہا اگر پاکیزہ نہ ملی تو میں پاکیزہ جیسی پہ اکتفا کرلوں گا۔ لیکن ہو بالکل ویسی ہی" وہ طنزیہ لہجے میں بتاتے ہوئے اس کے تاثرات ازبر کرنے لگی۔ ایک ثانیے کو پاکیزہ کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی پھر وہ خود کو سنبھال کر بولی۔

"میم بیوقوف سالڑکا ہے۔ اس کو بہت شوق ہو گا، اس عمر میں شادی کے بارے میں سوچنے کا۔ میرا ایسا کوئی پلان نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں میرے ایمز اور گولز ڈفرنٹ ہیں۔" قطعی انداز میں کہتے وہ نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی سٹاف روم سے رجسٹر لے کر باہر نکل آئی۔

جونہی یہ لڑکا دوستی کے دائرے میں بھی آتا محسوس ہوتا تھا کوئی نہ کوئی ایسا مسئلہ ضرور ہو جاتا کہ وہ اس کو repel کرنے پہ مجبور ہو جاتی ورنہ فطرتاً حساس سا عمر میں دو سال بڑا لڑکا اسے کم از کم ضرر رساں تو نہ لگا کرتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

کبھی جو درد کی آتش سلگانے مجھ کو لگتی تھی

وہ اپنے سانس کی مہکتی ہوائیں مجھ کو دیتا تھا

"دن پر لگا کر اڑ رہے تھے وہ ہفتم سے نہم میں آگئی تھی۔ کب اور کیسے اسے خود بھی پتہ نہیں چلا تھا۔ گلی محلے کے پرائیویٹ سکول کی اکھڑی دیواروں پہ بہت سے نام کندے ہوئے تھے۔ اس نے خود اپنی کلاس کے تقریباً ہر ڈیسک پہ A loves P لکھا دیکھا تھا، وہ اگنور کر رہی تھی، اسے یہی کرنا تھا۔ وہ گھر جا کر پھوپھو کو بتا تو دیتی لیکن ساتھ کیا سمجھاتی۔۔۔ انہیں تو اب اپنی سمجھ بھی نہیں آتی تھی۔ جو کچھ اسے زمانے سے مل رہا تھا وہ پی رہی تھی اور پیتے پیتے اس کے اندر کے ذائقے بھی بدل رہے تھے جس کا ادراک اسے بھی نہ ہو سکا۔

نہم کے بورڈ کے پیپرز کی تیاری زور و شور سے جاری تھی۔ سب ہی بچے اچھی سے اچھی جگہ ٹیوشن پڑھنے جا رہے تھے۔ وہ کسی بھی ٹیوشن کے بغیر بلا کی پر اعتماد تھی لیکن ٹیچرز کا بار بار کا ڈرانا اس کے لئے وبالِ جان بن گیا۔ آٹھویں میں بھی بورڈ کے پیپرز نہیں ہوئے تھے ورنہ وہ تسلی میں ہوتی اور ان کو ہوا نہ سمجھتی۔ اب ہوا سمجھ کر بوکھلائی بوکھلائی سی رہنے لگی۔

"پاکیزہ آپ کس کے پاس پڑھتی ہو؟" سر اسد نے اس سے کلاس میں پوچھا۔

"سر خود ہی پڑھ لیتی ہوں۔" اس نے آرام سے جواب دیا۔

"حیرت انگیز بات ہے۔ ادھر تو بچے اتنی مہنگی اکیڈمیز میں پڑھ کر بھی یاد کر کے نہیں آپاتے اور آپ کو تو ماشاءاللہ بہت اچھا یاد ہوتا ہے۔ کتنا وقت دیتی ہو پڑھائی کو؟" انہوں نے دلچسپی ظاہر کی۔

پاکیزہ کو ہنسی آگئی۔ اسے کبھی پڑھائی کو وقت دینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ وہ صرف ذہین نہیں تھی بلکہ غیر معمولی طور پر ذہین تھی۔ سکول میں تفریح کے دوران ہی وہ اپنا سبق یاد کر لیا کرتی۔ اپنی ہوم ورک والی کاپیاں کھول کر بینچ کے اندر رکھا کرتی، جو نہی وقت ملتا اپنا لکھنے والا کام سکول میں ہی مکمل کر لیتی۔ ایسا بہت ہی کام ہوتا کہ وہ سکول سے گھر جا کر بیگ کھولے۔ جس وقت اگلے دن بچے سکول میں سبق کی دہرائی کر رہے ہوتے وہ ٹیچر کے پاس کھڑی ہو کر انہیں سنا رہی ہوتی کیونکہ اسے تو اسی وقت یاد ہو جایا کرتا جب اساتذہ کلاس میں پڑھایا کرتے۔

وہ پینٹنگ کیلئے تیار خالی صفحے کے جیسی تھی اس پہ جو رنگ بکھیرا جاتا، وہ اسی کو منعکس کر دیتی۔ اگلے دن پھر دھلا دھلایا صفحہ لے کر اور رنگ جذب کرنے آجاتی۔ پرانے رنگ نظر تو نہ آتے لیکن وہ معدوم بھی نہ ہوتے۔ اس پہ رنگ یونہی رہ جاتے رویوں کے رنگ، لفظوں کے رنگ اور لوگوں کے رنگ!

"سر ایک گھنٹہ" مروتاً کوئی جواب تو دینا تھا اس نے ذرا سوچ کر یہی جواب دیا۔

"ایک ہم ہیں دو گھنٹے اکیڈمی میں دیتے ہیں، تین گھنٹے گھر میں لگاتے ہیں پھر بھی دو صفحے یاد نہیں ہوتے۔ ایک یہ ہیں۔ اللہ اس کا ذہن تھوڑا سا ہمیں بھی دے دیتا۔" اس کی تعریف کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دینے والا آفتاب ہی ہو سکتا تھا۔

سر ذرا سا مسکرائے پھر پاکیزہ کے قریب آ کر بولے "بیٹا خود پڑھنا اچھی بات ہے لیکن نہم کے امتحانات کوئی مذاق نہیں ہیں۔ آپ ٹیوشن پڑھنے مت جاؤ۔ کسی سے صرف رہنمائی ہی لے لو۔ سب مضامین کے اہم سوالات ہی پوچھ لو۔ اپنی کلاس کے کسی بچے سے کسی اکیڈمی کے نوٹس پکڑ لو تا کہ آپ کو اندازہ ہو جائے۔ ضروری نہیں کہ ہر پر اعتماد بچہ نمبر بھی اچھے لے۔ میں نے اعتماد کی سیڑھی پہ چڑھے اکثر بچوں کو منہ کے بل گرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

پاکیزہ کا سانولا رنگ ایک لمحے کے لئے تاریک ہوا۔ وہ اپنے بالوں کی لٹ کو کان کے پیچھے کرنا بھی بھول گئی۔ سر کے علاوہ ساری کلاس جانتی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے وہ کسی سے نوٹس نہیں مانگے گی۔ مانگنا ہی تو نہیں آتا تھا۔ ایک شرمندگی تھی جس کا سامنا وہ کبھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک ہار تھی جس کی شکل وہ کبھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک مقدر تھا جس سے وہ آخری وقت تک لڑنا چاہتی تھی۔ اسی مقدر نے اس کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ جب اس نے گھر جا کر اپنا بیگ کھولا تو اس میں سب سے اوپر hawks اکیڈمی کے نوٹس پڑے ہوئے ملے۔ اسے مانگنا نہیں پڑا تھا، وہ شرمندہ نہیں ہوئی تھی۔ اس نے فقط اسکاچ ٹیپ لگا کر اور اتار کر نوٹس کے پہلے صفحے پہ لگی مہر کو مٹایا۔ وہی مہر جو کلاس کے ہر بینچ پہ کندہ تھی۔ میٹھی سی ہنسی اس کے پنکھڑی سے لبوں سے پھسل کر آنکھوں میں آن بسی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

میرے دل کے دروازے پہ دستک دیتا ہے وہ
اور دروازہ کھل جانے کا انتظار بھی نہیں کرتا

"اور کچھ نہیں تو مجھ سے صرف دوستی ہی کرلو" وہ ایک دفعہ پھر اس کے سر ہوا۔

''میں نہیں کر سکتی۔ اصل میں میں کرنا ہی نہیں چاہتی'' پاکیزہ نے صاف جواب دیا۔

"کوئی وجہ بھی تو ہو انکار کی؟" آفتاب نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں یہی سوال میرا ابھی ہے کہ کوئی وجہ بھی تو ہو کہ میں تم سے دوستی کروں۔ تم بتاؤ کیا ہے وجہ؟" پاکیزہ نے اس سے زیادہ بیباکی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"وجہ تو ہے کہ تم تنہا ہو، تمہیں دوست کی ضرورت ہے" وہ اچانک دھیمے سے لہجے میں بولا۔

"بیباک نظریں گھبرا گئیں َوہ اپنے راز کے آشکار ہو جانے پہ شرمندہ ہوئی۔ شرمندگی میں ہی اسے غصہ آگیا-"میں دنیا میں کسی سے بھی دوستی کرلوں گی لیکن آفتاب تم سے نہیں، ہر رشتہ ضد سے نہیں جیتا جا سکتا۔

"میں ضد نہیں کر رہا، میں درخواست کر رہا ہوں۔" آفتاب کا لہجہ بھیگنے لگا

"مجھے منمناتے ہوئے لڑکے ذرا اچھے نہیں لگتے۔" پاکیزہ نے نخوت سے اپنی ناک چڑائی جس کی چمک سے آفتاب کی آنکھیں بار بار پھسل رہی تھی۔

"وہ اس کے پاس خاموش کھڑا تھا۔ "جاؤ اب یہاں سے میرے سر پہ کیوں کھڑے ہو گئے ہو؟" اسے کہہ کر وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھی۔

"ٹپ" پاکیزہ کی آنکھ میں پانی کا قطرہ پڑا۔ وہ کمرے کی جگہ سکول کے گراؤنڈ میں ہوتی تو کہیں سے بھی اس قطرے کی امید کر سکتی تھی۔ حیرت انگیز تاثرات لئے نظریں اٹھائیں تو معلوم ہوا وہ پانی کا قطرہ نہیں آنسو تھا جو آفتاب کی آنکھ سے نکل کر پاکیزہ کی پلکوں میں اٹک گیا۔

ہر شے کا ساکت ہو جانا کسے کہتے ہیں۔۔ پاکیزہ کو اسی لمحے سمجھ آیا۔

اپنی دونوں مٹھیاں سختی سے بھینچے، آستینوں کو موڑے ہوئے وہ یونانی حسن کا مجسمہ اس کے سر پر کھڑا اس کے لئے اس جیسی عام سی سانولی سی لڑکی کے لئے آنسو بہا رہا تھا- یہ ایسا ناقابلِ یقین منظر تھا کہ کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بھی وہ اس پہ یقین نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ جس کے مطابق وہ خود کچھ بھی نہیں تھی، جسے تب تک کوئی نہیں دیکھتا تھا جب تک وہ بولتی نہیں تھی۔ اس پہ وہ لڑکا فدا ہو گیا تھا جو حسین تھا صرف حسین تھا۔ وہ سوچتی تھی بھلا سانولے رنگ پہ بھی کسی کی نظر جاتی ہے؟ اس سانولے رنگ کی دھان پان سی لڑکی کے لئے اپنی جسامت اور صحت سے دو سال بڑا دکھائی دیتا لڑکا اپنا ضبط کھو بیٹھا تھا۔ پاکیزہ چاہتی تھی کہ کوئی آکر اسے یقین دلائے کہ یہ سچ ہے۔ اس کے لئے بھی کوئی رو سکتا ہے۔ رونے والا بھی کوئی تو نہیں تھا۔۔۔ وہ وہ تھا جس کی تعریف اساتذہ ہر وقت کرتے۔ جس کی گہری بڑی آنکھوں سے لے کر اس کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز کو بھی سٹاف روم میں ڈسکس کیا جاتا۔

وہی پیکرِ حُسن اپنا ایک آنسو اپنے گال پہ سجائے اور دوسرا پاکیزہ کی آنکھ میں ٹپکائے نمک کو گھلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پاکیزہ نے لب حیرت سے واکیئے رکھے، اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی۔ وہ مٹھیاں بھینچے بھینچے ہی مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

نہم کلاس میں وہ اکیلی بیٹھی رہ گئی۔ کلاس کے سب سٹوڈنٹ کمپیوٹر لیب میں تھے۔ اس کا رجسٹر کلاس میں تھا جس کو وہ لینے آئی تھی۔ اس کے پیچھے ہمیشہ کی طرح آفتاب نور بھی آیا تھا۔ اسکے جانے کے بعد پاکیزہ کو لگ رہا تھا آج اس نے آفتاب کو پہلی بار دیکھا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

سلگ رہا ہوں دھیرے دھیرے مگر کسی پہ عیاں نہیں
وہ آگ دل میں لگی ہے جس میں تپش ہے لیکن دھواں نہیں

پھر یوں ہوا کہ موسم کے بدلنے پہ اعتبار آ گیا۔ آفتاب کی آنکھوں میں پاکیزہ کے لئے شناسائی نے جھانکنا بند کر دیا۔ وہ پہلے کی طرح بات کرنے کے بہانے نہ ڈھونڈتا۔ البتہ سلام کرنے کا معمول نہ بدلا۔ اگر کچھ بدلا تھا تو آفتاب کا جھکاؤ، اب وہ ہر چھوٹی بڑی بات کے لئے انمول کے پاس کھڑا نظر آتا۔ انمول کے چہرے پہ آفتاب کو دیکھتے ہی ہنسی آجاتی۔ پاکیزہ نے اوپر اوپر سے اس سارے منظر کو سرسری لیا لیکن اندر ہی اندر اس کے دل میں بھی اس بے توجہی نے اثر ڈالا تھا۔ وہ خاموشی سے بہتے تیل کی دھار دیکھنے لگی۔

کچھ دن مزید گزرے وہ رنگ جو آفتاب کے چہرے پہ آکر ٹھہرے تھے اب انمول کے چہرے پہ نقش ہو گئے تھے۔ وہ اسی طرح مرجھائی تھی جیسے اس دن آنکھوں میں آنسو لئے آفتاب کی چمک ماند پڑی تھی۔ انمول کو کشش کا محور بنا کر بری طرح نظر انداز کیا گیا تھا۔ اس کے رجسٹر کے آخری صفحات پہ اداس شاعری میں اضافہ ہونے لگا کہ آفتاب تو اب اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ دو ہفتے بعد کی بات ہے کہ آفتاب کومل کے ساتھ تفریح کے دوران بیڈمنٹن کھیلنے لگا۔ وہ دونوں ہنستے ہوئے گراؤنڈ کی طرف جاتے۔ یوں لگتا برسوں پرانی دوستی ہے۔ کلاس کی بہت عام سی لڑکی آفتاب نور کے ساتھ گراؤنڈ میں بیڈمنٹن کھیلتے پورے سکول کی توجہ کا منظر بن گئی۔

کوئی اور کچھ سمجھ رہا تھا یا نہیں سمجھ رہا تھا لیکن پاکیزہ کو سب سمجھ میں آرہا تھا۔ آفتاب واقعی وقت گزار رہا تھا۔ پاکیزہ کے خیال پہ تصدیق کی مہر تب لگی جب مزید تین ہفتوں بعد بسمہ آفتاب کے ساتھ ہر جگہ نظر آنے لگی اور کومل بھی انمول کی صف میں شامل ہو گئی۔

آفتاب پاکیزہ کی طرف دیکھتا تو نہیں تھا لیکن اس کا ایک ایک انداز کچھ جتاتا ہوا محسوس ہوتا۔ کوئی ایسا رویہ اس کے اٹھنے بیٹھنے سے جھانکتا کہ پاکیزہ اس کو دیکھ بھی نہ پاتی اور نظر انداز بھی نہ کر سکتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

میں نے جب بھی اپنا بنانا چاہا اس کو

باتوں باتوں میں بات ٹال دی اس نے

صبح سویرے وہ اس کے پاس جا کر کھڑی ہوئی۔ اسے یقین تھا وہ نوٹس لے گا لیکن اس نے نوٹس نہیں لیا۔

کیا چاہتے ہو؟ پاکیزہ نے دوٹوک لہجے میں اس گھنے بالوں سے نظریں چراتے ہوئے پوچھا۔

"بتایا تو تھا کہ کیا چاہتا ہوں لیکن شاید کسی نے سنا نہیں۔" وہ اپنی سائیکل کو لاک لگا رہا تھا۔

"تم ایسے نہ کرو۔" پاکیزہ اس سے درخواست کرنے لگی۔

"کیسے نہ کروں؟" اس کے انداز سے ڈرامائی حیرت نے جھانکا۔

"کلاس کی لڑکیوں کے ساتھ ٹائم پاس کرنا چھوڑ دو۔" پاکیزہ نے دل کڑا کر کے صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

"تم میرے ساتھ دوستی کر لو۔ باقی سب کو چھوڑ دوں گا۔" آفتاب مکمل طور پہ اس نمکین لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔

اس کے تو گویا کسی نے ناک کے بال ہی کھینچ لئے تھے۔ پاگل ہو تم؟ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟ کیا ملے گا تمہیں یہ سب کر کے؟ وہ چلائی۔

"مجھے کچھ نہیں ملے گا تو تمہارا بھی تو کچھ نہیں جا رہا۔ تمہیں کیا مسئلہ ہے؟" وہ سینے پہ ہاتھ باندھے پوچھنے لگا۔

"وہ لڑکیاں دکھی ہو رہی ہیں۔" چڑیا سی لڑکی کا دل بھی چڑیا سا نکلا۔

"تم مدر ٹریسا ہو؟" اس نے بڑے آرام سے پوچھا۔

وہ تپ ہی تو گئی۔ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری رشتہ داریں۔ انہیں احساس نہیں ہو تا کہ تم ان کے ساتھ کیا کھیل کھیل رہے ہو۔ میں فضول میں ٹینشن لے رہی ہوں۔

"اچھا۔" وہ پر سکون تھا۔ وہ جانتا تھا وہ نہ بھی کہیں تب بھی فکر تو کرتی رہے گی۔

"میں تم سے دوستی نہیں کروں گی۔ آج میرے پیچھے باقیوں سے دوستی کر کے انہیں چھوڑ رہے ہو۔ کل کسی اور کے پیچھے مجھے چھوڑ دو گے۔ میں کیوں دوسروں کی آگ بجھانے کے لئے خود کو آگ میں جھونکو۔ میں آفتاب تم سے دوستی نہیں کروں گی۔" اس نے اپنی کہی اور پھر وہاں نہیں رکی۔

وہ خاموش کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اسے پتہ تھا آج یا کل یہ لڑکی واپس لوٹ کر آئے گی۔ اتنا ضرور تھا کہ اس کام میں کئی سال لگ سکتے ہیں لیکن آتش سے چیزیں جل ہی جایا کرتی ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اک اجنبی ہے مگر روح شناس لگتا ہے

میری طرح وہ بھی مجھے اداس لگتا ہے

اب آفتاب واپس پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ کلاس میں سب کے ساتھ ہنسی مذاق کرنا، بولنا، کھیلنا، کودنا، جھکنا، شرارتیں کرنا۔۔۔ وہ جو ایک الگ ساجھکاؤ اس کے اندر آتا جارہا تھا وہ خود ہی ختم ہو گیا۔ پاکیزہ کو لگا کہ یہ لڑکا بغیر جتائے باتیں مان کر ایک نہ ایک دن دل میں تھوڑی بہت جگہ بنا ہی لے گا۔ وہ اپنی روش پہ قائم تھی۔ زیادہ تر نظر انداز ہی کرتی رہتی۔ وہ خود اس کے پاس آنے کے بہانے ڈھونڈتا۔

کلاس میں سب سے پہلے آجاتا۔ پاکیزہ کے ساتھ کلاس کی نشستیں درست کروا دیتا۔ کسی کام سے ٹیچر ز پاکیزہ کو بھیجتے، دوڑا دوڑا ساتھ جاتا۔ اپنی ہر ممکن مدد پیش کرتا۔ کسی بات میں جانبداری کا مظاہرہ کرنا ہوتا تو اس کا پلڑا پاکیزہ کی طرف اپنے آپ جھک جاتا۔ وہ سائے کی طرح پاکیزہ کے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کرتا۔ وہ اتنا مہربان تھا پاکیزہ پہ کہ اس کو اس کی مہربانی پہ ہی شک ہونے لگتا۔ اس شک میں اسے وہ ایک آنسو یاد آجاتا۔ یہ سچ تھا کہ وہ یقین نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی اسے یقین کرنا تھا لیکن اس ایک آنسو کے بعد شک کرنے کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی۔ دماغ گنجائش نکال بھی لیتا لیکن دل کسی گنجائش کو کہاں جگہ دیتا۔

کوئی اور رشتہ جوڑنے کی عمر تو نہیں تھی لیکن دوستی۔۔۔ اس میں کیا مضائقہ تھا کم از کم وہ تو کی جا سکتی تھی۔ سلام دعا تو اچھے سے رکھے جا سکتی تھی۔ وہ خود سے لڑنے لگ گئی۔ اس کے اندر بیٹھا تنہائی کا دیو زندگی کی ساری رعنائیاں دبوچ لینے کے درپے تھا۔ پھر کیا برا تھا کہ وہ زندگی سے چند لمحے خوشی کے چرا لیتی۔ کون سا وہ اس کے ساتھ تعلق واسطہ رکھتے ہی باؤلی ہونے والی تھی۔ اسے اچھے برے کی تمیز تو رہنی تھی۔ وہ صرف اچھا وقت تو گزار ہی سکتی تھی۔

راستے میں گزرتے ہوئے کسی دکان والے سے بھی ضرورت کے وقت بات کرنی پڑ جاتی تھی، سکول کے باہر کھڑے بھانت بھانت کے ریڑھی والوں کے منہ لگنا پڑتا تھا، وہ بھی تو جاننے والے نہیں تھے، اجنبی تھے۔ ان کے منہ لگا جا سکتا ہے تو آفتاب سے بات کیوں نہیں کی جا سکتی۔ وہ اکیلا نا محرم تو نہیں ہے۔ دل عجیب عجیب تاویلیں ڈھونڈ کر لانے لگا۔

سکول ختم ہونے میں صرف ایک آدھ سال رہتا تھا۔ پھر آفتاب نے کہاں ملنا تھا، اس سے بھلا کیسے رابطہ ہونا تھا۔ سب کچھ خود بخود ختم ہونے والا تھا تو اس کے ختم ہونے سے پہلے اگر کچھ حسین رنگ اپنی ہتھیلی میں چھپا لئے جائیں تو کیا برائی ہے؟ مجھے بھی وہ ایک اچھی یاد کی طرح یاد رہ جائے گا اور میں بھی اس کے ذہن میں ایک اچھے خیال کی طرح محفوظ ہو جاؤں گی۔

ایک وہی تو ہے جس نے مجھے جان لیا ہے۔ میں سب کے سامنے کتنی نارمل رہتی ہوں، سب مجھے کتنا ہنس مکھ اور خوش اخلاق سمجھتے ہیں اور اس نے کتنے آرام سے کہا ہے کہ تم تنہا ہو، تمہیں دوست کی ضرورت ہے۔ میرے بکھری ہوئی ذات کے پندار کے اندر بھلا اس کے سوا کون جھانک سکا ہے۔ میں اسے آئینہ بنا کر کچھ روز سنور سکتی ہوں تو اس میں کیا برا ہے۔ آخر میں تو سب ختم ہی ہو جانا ہے۔ میں خود ہی سب ختم کر لوں گی۔ میں کون سی کوئی بے وقوف سی لڑکی ہوں۔ اچھی بھلی سمجھ ہے کسی انسان کے لئے اپنی زندگی تو تباہ نہیں کروں گی۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔۔۔۔ میں سب کچھ خود ختم کر دوں گی!

وہ فیصلہ کر رہی تھی یا فیصلہ اس کے ہاتھ سے خود ہو رہا تھا۔ اسے خود نہیں پتہ تھا۔ لیکن کچھ تبدیلیاں اس کے اندر سے ہو کر اس کے باہر تک کا سفر کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اتنا سب سوچنے کے بعد اس نے آخر میں دل کو پھر ڈپٹا۔

اسے کسی کے لئے خود کو نہیں بدلنا تھا۔ اپنے دائرے تبدیل نہیں کرنے تھے۔ عارضی سکون کے لئے ازل سے زمین زادوں کے نصیب میں لکھا سنجوگ اپنے مقدر میں نہیں لکھوانا تھا۔ اس نے بہت اوپر جانا تھا، بہت اوپر!!

☆☆☆☆☆☆☆☆

ٹوٹی ہے میری نیند، تم کو اس سے کیا

بجتے رہیں ہواؤں سے در، تم کو اس سے کیا

اس نے گہرے نیلے رنگ کے فراک کو پہن کر ایک دفعہ خود کو آئینے میں دیکھا۔ سانولے رنگ کی وجہ سے رنگوں کے انتخاب میں یہ لڑکی ہمیشہ پریشان ہو جایا کرتی۔ اگر کوئی ایسا رنگ پہن لیتی کہ جس میں رنگت مزید دب جاتی تو لوگوں کی مضحکہ خیز نظریں اسے اپنے اندر خنجر کی طرح اترتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اس لئے ایک اس معاملے میں احتیاط لازم تھا۔ گہرے نیلے رنگ میں وہ کوئی اپسرا نہیں لگ رہی تھی لیکن کم از کم اس کی رنگت وہی تھی جو قدرتی طور پہ تھی۔ کپڑوں کے رنگ نے اس کی رنگت کو گہن نہیں لگایا تھا۔

اپنے بالوں کو ہاتھ میں لے کر پونی بنانے کی کوشش کی لیکن وہ بچ نہیں رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ خود سے روٹھ جانے کے تاثرات آگئے۔ صاف رنگ کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ گورے چٹے لوگوں کو کیا پتہ۔۔۔ جو دل کرتا ہے پہن لیتے ہیں۔ روتے ہیں تو سرخ ہوتی ناک سے اپنی طرف توجہ مبذول کروا لیتے ہیں۔ سانولے رنگ والے بھاگتی دوڑتی چمکتی زندگی میں دنیا کی چکاچوند کو دیکھتے ہیں اور بس افسوس کرتے رہ جاتے ہیں۔ انہیں دنیا سے کچھ ملتا ہے تو کج ادائی، ستم ظریفی اور بے توجہی!

بے توجہی اور ستم ظریفی تو سمجھ میں آجاتی ہے بندہ اس کو سہنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بے توجہی۔۔۔ وہ تو اتنی کڑوی دوا ہے کہ حلق سے نیچے ہی نہیں اترتی۔ اگر اتر جائے تو ساری دنیا دل سے اتر جاتی ہے۔

آئینے کے سامنے یوں ساکن کھڑا دیکھ کر تسکین کمرے میں آئی۔ رنگت کا دکھ پاکیزہ کے اندر اتنا شور مچایا کرتا کہ تسکین اس کے جھگڑا اپنے اندر چلتے ہوئے بھی محسوس کر لیتی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" انہوں نے پاکیزہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ کندھے پر رکھے ہاتھ کی پرواہ کئے بغیر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ہاتھ نیچے کو لڑھک گیا۔

"ظاہری رنگت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ رنگ تو کچے رنگ ہیں۔ رنگ چڑھانا ہے تو کردار کا چڑھاؤ، کبھی نہیں اترے گا۔ جتنا چوکھا کردار کا رنگ ہو گا اتنا طلسم تمہاری ذات میں ہو گا۔ یہ جو دکھ جاگتا ہے تمہارے اندر بار بار کہ لوگ مجھے نہیں دیکھتے۔ یہ سب شہد کی مکھیاں بن جائیں گے اور تم ان کے لئے میٹھا۔ سارے دکھ ختم ہو جائیں گے اور وہ بھی ایسے کہ جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔" تسکین بستر

پہ بیٹھی آئینے کی طرف پشت کئے پاکیزہ کے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتے بولی۔ آج خلافِ معمول ان کا مزاج بہت اچھا تھا۔ پرانی دوست کے ساتھ پی گئی گرم چائے نے دل کا موسم ٹھنڈا کر دیا تھا۔

"کتابی باتیں ہیں یہ۔ یہ میری زندگی ہے۔ کوئی مووی نہیں چل رہی جس میں بس تین گھنٹے بندہ رو پیٹ کر گزار لے۔ یہ میری زندگی ہے مجھے روز لوگوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ ان کی سوالیہ نظروں کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ جس دن نئے بندے سے سامنا ہو ایک دفعہ پھر سے ہزاروں دفعہ کی اپنائی گئی مسکینیت کا لبادہ مجھ سے آلپٹتا ہے۔ میں تو تھک جاتی ہوں۔ اوپر سے سب کو اپنا آپ مضبوط دکھادکھا کر اندر سے ٹوٹ ٹوٹ کر تھک جاتی ہوں۔ جب میں اعتماد سے بولتی ہوں تو سب کو میری آواز سنائی دیتی ہے جس میں کوئی کپکپاہٹ نہیں ہوتی لیکن کسی کو اس میں گزری رات بہائے گئے آنسوؤں کی حدت نہیں محسوس ہوتی۔" وہ بولتے بولتے تھک گئی۔ آنسو اس کے گالوں سے پھسل کر گردن میں جذب ہونے لگے۔

تسکین نے اسے ایک کندھے سے تھام کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ اٹھو، ہاتھ منہ دھو کر آؤ۔" اسے زبردستی واش روم میں بھیجا۔

واپس آئی تو چہرے کی تازگی بحال ملی۔ کچی عمر کے سچے آنسو سارے بہہ جاتے ہیں، اندر نہیں رہتے۔ من پنکھ سا ہلکا ہو جاتا ہے۔

تسکین نے پاکیزہ کے سامنے کے بالوں کو بل دے کر دونوں کانوں کے پیچھے پن سے ٹھہرایا۔ پشت پہ بال کھلے چھوڑ دیئے۔ پاکیزہ کو جب آئینے کے سامنے لے گئی تو اس کے چہرے پہ بھی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔ پاکیزہ نے خود ہی آئی لائنر اور لپ گلوز لگایا اور پھر تسکین پھوپھو سے یہ نصیحت لے کر نکل آئی کہ وقت پہ گھر آجانا۔

میم نگین کی منگنی تھی۔ وہ نہم کلاس کی انچارج ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کی بہت اچھی دوست بھی تھیں۔ اپنے اکادکا شاگردوں کو بھی اپنی خوشی میں شامل کرنے کے لئے دعوت نامے دیئے۔ پاکیزہ جیسی سلجھی ہوئی اور فرمانبردار بچی کو بلائے بغیر تو دعوت ناموں کا مقصد ہی پورا نہ ہوتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

میں ایک مائع ہوں تخلیق کے مراحل میں
نجانے کون سے سانچے میں ڈھل رہا ہوں میں

ہال میں بہت زیادہ لوگ نہیں تھے لیکن بہت کم بھی نہیں تھے۔ پاکیزہ نے آگے پیچھے نظر دوڑائی لیکن کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آیا۔ اتنے میں میم نگین ہال میں داخل ہوئی۔ سہیلیوں کے جھگھٹے میں آتے ہوئے ان کے چہرے پہ بہت الگ سی مسکراہٹ کھیلتی نظر آئی۔ کسی کا ہو جانے کا احساس انسان کو ہواؤں سے ہلکا کر دیتا ہے، یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ کوئی سنبھالنے والا، تھامنے والا، ناز نخرے اٹھانے والا زندگی میں آگیا ہے۔ بہت سی تلخ حقیقتوں سے دل کرتا ہے کہ نظر چرا لی جائے۔ ایسے میں جب آنکھیں اپنی مرضی کے منظر دیکھتی ہیں تو انہیں آپ ہی آپ مسکرانا آجاتا ہے۔

"پاکیزہ نے آگے بڑھ کر میم نگین سے سلام کیا اور پھر ان کے لئے لایا ہوا ایک خوبصورت چوڑیوں کا سیٹ انہیں دیا۔ میم نگین کے فیروزی کپڑوں سے نگ لگی چوڑیاں بہت مل رہی تھیں۔ انہوں نے پاکیزہ کی خوشی کے لئے اپنی بائیں سونی کلائی میں چوڑیاں سجا لی۔ پاکیزہ اپنی خوشی سنبھالتے ہوئے واپس نشستوں کی طرف پلٹی۔ کوئی بھی کرسی خالی نہیں تھی۔ وہ ایک طرف کو ہو کر کھڑی ہو گئی۔

میم نگین کی امی سب سے مل رہی تھی۔ پاکیزہ نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا۔ ان کے گلے لگے ہوئے اس نے ہال میں آفتاب نور اور واحد شیخ کو داخل ہوتے دیکھا۔ لڑکوں میں سب سے پڑھا کو لڑکا واحد ہی تھا۔ اپنے نام کی وجہ سے اکثر مذاق کا نشانہ بنتا۔ لڑکے تو اسے پپو بھی کہہ کر چھیڑنے کی کوشش کرتے لیکن اپنی نیک خصلت کے سبب وہ اپنے اساتذہ کا پسندیدہ شاگرد تھا۔ اس تقریب میں اس کا آنا بھی اتنا ہی ضروری تھا جتنا پاکیزہ کا آنا۔ آفتاب کے پاس ان دونوں جیسی کوئی خصوصیت نہ تھی لیکن اس کو نہ بلایا جاتا یہ بھی ممکن کہاں تھا۔ اسے دوسروں کی مدد کرنے کی عادت تھی۔ شکل کے ساتھ یہ اضافی خوبی سونے پہ سہاگے کی مانند اسے توجہ کا مرکز بنائے رکھتی۔ ان دونوں کو دیکھتے وہ واپس اپنی جگہ پہ جا کر کھڑی ہو گئی۔

آفتاب اور احد نے میم نگین سے سٹیج پہ جا کر ملاقات کی۔ انہیں پھولوں کا بوکے دیا۔ نیچے اتر کر ہال کا جائزہ لیا اور ایک میز پہ جس کے گرد پڑی کرسیوں پہ صرف لڑکے بیٹھے تھے کے قریب کھڑا ہو گئے۔ وہیں کھڑے کھڑے آفتاب کی نظر پاکیزہ پہ پڑی۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ اتنی ضروری بندی کو اس سارے منظر نامے میں کیسے نظر انداز کر بیٹھا۔ وہ فوراً اس کے پاس جا پہنچا۔ احد اسی میز پہ کھڑا رہا۔

"تم بیٹھی نہیں ہو؟" اسے کھڑا دیکھ کر بھی وہ یہ بے وقوفوں والا سوال پوچھ بیٹھا۔

"ڈانس کرنے لگی ہوں۔ تم نے کرنا ہے؟" وہ اس بے وقوف کو یہی جواب دے سکتی تھی۔

وہ ہنسا۔ "کھڑی کیوں ہو؟" نا سمجھی میں ہی سہی لیکن اس نے اپنا سوال دہرا دیا تھا۔

"شوق ہے کھڑا ہونے کا۔" پاکیزہ کی نظر اس سے بھٹک کر آگے پیچھے گھومنے لگی۔

آفتاب نے اب ذرا غور سے دوبارہ ہال کا جائزہ لیا۔ ہال میں کوئی خالی کرسی نہیں تھی۔

پاکیزہ اور آفتاب میں یہی فرق تھا کہ بہت تیز روشنی سے پاکیزہ کی آنکھیں چندھیا نہیں جاتی تھیں لیکن آفتاب تیز روشنی سے جونہی کمرے میں آتا تھا کچھ دیکھ نہ پاتا۔ جتنی پراعتماد پاکیزہ تھی اتنا ہی دبو قسم کا آفتاب تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایک چھوٹا سا کنکر اسے سر پہ پڑے گا اور وہ پانے سارے وجود کے ساتھ کچلا جائے گا۔ مکمل نظر آنے والے اس لڑکے میں چھوٹی چھوٹی نا محسوس ہونے والی بہت سی دراڑیں تھیں۔

"ویٹر سے کہو اضافی کرسی لا دے۔" یہ مشورہ بھی پاکیزہ نے دیا۔

آفتاب اس کے مشورے پہ آنکھوں میں ستائش لئے ویٹر کی طرف لپکا۔

"کس لئے چاہیئے؟" کھڑوس ویٹر کی آواز پاکیزہ کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ان کے لئے۔" آفتاب نے انگلی سے پاکیزہ کی طرف اشارہ کیا۔

عزت شاید دستیاب چیزوں میں سب سے مہنگی شے ہے، جوں ہی نظر آتی ہے انسان بچہ بن کر اس کی طرف لپکنے اور ہمکنے لگ جاتا ہے۔ پاکیزہ کو اس اور ان کے اثر کے فرق کا احساس شدت سے ہوا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی باقی سارے فنکشن میں آفتاب کو پاکیزہ اپنے پاس سے ہٹا نہ سکی۔ وہ اس کی بے وقوفوں والی باتیں سنتی رہی جن میں سے آدھی باتوں کا اختتام اس پہ ہوتا رہا کہ تم بہت اچھی ہو۔ وہ اس میٹھے لمس کو پیتی رہی، جتنے آنسو بہا کر آئی تھی ان کا ازالہ ہو رہا تھا۔ ان دونوں نے کھانا بھی ساتھ کھایا تھا۔ شاید دوستی کے راستے پہ وہ پہلا قدم رکھ چکی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن

لوگ کردار نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

آج سکول میں مینڈک کی ڈائی سیکشن ہونا تھی۔ بچوں اور بچیوں کے تجسس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ سر اسد مینڈک کو بے ہوش کر کے جار میں ڈال کر نہم جماعت میں ہی رکھ گئے۔ کلاس کی نسبتاً نڈر لڑکی صائمہ نے سارے دن میں تقریباً ہر کلاس میں اس جار کو لے جا کر دکھایا۔ چھوٹے کلاسز کے اکثر بچے تو جار کی شکل دیکھ کر ہی ٹسوے بہانے لگے۔ سب ہی سرگرم نظر آئے۔

دن ڈوبتے ابھرتے محسوس ہوئے۔۔۔ یہ دن دوبارہ کب ہاتھ آئیں گے؟ کبھی بھی نہیں، یہ سنہری یادیں دماغ کے منظر نامے پہ انمٹ نقوش چھوڑ دیں گی۔ ہم خود بڑے ہو جائیں گے اور اسی سکول میں اسی جگہ بینچ پہ نجانے کتنی مزید نسلیں پڑھ رہی ہونگی۔ کیا ان کو احساس ہوگا کہ اس چار دیواری میں ہماری کیسی کیسی شرارتیں اور عمر کے کیسے سنہرے پل قید ہیں۔ کبھی جو ہم خود پلٹ کر ان راہوں پر آئیں گے تو بیتے لمحوں کی خوشبو تو مل ہی جائے گی لیکن چننے کو کوئی پھول نہ ہوگا۔

یہ وقت بھی کیسی ظالم شے ہے، انسان سے بچہ بننے کا حق لے جاتا ہے، بچپن لے جاتا ہے اور فکریں چھوڑ جاتا ہے۔ انسان کو سچ میں انسان بنا دیتا ہے!

ایسی ہی باتیں وہ سب سوچتے اور اساتذہ بھی ان کے سامنے یہی فلسفہ دہراتے۔ اپنی یادیں بانٹتے۔

پتہ نہیں کیوں سکول کی زندگی کے آخری دو سال بہت جذباتی ہو جاتے ہیں۔ پاکیزہ نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر سوچا۔

ٹھک ٹھک'' کچھ اچھلنے کی آواز آئی۔ پاکیزہ نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا، پھر چیخ مار کر اپنی نشست پر کھڑی ہو گئی۔ وہ بے ہوش مینڈک جس کو سارا دن اچھالا جاتا رہا تھا، اب ہوش میں آ چکا تھا۔ اور اس کا سر مسلسل اچھلنے سے جار کے کارک کے ساتھ لگ رہا تھا جس سے ٹھک ٹھک کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ساری لڑکیاں ہی پاکیزہ کی چیخ کی وجہ سے متوجہ ہوئیں اور مزید چیخیں مار کر اس ہنگامے میں اپنا حصہ ڈالنے لگیں۔ نڈر سی صائمہ کی ساری بہادری ناک کے راستے نکل آئی۔ وہ چیخیں مارنے میں سب سے آگے کھڑی ملی۔ اس کے خیال میں وہ اچھال اچھال کر بے چارے مینڈک کو اتنی تکلیف پہنچا چکی تھی کہ وہ اب اس کی طرف دیدے پھیلائے یونہی نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کی آنکھوں سے انتقام کے شرارے لپک رہے تھے۔

کلاس کے اس بے سروپا ہنگامے کو قابو کرنے کے لئے کوئی بھی استاد موجود نہ تھا۔ شور کی آواز سن کر سر اسد کلاس میں آئے اور ان سب کو بمشکل پر سکون کیا۔ لڑکوں کی ہنسی ہی بند نہیں ہو رہی تھی۔ وہ لڑکیوں کی چیخوں کی نقل اتار اتار کر ہنس رہے تھے اور اپنے ہاتھ پیٹوں پہ رکھ لیے تھے۔ لڑکیاں بھی اب کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی۔ مسئلہ جوں کا توں تھا۔ جس کو چیڑنا پھاڑنا تھا وہ جاگ گیا تھا۔ بند جار کے اندر موجود ہوتے ہوئے ہی اس نے حشر برپا کروا دیا تھا۔ بالآخر سر اسد نے لڑکوں کو بھیج کر اپنی بائیک سے پٹرول نکالا اور مینڈک والے جار میں کچھ مقدار انڈیل دی۔ جار کو جب ہلایا گیا تو وہ انتقام کے شرارے اپنی آنکھوں میں لئے ہی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اب چیخیں مارتی لڑکیوں کا افسوس قابل دید تھا۔

خیر خدا خدا کر کے بائیولوجی لیب میں جانے کا مرحلہ آیا۔ ڈائی سیکشن بورڈ پہ thumb pins سے مینڈک کو منسلک کیا گیا۔ تو لڑکیوں کی سی سی اور لڑکوں کی ہنسی کی آواز پھر سے گونجنے لگی۔ گول میز کے گرد کھڑے بچوں میں لڑکوں لڑکیوں کی تخصیص نہ تھی۔ آفتاب نے اسی وقت کا فائدہ اٹھایا اور پاکیزہ کے قریب جا کھڑا ہوا۔

سر اسد مینڈک کے پیٹ کو چیر چکے تھے سب کی نظریں مسلسل اب اسی کی طرف تھی۔ سرگوشیاں مدھم ہوتے ہوتے تمام ہو گئی۔ پاکیزہ کے ہاتھ پہ کوئی لمس جاگا۔ اس کا ہاتھ کسی نے تھاما تھا۔ پاکیزہ نے ساتھ کھڑے وجود کو آنکھیں کھول کر دیکھا۔ آفتاب بظاہر بہت دلچسپی سے مینڈک کے نظام انہضام کو دیکھنے میں مگن نظر آیا لیکن صرف پاکیزہ جانتی تھی کہ اس کی گرفت اس وقت پاکیزہ کے ہاتھ پہ کتنی مضبوط ہے۔ پاکیزہ نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن دیو کی جان بھی کبھی طوطے سے یونہی نکلی ہے؟ طوطے کی موت ضروری ہوتی ہے۔

پاکیزہ کا ہاتھ چھڑوانے کے لیے سر اسد کی توجہ ضروری تھی لیکن وہ انتہائی انہماک سے نظام انہضام کے ہر ہر حصے کو بچوں کو دکھاتے نظر آئے۔ پاکیزہ اگر شور ڈالتی تو اس کا اپنا تماشا بن جاتا۔ وہ خود تماشا بن جاتی۔ وہ خاموش رہی۔

آفتاب پورے چالیس منٹ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑا رہا۔ وہ کبھی ہتھیلی کو ہاتھ سے تھام لیتا۔ کبھی انگلیوں کو پکڑ لیتا۔ گرفت ذرا جو ڈھیلی ہوتی پاکیزہ فوری طور پہ ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کرتی لیکن اسے کامیابی نہ ملی۔ اس کی آنکھوں کے اندر اتنے انوکھے رنگ اترنے لگے کہ وہ سامنے پڑے مینڈک کے دل اور معدے میں کوئی فرق نہ کر سکی۔ اس کا دل چھوٹا پڑ رہا تھا اور ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ رہی تھیں۔ کوئی بہت ہی منفرد احساس سرطان کی طرح اس کے لہو میں شامل ہوا۔

پہلی بار کسی لڑکے نے اسے چھوا تھا اور اتنی نرمی سے اس کے ناخنوں سے اپنی انگلیں مس کی تھیں۔ پاکیزہ کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے سر میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ پچاس منٹ بعد جب آفتاب نے اس کا ہاتھ چھوڑا تو پاکیزہ کے دماغ میں جتنے تیز جھکڑ چل رہے تھے دل میں اتنی ہی خاموشی تھی۔ صحراؤں کی راتوں میں ٹھنڈک سی خاموشی۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆

ذرا سی دیر میں دل میں اترنے والے لوگ

ذرا سی دیر میں دل سے اتر بھی جاتے ہیں۔

"پاکیزہ یہ تمہاری کاپی" آفتاب نے آکر پاکیزہ کو چیک ہوئی کاپیوں میں سے اس کی کاپی نکال کر دی۔

پاکیزہ نے ہاتھ میں کاپی پکڑی اور آفتاب کے منہ پر دے ماری۔ وہ اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے" اس کی زہر خند آواز گونجی۔

کلاس میں اس وقت صرف دو چار لوگ اور تھے۔ وہ حیرت سے ان کی طرف مڑے۔

"کیا ہوا ہے؟" صائمہ نے پاکیزہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

آفتاب ششدر سا وہیں کھڑا رہا۔ "کچھ بھی نہیں ہوا مجھے۔ چھوڑ دو مجھے میرے حال پر۔" پاکیزہ نے کندھے پہ جمے ہاتھ ہٹائے۔

کوئی مسئلہ ہے تو ہم حل نکال لیتے ہیں۔ کوئی ناراضگی ہے؟" فہد نے آگے بڑھ کر معاملہ اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی۔

میں کہہ رہی ہوں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم سب لوگ چھوڑ دو۔ مجھے اپنے مسئلے خود حل کرنے آتے ہیں۔" پاکیزہ قطعی لہجے میں گویا ہوئی۔

"لیکن۔۔۔" فہد نے اسے سمجھانا چاہا لیکن آفتاب نے بات کاٹ دی۔ "چھوڑ دو فہد۔ کوئی اسے کچھ نہ کہے"۔

سب ان دونوں سے دور ہٹ گئے۔ آفتاب نے اپنی کہنیاں بینچ پر ٹکا دی او پاکیزہ کو کہا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے کہ جب تک تمہیں سمجھ آئے تب تک کہیں بہت دیر نہ ہو جائے۔ محبت بار بار دستک نہیں دیتی۔"

پاکیزہ نے نخوت سے ناک چڑائی۔ آفتاب جا چکا تھا۔

کیاہوتا ہے ایک لڑکی کے پاس؟ صرف ایک کردار۔ یہ کیوں میرے کردار کو دھندلا کرنے کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ میرے پاس اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔ میری ذات کا آئینہ دھندلا ہو گیا تو میں خود سے کیسے نظریں ملا پاؤں گی۔ میں کیسے سر اٹھا کر جی سکوں گی۔ اتنی لڑکیاں ہیں کلاس میں اس گدھے کو کوئی اور کیوں نظر نہیں آتی۔ یہ کسی اور کی طرف اتنی ہی شدت سے متوجہ ہو جائے تو کم از کم میری جان تو چھوٹے۔ مجھے بنانے والے اللہ نے میرے کالے رنگ میں اس گورے رنگ والے کے لیے کیسی کشش رکھ دی ہے۔ یہ آزمائش ہے تو مجھ پہ ہی کیوں آن پڑی۔ یہ امتحان ہے تو میں ہی کیوں دوں۔ یہ مصیبت ہے تو میں کیوں جھیل رہی ہوں۔ یہ انعام ہے تو میری جھولی میں کیوں آن پڑا ہے۔ میں کیسے یقین کرلوں اس بات کا کہ محبت بانہیں کھولے دھیرے دھیرے قدم بڑھاتے اپنی ساری خوشبوئیں لیے میری جانب بڑھ رہی ہے۔ کیسے مان لوں کہ محبت مجھ جیسی عام لڑکی پہ بھی مہربان ہو سکتی ہے۔

وہ سوچ کے تانے بانے بنتی نجانے کس مقام پہ کھڑی تھی۔ زندگی نے تنہا سی لڑکی کو بس ایک نظر دیکھا اور پھر وقت کے گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی۔ وہ سرپٹ دوڑنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

زندہ رہنے کا حوصلہ دینا
کتنا آسان ہے مشورہ دینا

تسکین لمبے بال کھولے آئینے کے سامنے بیٹھی تھی۔ ایک ہاتھ اپنی زلفوں میں پھنسایا ہوا اور دوسرے ہاتھ سے کنگھی کو سختی سے پکڑا ہوا تھا۔ اتنی سختی سے جیسے دل ہی دل میں کچھ فیصلے کر رہی ہو، کچھ یاد کر رہی ہو، کچھ بھول جانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے چمکتے سفید بال آئینے سے منعکس ہو کر اس کی اپنی ہی آنکھوں میں چبھنے لگے۔ وقت غلام بنالیتا ہے کیونکہ ہم وقت پہ فیصلے نہیں کرتے!

"پھوپھو کیا کر رہی ہیں؟" پاکیزہ کو اپنی تنہائی افسردگی کی دہلیز پہ دھکیلنے کی کوشش میں سرگرداں نظر آئی۔ وہ افسردگی سے چھپتی ان کے دامن کو تنکا جان کر لپکی اور تھامنا چاہا۔

"میں کیا کر رہی ہوں؟ میں نے کیا کرنا ہے، میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔ اپنے نصیبوں کو ہی رو سکتی ہوں۔ وہی کر رہی ہوں۔" انہوں نے کنگھی کو آئینے پہ دے مارا۔

"ہر وقت عجیب وغریب بنا رہتا ہے گھر کا ماحول۔ میں اور آپ دو لوگ ہیں اس گھر میں۔ آپ مجھے کچھ نہیں کہتی، میں آپ کو کچھ نہیں کہتی۔ پھر آخر ہم آرام سے بات کیوں نہیں کر سکتے۔ سکون سے رہ کیوں نہیں سکتے۔ آپ کا ایک دن مزاج ٹھیک ہوتا ہے تو دو دن برہم رہتا ہے۔ آپ اپنے آج سے سمجھوتا کیوں نہیں کر لیتی؟" وہ الجھ پڑی۔ اس کی پھوپھو آج پھر اپنے آپ میں سے نکلی جا رہی

تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ انہیں ان کے حال پہ چھوڑ کر واپس پلٹ جاتی لیکن تنہائی اتنا الجھاؤ پیدا کر دیتی ہے کہ انسان کا الجھنے کو دل کرنے لگ جاتا ہے۔

"میں سکون سے رہنا چاہتی ہوں لیکن تم نے دیکھا ہے میرے وحشت زدہ کمرے میں ناچتی تنہائی کو، تم نے دیکھا ہے میرے ترسنے کو لیکن تم کیوں دیکھو گی۔ تم نے کیوں دیکھنا ہے۔ یہ میرا درد ہے، یہ میں نے جھیلنا ہے۔ میں دوستوں کی محتاج ہوں۔ نام نہاد دوستوں کو ان کے بچے یا شوہر پریشان کریں تو وہ مجھے وقت دینے آجاتی ہیں ورنہ توجہ کی بارش کی منتظر بنی میں بنجر زمین کی طرح اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی رہتی ہوں۔ اک خاک ہے جو میرے سر پر پڑتی رہتی ہے، ایک تنہائی کا طوق ہے جو میرے گلے کا ہار بنا رہتا ہے، اک پھٹکار ہے جو مجھ پہ برستی رہتی ہے۔۔" وہ بھی تو الجھی ہوئی تھیں، انہیں بھی موقع مل گیا۔

"اگر تنہائی ایسی ہی ناقابل برداشت تھی تو آپ کو شادی کر لینی چاہیے تھی۔ پھوپھو آپ ابھی بھی کسی کو ڈھونڈ سکتی ہیں تو ڈھونڈیں۔ اپنا گھر بسائیں۔ مجھے خوشی ہو گی۔" پاکیزہ نے بڑی آسانی سے حل بتا دیا۔

"کتنا آسان ہوتا ہے ناں کسی دوسرے کو حل بتانا۔ چٹکیوں میں دوسروں کو ان کی الجھن کے سلجھاؤ تک پہنچانا۔ ہم اتنے عالم فاضل ہوتے ہیں تو آپ اپنے راستے اپنے لیے کیوں آسان نہیں کر لیتے۔ مجھے بر ہی ڈھونڈنا ہوتا تو پہلے کیوں نہ ڈھونڈ لیتی۔ تم چاہتی ہو کہ میں بر خود ڈھونڈوں تاکہ معاشرہ مجھ پہ انگلیاں اٹھائے، میرے کردار پہ انگلیاں اٹھائے۔ پہلے ماں زندہ تھی۔ اسے میں اتنی عزیز تھی کہ وہ مجھے کسی دوسرے کو سونپنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ مرتے مرتے گھر بھی بھائی کی جگہ میرے نام کر گئی۔ انہیں لگا تھا سر پر پڑی چھت سے بڑا کوئی ساتھی نہیں ہے، انہیں کیا معلوم تھا ہر رات تنہا جاگتے اور اس چھت کو تکتے گزرتی ہے تو یہ چھت آسیب زدہ لگنے لگتی ہے۔ یہ چھت امان نہیں لگتی، عذاب لگتی ہے۔ ماں کے بعد میں بھائی کو عزیز ہو گئی۔۔۔ اتنی عزیز کہ ان کی ناک کے نیچے کوئی شخص نہیں آیا۔ کوئی رشتہ ان کو میرے لیے پسند ہی نہیں آیا۔ پھر تمہیں میری گود میں چھوڑ کر دونوں ایک دن نکلے تو واپس کبھی لوٹ کر نہ آئے۔ سال بھر کی بچی کو چلنا پھرنا سکھاتی، اسے سکول داخل کروا کر لوٹی تو میرے بال اتنے سفید ہو چکے تھے کہ کسی کی محبت کا گلاب ان میں سج ہی نہ سکا۔ آج تم سوچنے اور بولنے کے قابل ہوئی ہو تو کہتی ہو کہ شادی کر لیں، کتنا آسان ہے ناں مشورے دینا۔ بہت آسان ہے مشورے دینا۔" وہ تلخ اور تند لہجے میں کہتی آخر میں ٹھنڈی سی ہو گئی۔

"پھوپھو کوئی تو ہو گا جس نے کبھی آپ کو پسند کیا ہو؟ جس کے لیے آپ کا دل بھی دھڑکا ہو۔" نجانے ایک اجنبی سے اتنا ذاتی سوال پوچھنے کی ہمت پاکیزہ کے اندر کہاں سے آئی۔ یہ سوال بچپن سے اس کے ذہن پہ دستک دیتا رہا تھا۔ آج جو ماحول سازگار دیکھا تو دہلیز پار کر بیٹھا۔

کہکشاؤں کی چمک ایک سیکنڈ کے لیے تسکین کی آنکھوں میں ابھری، اس کے چاندی سے بال شرما گئے لیکن ساتھ ہی حال جیت گیا، چمک معدوم ہوئی۔

"پاکیزہ یہ معاشرہ ہے ناں اسے پسند سے، دل کی دھڑکن سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کا تعلق ہے تو رسم سے، رواج سے، اور عقیدے سے۔ اس معاشرے میں انسان تو مر سکتا ہے لیکن روایات کبھی دم نہیں توڑتی۔ یہ معاشرہ آنکھ سے زنا کی کھلی دعوت دیتا ہے۔ اس معاشرے میں ہر طرح کا زنا جائز ہے اور آسان ہے۔ لیکن شادی، نکاح اور جائز تعلق بہت مشکل ہے۔ لڑکی والوں کی ناک سے لکیریں کھنچوائی جاتی ہیں۔ اور لڑکے والوں خصوصاً لڑکے کی ہڈیوں کا رس نکال کر بینڈ باجا بجوایا جاتا ہے۔ لڑکا پندرہ سال کی عمر میں شادی کا مفہوم سمجھ جاتا ہے اور شادی مانگتا ہے۔ گھر والے پھر بھی اگلے دس سال تک اس کے پچیس سال کے ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ انتظار اس دن کا ہوتا ہے کہ وہ کمانے لگ جائے۔ کمانا شروع ہوتا ہے تو اس کے بعد دس سال مزید اس کو آگ میں تپایا جاتا ہے۔ سونا تو وہ پہلے ہی ہوتا نہیں کہ کندن بن جائے لیکن کئی لڑکیوں کے روپ سے وہ اپنی آنکھیں سینکتا رہتا ہے۔ کئی تتلیوں کو گھر کا رستہ بھلاتا ہے، کئی پنچھیوں کو اپنی مٹھی میں دبوچتا رہتا ہے۔ ان ہی کے گھروں کی لڑکیاں جب ایسے ویسے کسی بہلاوے میں آجاتی ہیں تو سارا ذمہ دار معاشرے کی کمزور بیساکھیوں کو ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف لڑکا مرد بننے تک کی عمر میں اگر شادی کا نام لے ،خاص طور پر پسند کی شادی تو اس کو اتنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا جاتا ہے کہ اگر وہ کسی کو پسند بھی کرتا ہو اور کسی کا دل اس کے نام پہ بھی دھڑکتا ہو تب بھی وہ اس بے امان کو اپنا نام نہیں دے سکتا۔ ہمارا معاشرہ اسے اتنی بہادری کی اجازت دیتا ہی نہیں ہے۔ اس معاشرے کی عورت سے تو تم نہ پوچھو کہ اس کا دل کبھی کسی کے نام پہ دھڑکا یا نہیں۔"

پاکیزہ نے بہت سے خوابیدہ خواہشات کے پنچھی ان کے لہجے میں پرواز کرتے اور پھر بے موت مرتے دیکھے۔

"آپ پریشان نہ ہوں پھوپھو، اللہ سب اچھا کرے گا۔"

"اللہ تو ہمیشہ ہی اچھا کرتا ہے۔ اس نے تو کرنا ہی اچھا ہے۔ اس کے بندے ہیں ناں ہم سو برائیاں کر لیں تب بھی وہ اچھا کرتا ہے لیکن کچھ چیزیں ہمارے ہاتھ میں بھی ہوتی ہیں۔ اگر ہم ان چیزوں پہ کسی وقت اسٹینڈ نہیں لیتے تو ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہر کسی کو الزام دیں۔ مجھے بھی کوئی حق نہیں ہے کہ میں کسی کو الزام دوں۔'' پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتا مزاج ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت رواں ہوا۔ وہ چیزوں کو ہذیانی انداز میں الٹ پلٹ رہی تھی۔

پاکیزہ خاموش کھڑی انہیں ماضی پہ آنسو بہاتا دیکھتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اب سانپ دائرے سے باہر نکل چکا ہے۔ لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہی ہونا تھا جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ چاہے وہ خاموش کروائے یا نہ کروائے۔

تمہیں زندگی موقع دے تو تم ضرور لینا موقع۔ تم آخری دیئے سے بھی آگ لگا سکو تو لگا لینا۔ اپنے حصے کی زندگی جینا۔ مجھے تو کسی نے زندگی جینے ہی نہیں دی۔ پہلے میری ماں میری دشمن بنی رہی۔ پھر میرا بھائی میرے سر پہ سوار رہا۔ تمہارے باپ کی وجہ سے آج میں ایسی ہوں۔ تمہاری ماں کو اپنی رنگ رلیاں منانے سے فرصت ملتی تو وہ گھر میں ایک تنہا سڑتے ہوئے وجود کا جائزہ لیتی۔ پھر تمہیں میرے سر پہ چھوڑ دیا گیا۔ سب منحوس میرے لیے ہی رہ گئے تھے۔

تسکین اپنے سنگھار میز پر پڑی سب چیزوں کو ہاتھ مار کر گرا چکی تھی۔اس نے ساری رات اسی قالین پہ پڑے بڑبڑاتے رہنا تھا۔اگر کوئی اس کے قریب آتا تو وہ خود کو نقصان پہنچا لیتی۔ایسا ایک دو بار نہیں سینکڑوں بار ہو چکا تھا۔

"اگلی آنے والی صبح نارمل ہوتی،تاثرات سے عاری چہرہ لیے ناشتہ تیار رکھے ملتی جیسے کل رات کچھ ہوا ہی نہ ہو۔"کوئی خواب مرا ہی نہ ہو،کوئی پرندہ پھڑ پھڑایا ہی نہ ہو۔اور کوئی سانس اٹکا ہی نہ ہو۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

دن بھر تو میں دنیا کے دھندوں میں کھویا رہا

جب دیواروں سے دھوپ ڈھلی تم یاد آئے۔

انسان کو اپنے ماں باپ سے ہزاروں شکوے ہو،وہ بظاہر ان سے دور ہو جائے تب بھی وہ ان کی برائی کر سکتا ہے لیکن سن نہیں سکتا۔کسی دوسرے کے منہ سے کسی صورت نہیں سن سکتا۔

پاکیزہ کو اپنے والدین میں سے کسی کا چہرہ یاد نہیں تھا۔گھر میں پڑی دو چار تصویروں سے ان کے تصور کو بمشکل ذہن نشین کیا لیکن تصور سے کہیں پہلے شکایتیں اس کے دماغ جگہ پاتی گئیں۔بھلا کیسے والدین تھے ایک سال کی بچی کو چھوڑ گئے۔ہزاروں شکوے اور لاکھوں گلے جاں گزیں رہتے۔لیکن پھوپھو جب کوسنے دیتی تو پاکیزہ کو بھول جاتا کہ اس نے والدین کے بغیر رہ کر والدین کے بارے میں کیا کیا عجیب خیالات پال رکھے ہیں۔اسے یہ بھی بھول جاتا کہ اس کی پھوپھو نے اس کے ہر ہر قدم پہ سو سو بلائیں اپنے سر لی ہیں۔اس کے سکون اور آسائش کا خیال رکھا ہے۔اسے یاد رہتا تو بس یہ کہ تسکین پھوپھو اس کے مرے ہوئے ماں باپ کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کرتی ہیں۔

شاید ان دونوں کے رشتے کے درمیان خلا کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔اسی وجہ نے پاکیزہ کے اندر بھی چھپے ہوئے بہت سے درز بنا دیئے۔وہ بظاہر سختی سے مضبوطی سے کھڑی ہوئی ملتی لیکن تیز ہوائیں جب درزوں سے گزرتی بہت کچھ اندر تک ہل کر رہ جاتا۔

سکول میں ٹوتھ پیسٹ کی کمپنی والے آئے ہوئے تھے۔مئی کے مہینے میں ماں کا عالمی دن منانے کے لیے وہ بچوں کے ہاتھوں سے ان کی ماؤں کے لیے پیغامات لکھوا رہے تھے۔پاکیزہ نے محرومی بھرے کچھ الفاظ کاغذ پہ گھسیٹے۔میم نگین نے اس سے صفحہ لے کر پڑھا اور اسے باقی کلاس کے بچوں کے پیغامات جمع کرنے بھیج دیا۔پاکیزہ کے کاغذ پہ لکھا تھا۔

"دنیا کی سب سے بدنصیب بیٹی وہ ہے جس کی ماں اس کے سر پہ نہیں ہوتی،اسے سرد و گرم سے بچا نہیں سکتی،اس کی تربیت نہیں کر سکتی،اس کے ساتھ ایک بار پھر سے جوان نہیں ہو سکتی،اس کے غم نہیں بانٹ سکتی،اس کے درد نہیں پڑھ سکتی،اسے اپنی آغوش میں سمیٹ نہیں سکتی۔جب جب رات گہری ہوتی ہے آپ کی یاد،آپ کا چہرہ،آپ کا تصور میرے ذہن کے نہاں خانوں میں آن بستا ہے۔میرا دل چاہتا ہے کہ وقت پیچھے پلٹ جائے اور میں آپ کی گود میں چھپ جاؤں۔ایک دفعہ میں اپنے ہوش و حواس میں

آپ کے لمس کی گرمی محسوس کر سکوں لیکن ایسا ہو نہیں ہو سکتا۔ میں تو بد نصیب ہوں۔ بہت بد نصیب ہوں۔ تنہائی اور اندھیرا میرا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔ میں روتی رہتی ہوں۔ میں آپ کو بہت یاد کرتی ہوں امی۔ میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں۔"

میم نگین پاکیزہ کے والدین کے انتقال سے واقف تھیں۔ انہوں نے اپنی انگلی سے آنکھ کے کنارے پہ آیا آنسو صاف کیا۔ ایک نظر پاکیزہ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پہ کوئی بھی تاثر نہیں تھا۔ سپاٹ چہرہ لیے وہ پیغامات اکھٹے کر رہی تھی۔ میم نے اس کو ہی ذمہ داری سونپی کہ یہ پرنسپل کے دفتر میں دے آئے۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کو ہلکی سی ٹھوکر لگی۔ صفحے ہاتھ سے گر گئے اس نے ان سب کو اٹھایا اور دوبارہ کھڑی ہوئی۔ سب سے اوپر پڑا پیغام آفتاب کی ٹیڑھی میڑھی لکھائی میں لکھا ہوا ایک جملہ تھا۔

میں گھر میں جا کر سب سے پہلے اپنی ماں کا چہرہ دیکھتا ہوں کیونکہ میں جو بھی کہوں یا وہ جو بھی کہیں، انہیں مجھ سے زیادہ اور مجھے ان سے زیادہ کسی سے محبت نہیں۔

پاکیزہ کی رفتار میں سستی آگئی۔ آفتاب میں کیا تھا کچھ بھی نہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھا جائے تو پیسے اور وجاہت کے علاوہ اس لڑکے میں رتی بھر بھی کشش والی کوئی شے نہیں تھی۔ اس کی لکھائی، اس کی پڑھائی، سب عام تھا۔ اعتماد صفر تھا۔ کسی نئے شخص سے بات کرتے ہوئے وہ ہکلانے لگ جاتا۔ لیکن پاکیزہ مسحور ہو گئی۔۔۔

وہ مسحور اس لڑکے سے نہیں ہوئی جو مسلسل اس پہ فسوں پھونکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ مسحور اس گھر سے ہوئی جس میں ماں رہتی ہے۔ اس جذبے پہ اس کو بھی اختیار نہ تھا۔

ایک گھر جس میں ماں ہو وہ کتنا حسین ہو سکتا ہے اس کا اندازہ واقعی صرف وہ کر سکتا ہے کہ جس نے ماں کے بغیر زندگی کو گزارا ہو۔ کچھ چیزیں ہم میں ہوتی ہیں اور دوسروں میں نہیں ہوتی۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں پزل کے ٹکڑوں کی مانند بچھنے لگتے ہیں۔ اور زندگی کی بساط ہم ادھورے ادھوے حصوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر منظر نامے کو مکمل کر دیتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

میں کر رہا ہوں محبت بھی اس لئے شاید

جو کام کر نہیں سکتا وہ کام کرتا ہوں

جس طرح موسیقی کے دھیمے دھیمے سر ہمیشہ کانوں میں سنائی دیتے رہتے ہیں، روپہلی چاندنی زمین پہ اپنے جلوے بکھیرتی رہتی ہے، سورج اپنی طلسماتی شعاعیں لئے ابھرتا ڈوبتا رہتا ہے وقت بھی ان سب کی طرح سبک رفتاری سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ وقت بھی ہمیشہ سفر میں رہتا ہے۔ کوئی شے بہت بڑی یا چھوٹی نہیں ہوتی، اس سے جڑے احساسات شے کو بڑا یا چھوٹا کر دیتے ہیں۔ نہم کے امتحانات بھی ایسے ہی تھے کہ جب تک ہوئے نہیں اس کے لیے سوہان روح بنے رہے۔ جب ہو گئے تو یوں لگا کہ جیسے

کوئی بات ہی نہیں تھی۔ چھوٹا سا مذاق تھا جو بہت بڑا جن بن کر سر پہ سوار تھا۔ دن بیتتے چلے گئے اور پھر وہ دن بھی آ گیا جس دن رزلٹ تھا۔

پاکیزہ کی ذہانت نے اسے دنیا کے سامنے ممتاز کر دیا۔ اس کا بہت لمبا چوڑا نام نہ تھا جو یاد رہ جاتا۔ نام کے ساتھ پھوپھو نے والد کا نام بھی نہ لگایا، مختصر سا نام تھا لیکن اس نے اپنی شناخت بنالی۔ پورے ضلع میں اس کی پانچویں پوزیشن تھی۔ اچھی یاداشت اچھی شے ہے بری۔۔۔ اس سے قطع نظر تعلیمی میدان میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس عام سے سکول میں رہ کر اتنے اچھے نمبر لینا بہت بڑا کارنامہ بن گیا۔ پرنسپل نے پاکیزہ کی بلائیں لی۔ اساتذہ اور پاکیزہ کے اعزاز میں ایک خصوصی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ ہال میں سب تیاریاں مکمل تھیں۔ سٹاف روم میں کیک پڑا ہوا تھا۔ پاکیزہ کھڑے پانی جیسی نہیں تھی۔ اس کے اندر کی صلاحیتیں ابھر ابھر کر باہر آتی۔ اس تقریب میں خاص بھی وہی تھی اور منتظم بھی۔ وہی کیک لینے سٹاف روم میں گئی۔ پیچھے مڑی تو آفتاب کھڑا تھا۔ ایک کلاس میں رہتے ہوئے سرسری سی سلام دعا پھر سے شروع ہو گئی تھی۔ بچپن کی لڑائیاں ایسی ہی ہوتی ہیں پل میں تو تو میں میں اور دوسرے ہی پل تو ہی تو۔۔۔

"مبارک ہو" وہ بہت دھیمے لہجے میں بولا۔

"خیر مبارک" پاکیزہ کیک کو ڈبے سے نکال کر ٹرے میں رکھنے لگی۔

کیک کی کچھ کریم ڈبے کے اطراف پر لگی تھی۔ آفتاب نے اسے اپنی انگلی پہ لگا لیا۔ پاکیزہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسلسل اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ پاکیزہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔ وہ تین قدم مزید آگے آیا۔ اور پاکیزہ تین قدم مزید پیچھے ہٹ کر دیوار سے جا لگی۔ وہ اس کے بہت پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ پاکیزہ اس کی آنکھوں کا سامنا نہ کر سکی۔ اس نے اپنی آنکھیں میچ لی۔ آفتاب نے اس کے گال پہ انگلی سے ہلکی سی کریم لگا دی۔ وہ لب اور آنکھیں بھینچے خاموشی سے کھڑی رہی۔ وہ کچھ بھی نہیں بول پا رہی تھی۔ چند ثانیے گزر گئے۔ سفید سی کریم نے پاکیزہ کے چہرے پر ہفت رنگ پھیلا دیئے۔

پاکیزہ کو لگا وہ کمرے سے نکل گیا ہو گا۔ اس نے آہستگی سے آنکھیں کھولی۔ وہ وہیں تھا، ادھر ہی۔ اس کے عین سامنے کھڑا اس کی پلکوں کے لرزنے تک کو توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

"احمد کو کہا کرو تم سے دور کھڑے ہو کر بات کیا کرے۔" آفتاب نے بہت سخت سے انداز میں کہا۔ اور باہر چلا گیا۔

آج صبح ہی احمد اس کے پاس کھڑا آج کے پروگرام کی تفصیلات ڈسکس کر رہا تھا۔ پاکیزہ کو بھی اس کا اتنا پاس کھڑا ہونا عجیب لگا لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔ اتنا وہ بھی جانتی تھی کہ دو نظریں خفگی سے اس منظر کو دیکھ رہی ہیں۔ لیکن اس خفگی کا اظہار اس طرح سے ہو گا وہ بھی نہیں جانتی تھی۔

اس کی زندگی کے نسبتاََ بڑے دن میں وہ اپنے رنگوں کی چھاپ اس کی روح تک اتار گیا۔ اپنی عدم اعتمادی کو اس کے ہاتھوں کی لرزش میں بدل گیا۔ پوری تقریب میں وہ اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے بیٹھی رہی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ان سے جیسے تیسے جاناں نبھانا ہو گی مجھے

اشک میرے ازلوں کے ساتھی خواب میرے ماں جائے

اس کے اندر کا زور آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ اس کے پاس اتنی ہمت نہیں بچی کہ وہ اپنے اندر کے ابال کو اپنے رقص سے باہر نکال سکے۔ درد تھا کہ بہت تھا۔ کتھارسس کا کوئی بھی ذریعہ اس کے غم کو ختم نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے گھٹنوں کو چھوتے لمبے سیاہ بال کھلے پڑے تھے۔ ابھی کچھ دن پہلے تک ان کی چمک سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور آج ان کے اجاڑ پن سے حزن کی داستانیں لپٹی نظر آئیں۔

"وہ میری زندگی میں آیا ہی کیوں تھا جب اس نے چلے جانا تھا۔ وہ نہ آتا میں رہ لیتی۔ میں اس کے بغیر جی لیتی۔ اس کے ہونے نے مجھے اس کی عادت ڈالی۔ ایسی عادت ڈالی کہ اب وہ مجھے میرے لہو میں گردش کرتا ملتا ہے۔ اگر میں آنکھیں بند کر کے یہ تصور کروں کہ جیسے میرے آج کل دن کٹ رہے ہیں آئندہ زندگی بھی ایسے ہی اس کی بغیر گزرے گی تو واللہ میرے دل کی دھڑکن ہی رک جائے!۔

مجھے اس کے بغیر سانس ہی نہیں آسکتی۔ بھلا ایسے بھی ہوتا ہے؟ کوئی کسی کو یوں دھتکار سکتا ہے۔ وہ ضرور کسی غصہ میں ہو گا۔ اس کی اپنی کوئی پریشانی ہو گی ورنہ ایسی زبان اور وہ میرے ساتھ استعمال کرے۔ وہ مجھے کہتا تھا کہ تمہارے جیسی کوئی ایک بھی نہیں تو وہ اس ایک کو دنیا کے لیے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟

وہ پھر رونے لگ گئی۔ اس کے آنسو ٹوٹ کر چوکھٹ پہ جذب ہونے لگے۔ اپنے کمرے کی دہلیز پہ بیٹھی وہ جوگن جوگن سی لگی۔

کیا وہ نہیں جانتا کہ میں اس سے کتنا پیار کرتی ہوں۔ کیا اسے اندازہ نہیں ہے کہ وہ ہر رات میرے ذہن میں آنے والی آخری سوچ ہے۔ وہ میری ہر صبح کا پہلا خیال ہے۔ وہ میرے لیے ریشم ہے، اطلس ہے، کمخواب ہے، ہیرا ہے۔ وہ میرے لیے اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ مجھے اس دنیا سے کچھ بھی نہیں چاہیے، مٹی کا ایک ذرہ بھی نہیں اور سانس لینے کو ہوا کا ایک جھونکا بھی نہیں۔ مجھے وہ چاہیے۔ صرف وہ چاہیے۔

وہ جب میرے قدم سے قدم ملا کر چلتا ہے تو ساری زندگی کے دکھ کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ میرے ساتھ خوشیاں رقص کرتی ہیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے خوشی سے سب دنیا کے دیئے دکھ سہتی رہتی ہوں۔ اللہ جی! آپ تو اپنے بندوں کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ مجھے میری ہنسی کا سبب لوٹا دیں۔ میرے سارے غم ایک طرف اور وہ اکلوتی خوشی ایک طرف۔۔۔! اللہ جی مجھے وہ خوشی دے دیں جس

سے مجھ میں جینے کا حوصلہ رہتا ہے۔ اللہ جی! مجھ سے وہ نہ لیں باقی سب لے لیں۔ اللہ جی! اگر مجھ سے اسی کو لینا ہے تو پھر مجھے زندہ نہ رکھیں۔

میں کسی اور کو اس کے علاوہ تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اس کی آنکھیں میرے دماغ سے نہیں نکلتی۔ میں اس کے ساتھ بھی کسی دوسری کا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔ اللہ جی جو ہوا اس کو چھو لیتی ہے میں تو اس ہوا سے بھی ناراض رہتی ہوں۔ اگر وہ مجھ سے چھین کر کسی اور کو دے دیا گیا تو میری بددعائیں، میری آہیں، ان کی زندگی کو لگ جائیں گی۔ اللہ جی! اتنی زندگیاں نہ خراب کریں ناں۔ میری زندگی آباد کر دیں۔ مجھے میری زندگی دے دیں۔

اس نے اپنا ہاتھ پھیلا کر زمین پہ رکھ لیا وہ ہاتھ کو زمین پہ رگڑ رہی تھی تاکہ اس سے جدا ہونے کی لکیروں کو مٹا سکے۔ زندگی کے وار نے اسے حیران کیا تھا۔ وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ خود کلامی کرتی رہی۔

زندگی میں ہار جانا کسے کہتے ہیں؟ کہانیوں ڈراموں میں لوگ بے ہوش ہو جاتے ہیں، عام زندگی میں تو حقیقت ہوش ایسے چھینتی ہے کہ انسان اپنی آنکھیں بھی موند نہیں سکتا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے حقیقیت کو دیکھتا رہتا ہے۔

جس شخص کو خوبصورت لگنے کی دعائیں میں نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر مانگی۔ میں اس کے لئے اگر کچھ تھی تو وہ تھا "کچھ بھی نہیں"۔ ساری الفتوں کا واحد مرکز میرے شانے پہ سر ٹکائے کسی اور کے خیالوں اسیر تھا اور میں پاگل یہ جان ہی نہ سکی۔ میں اتنی معمولی ہوں کہ میری ذات کا کوئی بھی پہلو، میرے جسم کا کوئی بھی عضو اسے میرے ساتھ باندھ کر نہیں رکھ سکا۔ وہ میرے راستے میں آ گیا ۔ میرے مقصدِ حیات سے لپٹ گیا۔ میں نے اسے ہی مقصدِ حیات بنا لیا۔ وہ میری لئے زندگی بن بیٹھا اور میں کیا تھی اس کی عام سی زندگی کا معمولی سا معمول۔۔۔!

میں خود کو اس کی فطرت سمجھتی تھی لیکن میں تو اس کی عادت نکلی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ بے انتہا محبت پہاڑ کی اونچائی جیسی ہوتی ہے آپ واپس پلٹو یا مزید آگے جاؤ آپ کو نیچے اترنا ہی پڑتا ہے۔ میں محبت کرتی رہی۔ یہ بھی جانتے ہوئے کہ اپنا ہی ساتھی جب ہاتھ چھڑا لے تو یہ پہاڑ ایک لمحے کے اندر اندر خود ادھورے وجودوں کو سر پٹخنے کے لئے پستیوں میں دھکیل دیتا ہے۔ میں اس بے وفا سے وفا کرتی رہی۔

اللہ جی! میں نے اس کو ابد تک مانگ رکھا تھا۔ ایک انسان سے اتنی امیدیں اور خواہشیں لگانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ زندگی کے اس کھیل میں میں اپنے نفس کے ہاتھوں ہار گئی۔ میں اپنی غلطی مانتی ہوں۔ اللہ جی! ایک واحد جگہ جہاں جیتنا میری اولین خواہش تھی میں سر کے بل گری ہوں۔ دیکھیں ناں میری ذات کا اعتماد کچل دیا گیا ہے۔ سارا کانچ میرے چہرے کو بدنما کر چکا ہے، سارا کیچڑ میری روح کو گدلا کر چکا ہے۔ میں خوبصورت بنتی بنتی اتنی بدصورت اتنی بدبودار ہو گئی ہوں کہ نہ تو آئینہ دیکھ سکتی ہوں نہ خود کو

سونگھ سکتی ہوں۔ اللہ جی! مجھے ان میں شمار کر لے جن کی خطائیں بھلا کر تو ان کے لئے کن کہہ چکا۔ اللہ جی! میرے لئے کن کہہ دے۔

اللہ جی آپ کہتے ہیں کہ بندہ میری طرف ایک قدم بڑھائے تو میں اس کی طرف سو قدم بڑھاتا ہوں۔ اللہ جی میرے اٹھے ہوئے ہاتھ آپ کی بزرگی و برتری کو تسلیم کر رہے ہیں۔ آپ کو اللہ جی! آپ کی بزرگی کا واسطہ مجھے وہ دے دیں۔ میں آپ سے اور کچھ نہیں مانگوں گی۔ کبھی نہیں مانگوں گی۔ میں نے مانگا بھی تو آپ مجھے نہ دینا۔ بس ایک وہ شخص تو دے دیں۔ پلیز اللہ جی! میں نے کوئی خواہش ایسے گڑگڑا کر نہیں کی۔ اللہ جی آپ تو کہتے ہیں کہ جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو مجھ سے مانگو۔ اللہ جی آپ تو اتنی حقیر حقیر سی چیزیں اتنی ضروری ضروری سی چیزیں بغیر مانگے دے دیتے ہیں۔ اللہ جی تیری یہ بندی حقیر ہے اور اور اس کے لیے وہ بندہ ضروری ہے، بہت ضروری۔ مجھے میری ضروری چیز دے دیں۔ مجھے میرے زندگی کے لیے ضروری انسان دے دیں۔ اللہ جی میری ضرورت پوری کر دیں۔

وہ سجدے میں پڑی تھی۔ اس کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ کچھ دکھ جیسے اندر موجود تمام آنسوؤں کے سامنے کی رکاوٹ کو دور کر دیتے ہیں۔ ہمیں خود بھی معلوم نہیں ہوتا اور آنسو ہماری آنکھوں سے پھیل جاتے ہیں۔ اور جب وہ گالوں پہ بہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم تو رو رہے ہیں۔ اس کے آنسو بھی شتر بے مہار تھے۔ بہے چلے جا رہے تھے۔

رد کیے جانے کا احساس میری جان لے رہا ہے۔ میرے دل میں اتنی محبت تو نے کیوں ڈال دی اللہ جی۔ اس محبت کا تھوڑا سا حصہ اس کے دل میں بھی ڈال دیتے تو میں اس اذیت سے گزر ہی جاتی۔ اس تکلیف کو میں جھیل ہی لیتی۔ اس کے بغیر جیسی راتیں میں نے گزاری ہیں۔ میری جدائی کی ایسی ایک رات اس پہ بھی گزر جاتی۔ میری محبت کا چھوٹا سا پودا اس کے دل میں بھی لگ جاتا تو میں یوں بے امان نہ ہوتی۔ اللہ جی مجھے امان دے۔ اللہ جی مجھے سکون دے۔

وہ رو رہی تھی اور ایک سکون تھا جو اسے نہیں مل رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر بستر پہ آنے کی کوشش کی۔ وہ لڑکھڑائی بالآخر پہنچ ہی گئی۔ وہ لیٹی اور اس کے آنسو یونہی بہتے رہے۔ مسلسل بہتے رہے۔ اس سے لیٹا بھی نہیں گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے بیڈ کے پاس پڑے دراز میں ہاتھ مارا۔ اس کے ہاتھ میں وہ آچکا تھا۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے میں اسے تھام کر آنکھوں کے قریب کیا۔ غور سے اسے دیکھا۔ پھر اسی بلیڈ کو اپنی بائیں کلائی پہ سختی سے پھیر دیا۔ ایسا کرتے وقت اسے آنکھیں بند کرنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئی۔ جتنا درد اس کی کلائی پہ محسوس ہو رہا تھا اس سے کہیں زیادہ، بہت زیادہ اذیت اس کے اندر تھی۔ خون نکل کر سفید کارپٹ میں جذب ہوتا رہا۔ اور وہ یونہی لیٹ گئی۔ اتنے سے خون کے بہہ جانے سے اسے موت بھی نہیں آنی تھی۔ یہ وہ بھی جانتی تھی۔ لیکن اس تکلیف سے اسے سکون مل رہا تھا۔ بہت گہرا سکون۔

شاید اسی بہانے میرے لہو میں بہتا ہوا شخص میرے اندر سے نکل جائے۔ اگر وہ نہیں نکلتا تو کم از کم اس کی یاد ہی نکل جائے۔ کچھ تو نکلے میرے اندر سے، تھوڑی سی ہی سہی۔ میں خود بھی تو اپنے آپ کو میسر آؤں۔ ذرا سی سہی میں اپنے آپ سے ملوں۔

وہ خود اذیتی اور بے بسی کے انتہا پہ تھی۔ اس سے آگے اس کے لئے کیا تھا؟ شاید کچھ بھی نہیں

☆☆☆☆☆☆☆☆

کام مشکل ہے مگر جیت ہی لوں گا اس کو

میرے مولا کا وصی جونہی اشارہ ہو گا

''سر اس نے میری ٹوپی پہنی ہوئی ہے۔ اس سے لے کر دیں۔ میں نے باز کے ساتھ تصویر بنوانی ہے۔'' احمر ماجد کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

دہم جماعت میں آتے ہی ایک تفریحی پروگرام کے انتظامات مکمل ہوئے۔ اسی لیے آج یہ سب مری کی خنک ہواؤں میں مال روڈ کے اوپن ائیر چائے خانہ میں چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ احمر کی تیزی اور ماجد کی چالاکی کی وجہ سے ارد گرد کے لوگ متوجہ ہو کر ادھر ہی دیکھنے لگے۔ احمر کی لاکھ کوششوں کے باوجود ماجد اس کے ہاتھ آ کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ سر اسد ان دونوں کو تنبیہہ کرنے کی چاہ میں اٹھ کھڑے ہوئے لیکن اس سے پہلے ہی بھاگم بھاگ میں ماجد کا بازو میم نگین کی کہنی سے ٹکرایا۔ اور ان کے ہاتھ میں موجود کپ سے بھاپ اڑاتی چائے کپ سمیت سیدھی پاکیزہ کے اوپر چھلکنے ہی والی تھی۔ بس لمحے کی دیر تھی۔ آفتاب نے آناً فاناً اپنا ہاتھ آگے کر کے میم نگین کے کپ کو مخالف سمت میں اچھالا۔ ایسا کرنے سے پاکیزہ کے اوپر صرف چائے کی چند چھینٹیں ہی آئیں لیکن آفتاب کا ہاتھ سرخ ہو گیا۔

سر اسد، احمر اور ماجد کو ایک طرف لے گئے۔ ان کو ڈانٹ اب یقیناً شدید پڑنے والی تھی۔ پاکیزہ حیران بیٹھی آنکھیں کھولے اس لڑکے کی دیوانگی کو دیکھ رہی تھی۔ ٹوٹا ہوئے کپ کے ٹکڑے فرش پہ اپنی بے وقعتی کا رونا رو رہے تھے۔ دوسری طرف پاکیزہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وقعت واقعی اسے دی گئی ہے۔ میم نگین نے فوراً اپنا پرس کھول کر برنال نکالی اور آفتاب کے سرخ ہوتے ہاتھ پہ لگانے لگ گئی۔ پاکیزہ وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھی۔ آفتاب اس کے جذبات کو سمجھتے ہوئے بھی لاپرواہی برت رہا تھا۔ اس کے رویے میں احسان کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ وہ پہلی دفعہ تب نہیں جتا رہا تھا جب وہ پہلی بار زیر بار آ رہی تھی۔ دو تین منٹ بعد ماحول واپس پر سکون ہو گیا۔

آفتاب تمہاری بھی چائے گر گئی۔'' میم نگین نے اس کے خالی کپ کو دیکھ کر پوچھا۔

''وہ میں اچانک سے آگے ہوا تھا۔ اس لیے پتہ ہی نہیں چلا۔'' اس نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

لیکن گری کہاں؟'' انمول پریشانی سے فرش پہ دیکھنے لگی جہاں چائے کا کوئی دھبہ نہ تھا۔

"یہ نہ پوچھیں کہ کہاں گری اور کہاں تک گئی۔" آفتاب نے ہنستے ہوئے اپنی کالی پینٹ کی طرف اشارہ کیا۔سب ہی ہنسنے لگ گئے۔

"پاکیزہ چائے بنا دو۔" آفتاب نے اس کے مسکراتے چہرے سے کچھ نمکین لمحے چرا کر کہا بالکل ایسے جیسے روز کا معمول ہو۔

پاکیزہ نے خالی ذہن سے اپنا ہاتھ چائے کی کیتلی کی طرف بڑھا دیا۔

اس میں آج منع کرنے کی سکت نہ تھی۔ دودھ دو چمچ ڈال کر وہ آفتاب کی طرف دیکھنے لگی۔شاید چینی کے لیے پوچھنا تھا لیکن اسے بھول گیا کہ بس چینی کے لیے ہی پوچھنا تھا۔

کچھ چہرے بند گلیوں جیسے ہوتے ہیں ان میں جھانکنے لگو تو کسی اور طرف نکلنے کے سارے راستے مسدود ہو جاتے ہیں!

اس نے واپس نظریں چائے کے برتنوں پہ گاڑ دیں۔ جو سچائیاں اس کے دماغ کو سمجھ میں آ رہی تھی وہ اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔

"پاکیزہ بیٹا مجھے بھی چائے بنا دو۔" میم نگین اسے واپس سب کے درمیان لائی۔

اس نے ادھوری چائے کی پیالی ادھوری ہی چھوڑ دی۔ دو چائے کی پیالیاں اور بنائی۔ ایک آفتاب کی طرف بڑھائی جسے اس نے مسکرا کر قبول کر لیا۔ دوسرا کپ میم نگین کو پکڑایا۔ سر اٹھا کر آفتاب کو دیکھا تو وہ ہاتھ میں پیالی پکڑے بازو اسی کی جانب بڑھائے بیٹھا تھا۔پاکیزہ کی آنکھوں میں حیرت در آئی۔ اس نے چائے مکمل ہوش و حواس میں بنائی تھی۔اتنی بری تو تھی نہیں کہ اسے یوں چکھ کر چھوڑ دیا جائے۔

"پی لی ہے" آفتاب نے پاکیزہ کے سوالیہ نظروں کا جواب دیا۔

پاکیزہ کی حیرت دوچند ہو گئی۔اتنی گرم چائے بھلا کوئی کیسے پی سکتا ہے۔ سوال اس کے دماغ میں کلبلایا۔اس نے خاموشی سے کپ تھاما اور ٹیبل پر رکھا۔

آفتاب اب عین اس کی پشت پہ کھڑا تھا۔

تم اگر زہر بھی دو تو اتنی ہی تیزی سے پی لوں گا۔

پاکیزہ نے اس دیوانے کی دیوانگی کو ان سنا کیا لیکن پتھر کی مورتی تو تھی نہیں، دل کی ایک دھڑکن نے دھڑکنے سے انکار کر دیا۔وہ اپنے اختیار کے معاملے میں بے اختیار ہونے لگی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

دل کی آنکھیں بھی خوب آنکھیں ہیں
وہ دکھاتی ہیں جو نہیں ہوتا

وہ دونوں اب اچھے دوست تھے۔چار مہینے کا ساتھ باقی تھا۔بد مزگی کوئی خاص تھی نہیں تو پھر احتیاط کاہے کو باقی رہتی۔پاکیزہ نے اپنے خول کو اتار پھینکا۔وہ زندگی کے یخ بستہ موسم کے لیے اس عمر کی دھوپ کی تمازت لیناچاہتی تھی۔ایسی یادیں جن کو سینک کر وہ اپنے ماضی پر خوش ہوسکے۔وہ اکٹھی کر رہی تھی۔۔۔یادیں بہت سی یادیں!

آہستہ آہستہ اس کا رویہ سب کے ساتھ ہی نارمل ہوتا چلا گیا۔وہ ہنسنے لگ جاتی۔اپنے اوپر کے دائرے چیخ چیخ کر اترتے دیکھتی تو ہوا کے مست جھونکوں کو باہیں کھول کر خوش آمدید کہتی۔اس سرمستی میں بھی اسے اپنی حد نہیں بھولی تھی۔جو بھی تھا فاصلہ قائم تھا۔حد باقی تھی۔

"بات سنو۔"آفتاب نے اس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

وہ اپنی کالی آنکھوں کو سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس پر مرکوز کرنے میں کامیاب ہوگئی۔جب دل کے جذبات پر قابو ہو تو آنکھوں میں جھانکنا مشکل نہیں لگتا۔جب تک کوئی مرد خاص مقام حاصل نہیں کر لیتا لڑکی اس کی آنکھوں میں سکون سے جھانک سکتی ہے۔وہ منفرد ضرور تھا لیکن خاص کے درجے پہ فائز نہیں ہوسکا تھا۔

"تم مجھ سے بعد میں بھی رابطہ رکھو گی ناں؟"آفتاب کی آنکھوں میں خوش گمانی کے ستارے جھلملاتے نظر آئے۔شاید اسے اپنے درجے کا اندازہ نہیں تھا۔وہ روز دوستی کی ہزار سیڑھیاں پھلانگتا تھا۔

"بعد میں کب؟"پاکیزہ کے سوال میں اتنی وضاحت تھی کہ آفتاب کو اگلا سوال کرنا مشکل لگا۔

"سکول ختم ہونے کے بعد"اس نے اب تائید چاہی۔

"تم میرے کیا لگتے ہو؟"پاکیزہ نے سوال پوچھا۔

"دوست"آفتاب نے تتلی کو تھام لینا چاہا۔

"وہ تو سب ہی دوست ہیں۔میری تمہاری دوستی کسی سے الگ نہیں ہے۔سب سے جدا نہیں ہے۔میں تم سے ویسے ہی بات کرتی ہوں جیسے باسط،معید،ماجد وغیرہ سے بات کرتی ہوں۔کیا میں نے تمہیں کبھی کوئی غلط امید دلائی۔تمہاری کسی فضول بات پہ پوزیٹو رسپانس دیا؟"پاکیزہ نے اس کی بند مٹھی اچانک کھولی تھی۔ستاروں کی چمک یکایک مدھم ہوئی۔اسے آخری سیڑھی سے نیچے دھکا دیا گیا۔

"نہیں۔۔۔ایسا میں نے کب کہا؟"آفتاب کو اس شیرنی کے غصے کا بہت اچھے سے اندازہ تھا وہ فوراً باگڑ بلا بن گیا۔چاہے ان ہی سیڑھیوں پہ ہی سہی اس جادوگر سی لڑکی سے وہ رابطے میں رہنا چاہتا تھا۔

"اب سیدھی طرح بتاؤ تم میرے کیا لگتے ہو؟"کالی آنکھیں اس کے حسین چہرے پہ رعب ڈال کر کچھ اور چمکی۔

"کلاس فیلو۔"آفتاب کی مدھم سی آواز نکلی۔

"بالکل ٹھیک۔ ابھی تم کلاس فیلو ہو میں تم سب سے بات کرتی ہوں کیونکہ تم سب ہی میرے کلاس فیلو ہو لیکن بعد میں یہ رشتہ باقی نہیں رہنا پھر میں کیوں تم سے رابطہ رکھوں گی۔ میں کیوں تم سے بات کروں گی۔ میں اپنی زندگی کے انمول لمحے اپنی یادداشت پہ محفوظ کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن اپنے حافظے کے لیے کوئی عذاب نہیں اکھٹا کرنا چاہتی۔ میں کسی بے عزت کر کے رکھ دینے والے تعلق کو ساتھ لے کر نہیں جینا چاہتی۔ اگر تمہیں مجھ سے ایسی کسی بے وقوفی کی امید ہے تو تم ہمیشہ کی طرح غلط ہو۔ تمہیں اب سے ہی مجھ سے بات کرنا چھوڑ دینی چاہیے۔"

وہ اپنی بات کہہ کر اس کی بات سننے کے لیے رکی نہیں تھی۔

اس نے اپنے سارے مہرے سوچ سمجھ کر کھیلے تھے۔ زندگی اس کی سمجھداری کو قطرہ قطرہ اپنے اندر اتار رہی تھی۔

"بھئی اچھا ناراض تو نہ ہو۔ فی الحال تو منہ نہ بناؤ۔ پاکیزہ ویسے سوچنے کی بات ہے اگر میں ابھی کلاس فیلو ہوں اور تم اس رشتے سے مجھ سے رابطہ رکھے ہوئے ہو تو بعد کے لیے بھی ایک رشتہ موجود ہے۔ کوئی پوچھے کون ہے یہ؟ تو تم کہہ دینا سابقہ کلاس فیلو۔ رشتے بننا مشکل ہوتے ہیں لیکن اگر ایک دفعہ بن جائیں تو پھر ہمیشہ سابقہ کا کارڈ گلے میں لٹکا کر ہمارے سامنے کھڑے ملتے ہیں۔ تم بے شک مجھے سامنے کھڑا مت کرنا لیکن کہیں اپنی بڑی سی زندگی میں تھوڑی سی گنجائش میرے لیے بھی نکال لینا۔ میں کبھی تمہیں۔۔۔۔۔۔۔۔" آفتاب مسلسل اس کا سر کھاتا اس کے پیچھے جا رہا تھا۔

پاکیزہ کے کالے بال پونی ٹیل کی قید میں سے نکل کر اس کے سانولے سلونے چہرے کو چوم رہے تھے۔ لیکن اس کی تیز رفتاری پر ذرہ برابر بھی اثر نہ پڑا۔ اس نے اپنا مزاج واپس درست نہیں کرنا تھا تاوقتیکہ آفتاب کا دماغ درست ہو جائے۔

وہ سانپ سیڑھی کا کھیل جاری رکھے ہوئے تھے۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ سانپ کے زہر اور سو کا ہندسہ دونوں پاکیزہ کی مٹھی میں قید تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

کمال تشنہ لبی جس نے عمر بھر جھیلی

اسے اب ساتھ بھی دریا کا ہے گوارا کب

بچپن میٹھے آموں کی ترشی جیسا ہوتا ہے۔ یہاں کھلونا توڑتے ہیں، وہاں گھر جوڑتے ہیں۔ ایک گھڑی چونچیں لڑاتے ملتے ہیں اور دوسری گھڑی سر جوڑے نظر آتے ہیں۔ دل کا آئینہ ہیرے سے زیادہ شفاف ہوتا ہے۔ غصہ ناراضگی، رنجش، چپقلش، عداوت، حسد، رشک۔۔۔ کچھ بھی زیادہ عرصے تک ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ زندہ لمحے کے لیے تلخی ہوتی ہے اور پل بھر بعد بیتے لمحے کی تلخی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

ان دونوں کا تعلق بھی ایسا ہی بن گیا۔ دھوپ چھاؤں سا، نرم گرم سا، گرمیوں کی فجر کی اذان سے پہلے کی ہوا جیسا، سردیوں کی آنگن میں اترتی دھوپ جیسا، کبوتر کے غٹرغوں میں دبی ہوئی ہولی سی شرارت لئے، چہچہاٹوں میں دل آویز سی کھنک لئے۔۔۔ دل میں اترنے والا!

سب کچھ مٹھی سے پھسلتی ریت پہ ذرہ ذرہ لکھا ہی جا رہا تھا کہ تلخی پھر سے درمیان آئی۔

پاکیزہ بپھری ہوئی کلاس میں یہاں سے وہاں ٹہل رہی تھی۔ آفتاب جونہی اندر داخل ہوا وہ اس کے پاس گئی اور ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا۔

"پٹاخ"

اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔ جو جہاں تھا وہیں رک گیا۔ آفتاب کی غلطی جو بھی ہو پاکیزہ کا ردعمل بہت شدید تھا۔ سب ملامتی نظروں سے پاکیزہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

صرف ایک وہ تھا جس کی نظروں میں ملامت نہیں تھی۔ صرف حیرت تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھوں میں وہی ازلوں سی نرمی تھی کہ جسے دیکھ کر کسی پہاڑی پر ہوتی خوبصورت برفباری کی یاد آ جائے۔

پاکیزہ کو اس یاد نے بھی غصے میں جلنے بھننے سے نہیں روکا۔

وہ آتشی نگاہیں آفتاب پر مرکوز کیے ہوئے دھاڑی۔ "کون تھے وہ؟"

"کون؟" آفتاب نے جواباً سوال پوچھا۔

"وہی جو تین سکول کے دروازے تک آئے تھے۔" پاکیزہ بہت واضح لفظوں میں اس سے سوال پوچھ رہی تھی۔

"دو میرے کزنز تھے اور ایک دوست۔" آفتاب نے جیسے اقبالِ جرم کیا۔

"کیا کرنے آئے تھے؟" تسلی پاکیزہ کو اتنی آسانی سے کہاں ہونی تھی۔

"سچ بتاؤں یا جھوٹ؟" آفتاب کے چہرے پر نازک سی انگلیوں کے نشان ثبت تھے لیکن پھر بھی اس کے انداز میں عجیب سا جھکاؤ تھا۔ ایسا جھکاؤ جس پہ شاید اس کا اپنا بھی اختیار نہیں تھا۔

"سچ بولو آفتاب نور۔۔۔۔ صرف سچ!" پاکیزہ اس کی نرمی کے جھانسے میں نہ آئی۔

"تمہیں دیکھنے آئے تھے۔" آفتاب نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

پاکیزہ کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ وہ چیخ چیخ کر بولنے لگی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

"آفتاب لڑکی عزت کرنے کی چیز ہوتی ہے دیکھنے کی نہیں۔ میں کسی چڑیا گھر کا بندر نہیں ہوں کہ تمہارے رشتہ دار اور تمہارے دوست مجھے آ آ کر دیکھیں۔ میں تمہاری پراپرٹی نہیں ہوں کہ تم مجھ پر ٹکٹ لگا کر رکھو۔ میں لڑکی ہوں۔ مجھ پر نظریں پڑنے سے

میں میلی ہوتی ہوں۔ جو نظر ارادتاً نہیں پڑتی اس کو میں ہضم کر لیتی ہوں لیکن تمہاری یہ ہمت کیسے ہوئی کہ تم انہیں مجھے دکھانے کے لیے لاؤ۔ تم ارادتاً مجھ پہ نظریں ڈلواؤ۔۔۔ میں تمہاری خریدی ہوئی ارمانی کی شرٹ نہیں ہوں۔ میں تمہارے باپ کی کمائی کی لائی ہوئی گیئرز والی سائیکل نہیں ہوں۔ میں پاکیزہ ہوں۔ پاکیزہ سمجھتے ہو تم؟ پاک۔۔۔۔ صاف دامن۔۔۔۔ تم مجھ پہ ٹکٹ نہیں لگا سکتے۔ تم لوگوں کو اس لیے نہیں پکڑ کر لا سکتے کہ وہ آئیں اور مجھے دیکھیں۔ تمہارے گھر میں بھی بہن ہے پھر بھی تم انہیں لائے کہ وہ مجھے دیکھیں۔ تمہیں یہ حق کس نے دیا۔"

وہ چیختی جا رہی تھی اور رو رہی تھی۔ اس کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس طرح ان چھبتی ہوئی نظروں کا اثر اپنے اوپر سے اتارے۔

"پاکیزہ پاکیزہ پلیز ہولڈ آن۔۔۔ میری بات تو سنو۔ وہ صرف تمہیں دیکھنے آئے تھے۔ میں نے تمہاری بہت تعریف کی تھی۔ وہ بس ایسے ہی دیکھنے آ گئے۔ جب نویں کلاس کا رزلٹ آیا تھا وہ تب سے تمہیں دیکھنا چاہ رہے تھے میں انہیں روکتا رہا۔ آج انہیں پتہ چلا کہ تم ہیڈ گرل ہو تو وہ بس گیٹ تک دیکھنے آئے تھے۔ تمہاری تعریفیں سن کر تمہیں دیکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا اور تو کچھ بھی نہیں تھا۔ تم کیوں غلط سمجھ رہی ہو؟" آفتاب اس کو سمجھانے کی ناکام کوشش کرتا اس کے آگے پیچھے ہوتا رہا۔

پاکیزہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقین آنسو چمک رہے تھے۔ وہ کسی کے سامنے رو کر خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اٹھی اور کلاس کے دروازے کی طرف بڑھی۔ آفتاب اس کو روکنے اس کے پیچھے آیا۔ وہ مڑی اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر انتہائی درشتگی سے بولی۔

"بس آفتاب نور۔۔۔ بہت ہو گیا۔ تم نے اپنی دوستی کا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹا ہے۔ اب میرے پیچھے نہ آنا۔" یہ کہہ کر وہ دروازے سے نکل گئی اور وہ واقعی رک گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

لفظوں کی جستجو میں سب کچھ گنوا دیا

وہ چل دیا میں طرزِ ادا ڈھونڈتا رہا

"سکول میں آخری دن" اس موضوع پر مضمون تو سب نے بہت لکھے تھے لیکن اس دن کے حقیقی جذبات مختلف تھے۔ ایسے ان کہے سے احساسات جن کو لفظوں کی اوڑھنی پہنائی ہی نہیں جا سکتی۔ دس سے زائد سالوں کی سنگت چھوٹنے والی تھی۔ روز عبور کرنے والی دہلیز آج روٹھنے والی تھی۔ عجیب سی بے چینی، میٹھی میٹھی سی کسک اور بہت خوش نہ کرنے والی خوشی سب کے چہروں اور رویوں سے جھلک رہی تھی۔ رنگین کپڑوں میں معصوم بچیاں ننھی پریاں لگ رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر کچھ کر لینے کا عزم نمایاں تھا۔ لڑکوں کی بھاری ہوتی آوازیں سماعتوں کو بوجھ نہیں لگ رہی تھیں۔ اساتذہ کے لیے یہ نسل ان کے ہاتھ سے لگائی فصل تھی جو پک کر آج

سامنے تیار کھڑی تھی۔ سب کے بازوؤں پر سکول یونیفارم پڑا ہوا تھا۔ ایک دوسرے سے آٹو گراف لینے کے چکر میں یہاں وہاں گھما گھمی سی طاری تھی۔

"پاکیزہ مجھے آٹو گراف دو" آفتاب نے اپنی سفید شرٹ اس کے سامنے پھیلائی۔

پاکیزہ نے کینہ توز نظروں سے اسے گھورا۔

اس دن کے بعد نہ پاکیزہ نے منہ پھیرا تھا نہ منہ پھیرنے کی نوبت آئی تھی۔ کیونکہ آفتاب ڈر کے مارے پیچھے آیا ہی نہیں تھا۔ لیکن آج پھر وہ اس کے سامنے اپنی قسمت کو آزمانے کھڑا تھا۔

"نہیں دینا۔" پاکیزہ نے انکار کر کے منہ موڑ لیا۔

"سوچ لو۔" آفتاب پہلی دفعہ اسے اس کے انداز میں چیلنج کر رہا تھا۔

"سوچ لیا۔" چیلنج غلط لڑکی کو کیا گیا تھا۔

کوریڈور میں کھڑے ہوئے ان دونوں کے قریب کوئی نہیں تھا۔ پاکیزہ نے اس کے ساتھ سے نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ راستے میں آ گیا۔

"یہیں رکو۔" آفتاب کی سرخ ہوتی آنکھوں کا ضبط اپنی آخری حد کو چھو رہا تھا۔

پاکیزہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی جرات کو دیکھا۔ بس پلک جھپکنے کی دیر تھی۔ آفتاب نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک دوائی کی شیشی نکالی اور ساری گولیاں فی الفور نگل لیں۔ پاکیزہ ششدر کھڑی رہ گئی۔ اگلے کچھ پل میں جیسے پاکیزہ بے ہوشی سے جاگی ہو۔ آفتاب اس کے راستے سے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ضبط تھا اور چہرے پہ عجیب سی طمانیت۔ پاکیزہ کا دماغ جیسے کسی نے الٹی پھرکی پہ رکھ کر گھما دیا ہو۔

اس نے سر پھرے کو بازو سے تھاما اور واش روم کی طرف گھسیٹنے لگی۔ "چلو میرے ساتھ۔"

وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا گیا۔

"سنک کے پاس کھڑے ہو کر اس نے آفتاب کو جھکا دیا" الٹی کرو۔

وہ ہنس پڑا۔

پاکیزہ چڑ سی گئی۔ "میں نے کہا ہے کہ الٹی کرو۔ دانت نکالنے کو نہیں کہا۔"

"ایسے بھلا کیسے vomit آتی ہے۔" وہ سچ ہی کہہ رہا تھا۔

"پھر کیسے آتی ہے۔" پاکیزہ نے اس سے جواباً سوال پوچھا۔ اس کا دل کپکپا رہا تھا۔ جانے آج کون سا تماشہ بننے والا تھا۔

" vomit آ جائے گی۔۔۔ پہلے تم مجھے آٹو گراف دو" اس نے پھر اپنی شرٹ آگے کر دی۔ اس کے لہجے میں یقین بولا۔

یقین تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس یقین نے پاکیزہ کو تذبذب میں ڈال دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"اگر تم نے آٹو گراف نہیں دینا تو چلو ہال میں چلتے ہیں۔ یہاں وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟" آفتاب اسے بلیک میل کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت واضح تھی۔ کٹھ پتلی کی ڈوری آفتاب کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔

"اگر میں آٹو گراف دوں گی تو تم یہیں میرے سامنے vomit کرو گے۔ وعدہ کرو!" پاکیزہ بلیک میل ہو رہی تھی، پہلی دفعہ وہ اس سے پیمان لے رہی تھی۔

"ہاں کروں گا۔" آفتاب نے حامی بھری۔

پاکیزہ نے اس کی بازو پر رکھی اس کی شرٹ پہ اپنے دستخط کیئے اور اوپر لکھا۔

"catch the time or time will catch you"

آفتاب کے سرخ چہرے پر خوشی سرخی بن کر جھلکنے لگی۔

خوشی خوبصورت انسان کو مزید خوبصورت بنا دیتی ہے۔ پاکیزہ پر نہ چاہتے ہوئے بھی یہ انکشاف ہوا۔

vomit کرو اب۔ اس نے واپس اپنا مطالبہ آفتاب کے سامنے رکھا۔

آفتاب نے پانی کے کولر سے ایک گلاس پانی کا بھرا اور جیب سے ایک پڑیا نکال کر پانی میں ڈال کر گھول لی۔ پاکیزہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟"

"نمک ہے۔ نمک والا پانی پینے سے قے ہو جاتی ہے۔" آفتاب نے اس کے حیرت سے والبوں سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"پاکیزہ yeakh کہتی ہوئی دور کھڑی ہو گئی۔ آفتاب واقعی تھوڑی دیر میں قے کر رہا تھا۔ غیر متوقع طور پر وہ وہیں کھڑی رہی۔ بعد میں اس کے ساتھ ہی ہال میں چلی گئی۔"

اس دن پاکیزہ کے ساتھ بہت کچھ ہوا تھا۔ اساتذہ کی طرف سے اسے بہت سا پیار ملا تھا۔ پرنسپل نے اپنی بہت ساری امیدوں کو اس سے وابستہ کیا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کو ایک مقصد کی طرح واضح کر دیا گیا اور اس نے خود سے وعدہ کر لیا کہ اتنی بڑی دنیا میں اپنی چھوٹی سی پہچان ضرور بنائے گی۔ کچھ تو ایسا لازمی کرے گی کہ اس کا نام کہیں لیا جائے تو سو میں سے بیس لوگ اسے پہلے سے جانتے ہوں۔ سکول کی چار دیواری کو چھوڑنا اس کے لیے تھوڑا نہیں بہت مشکل تھا۔

اس نے گردن موڑ کر لڑکوں میں بیٹھے اس وجیہ لڑکے کو دیکھا۔ میٹھی میٹھی سی کسک میں ایک بے نام سی خلش شامل ہو گئی تھی۔ ایسی خلش جس نے شاید اب کبھی نہیں مٹنا تھا۔ وہ اس شخص کو شاید آخری بار دیکھ رہی تھی جس نے اس سے محبت کا اظہار کیا تھا، وعدوں

کی ڈور تھمانے کی کوشش کی تھی۔ بے شک وہ ڈھلی کبھی نہیں تھی لیکن آنچ پر تو رہی تھی۔ آج اسے احساس ہو رہا تھا جو جل نہیں سکتے وہ پگھل جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تیرے در پہ ہی میرا سر جھکے مجھے اور کچھ نہیں چاہئے

مجھے سب سے جو کر دے بے نیاز مجھے اس انا کی تلاش ہے

"میں چاہتی ہوں میرے سامنے ایک بڑا سا آسمان ہو اور اس پہ میرے نام کا چاند چمکے، صرف میرے نام کا چاند۔"

وہ تسکین پھوپھو کے ساتھ آج پہلی مرتبہ چھت پر واک کر رہی تھی۔ یہ شرف بھی شاید دسویں کے نتیجے کی وجہ سے ملا تھا۔ وہ اس معصوم سی لڑکی کی معصوم سی خواہش پہ مسکرادیں۔ زندگی میں رہنمائی کرنے والا ستارہ نہیں ملتا اور اس پاگل کو پورا چاند چاہئے تھا۔

"تمہیں نہیں لگتا تمہاری خواہش بہت چھوٹی ہے۔ کچھ بڑا مانگو۔" انہوں نے چھیڑا۔

پھوپھو آسمان سے مراد یہ دور تک پھیلا ہوا نیلا سفید سایہ نہیں ہے۔ آسمان سے مراد مجھے بلند معیار اور وسیع ہدف چاہیے۔ ایک ایسا میدان جس میں میرا ایکسپوژر منفرد اور مختلف لوگوں کے سامنے ہو سکے۔ میں ان کے سامنے خود کو منوا سکوں۔ سکول تک بات ٹھیک تھی۔

"میں نے ایک نارمل سے سکول میں پڑھ لیا۔ لیکن مجھے کسی بھی عام سے کالج میں داخلہ نہیں لینا۔ مجھے سب سے معیاری اور مشہور کالج چاہیے۔ جس کا تعلیمی میدان میرے جھنڈوں کو اپنے سینے پہ گاڑ سکے، جس کے پرنسپل کے دفتر میں میری ہم نصابی سرگرمیوں کی کامیابیاں شیلڈ کی صورت میں بطور سند پڑی ہو۔ میں اپنے آپ کو سنوارنا چاہتی ہوں۔ نکھارنا چاہتی ہوں۔ دنیا کو بتانا چاہتی ہوں کہ اس اتنی بڑی دنیا میں میں بھی ہوں۔" اس کی گہری ذہین آنکھوں میں دنیا کو تسخیر کرنے کی خواہش لہروں کی طرح سرمست دکھائی دی۔

تسکین اسی سرمستی کے ٹرانس میں قید ہو گئی۔

"اللہ تمہیں کامیاب کرے۔ تمہاری ساری خواہشیں پوری ہو جائیں۔ آمین۔ ویسے ایک بات بتاؤ نکھر کر سنور کر کیا کرو گی؟" انہوں نے اس کی نمکین سی رنگت میں چمکتے ہوئے سرشاری کے ذائقے کو ہوا کے دوش پہ محسوس کر کے سوال پوچھا۔

"پتہ ہے پھوپھو۔ میری سوچ تھوڑی مختلف ہے۔ میں سوچتی ہوں اگر ایک انسان ابھی کسی ایک حال میں ہے اور دو سال بعد بھی وہ اسی حال میں رہتا ہے تو وہ انسان نہیں بلکہ بدبودار پانی ہے جو ٹھہر گیا ہے۔ ایسا پانی جسے پینا تو دور کی بات اس کو سونگھا بھی نہیں جا سکتا۔ میں کھڑی نہیں ہونا چاہتی۔ میں رکنا بھی نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ آج اگر میں اس حال میں ہوں تو دو سال بعد اس سے بہتر حالت میں ہوں۔ مجھے اس مقولے سے مکمل اتفاق ہے کہ اگر کوئی غریب پیدا ہوا ہے تو یہ اس کی غلطی نہیں ہے لیکن اگر وہ

غریب ہی مرتا ہے تو یہ ضرور اس کی غلطی ہے۔ غربت کسی بھی طرح کی ہو سکتی ہے۔ خواہش کے اظہار کے لیے لفظ کا نہ ہونا بھی غربت ہے، کسی کو مشکل میں دیکھ کر بھی اس کی مدد نہ کر سکنا بھی غربت ہے۔ مشکل حالات میں شتر مرغ کی طرح ریت میں سر دبا لینا بھی سب سے بڑی غربت ہے۔ میں زندگی میں کسی بھی طرح سے غریب نہیں رہنا چاہتی۔ میرا اپنا ایک نام ہو، میری پہچان ہو۔ میرے پاس کسی بھی دوسرے کو دینے کے لئے کچھ ہو۔" وہ کہہ رہی تھی اور اس کی آواز کی کھنک کو ہوا کی ارتعاش کے چھونے سے محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"کوئی انسان کچھ بھی کر لے دنیا میں لیکن یہ مٹی سے بنا پتلا آخر مٹی میں مل جاتا ہے۔ تم نام بناؤ یا نہ بناؤ ملنا تو مٹی میں ہی ہے پھر کیا فائدہ زندگی کی طنابیں اپنی مرضی سے کھینچنے کا؟" تسکین پھوپھو کا سوال اپنی جگہ ٹھیک تھا۔

"پھوپھو ذرا آسمان کو غور سے دیکھیں۔" وہ ان کے ساتھ چلتی ان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔-- "یہ اتنا بڑا آسمان ہے وہ دیکھیں وہاں تک" اس نے مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ دیکھیں اس طرف بھی۔۔۔ کتنا بڑا ہے۔۔۔ وہ وہاں تک!" تا حد نگاہ پھیلے مغرب کی طرف پھیلے آسمان کی طرف اس نے اپنے ساتھ تسکین کی نظریں بھی دوڑائیں۔ "اس اتنے بڑے آسمان میں میرے اللہ جی کی اتنی زیادہ مخلوق رہتی ہے۔ اتنے ڈھیر سارے انسان۔۔۔۔۔ روز ہزاروں جی اٹھتے ہیں اور روز ہزاروں مر جاتے ہیں۔ جو عام انسان ہوتے ہیں نہ ان کے جینے کی خبر ہوتی ہے اور نہ ان کے مرنے کی خبر ہوتی ہے۔ لیکن وہ انسان جو اس دنیا میں اپنے ہونے کا ثبوت اپنی زندگی میں دے جاتے ہیں لوگ ان کی زندگی میں بھی ان کا تعاقب کرتے ہیں اور موت کے بعد بھی ان کے نقش پا ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ دیکھیں البرٹ آئن سٹائن کتنا ذہین تھا۔ اس نے سائنسی ایجادات میں اپنا ایک نام پیدا کیا۔ اس کی موت پر 1955ء ہی میں اس کا دماغ نکال کر محفوظ کر دیا گیا۔ لیکن عام انسان نہیں تھا تو یہ راز افشاء بھی 1978ء تک نہیں کیا گیا۔

پھر اس کے دماغ پر تحقیق کر کے یہ myth پھیلائی گئی کہ اس نے اپنے دماغ کا صرف 10 فیصد حصہ استعمال کیا تھا۔ وہ بھی تو انسان تھا اس کے پر تو نہیں لگے تھے۔ یہ اگر myth ہے تو بھی مجھے بہت fasinate کرتی ہے۔ میں نے اپنے دماغ کو اپنے آپ کو اتنا ضرور پالش کرنا ہے کہ جب میں مروں تو عام لوگوں کی طرح چار بندے دفن کر کے نہ آجائیں بلکہ مجھے یاد رکھا جائے، حوالہ دیا جائے کہ ہاں پاکیزہ نام کی بھی کوئی لڑکی تھی۔ میرا ایک سپیسی فائیڈ حوالہ ہو کہ ہاں وہی پاکیزہ۔۔ جو۔۔۔ جو سے آگے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو ہو۔" تیزی سے بولتے بولتے اس کی ہتھیلیوں پہ پسینے کے قطرے چمکنے لگ گئے۔

اس کی آواز کہیں بھی نہیں لڑکھڑائی تھی۔ اسے ہمیشہ سے الگ ڈگر پر چلنے کا شوق تھا۔ مختلف کر دکھانے کا شوق تھا۔ اور یہ شوق اس کے اندر جڑ پکڑ کر اس کی ساری شخصیت کو مسحور کن بنا رہا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ۔۔۔۔۔ تسکین کو اس کا نکلتا قد دیکھ کر بڑی شدت سے احساس ہوا۔

"اگر ہوائی قلعے بنا لیے ہو تو چلو نیچے چل کر پکوڑے بناتے ہیں۔ موسم کافی ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے پکوڑے کھانے کا۔"

تسکین پھوپھو نے اسے بڑی خاموشی سے ٹریک پر لائیں۔

ان سے بہتر کون جانتا تھا کہ جو خواہشیں ساعتوں میں محفوظ ہو جاتی ہیں اگر وہ ادھوری رہ جائیں تو دل کے اندر ناسور بن جاتی ہیں۔ جسم کے ناسور کاٹ کر علیحدہ کیے جاسکتے ہیں لیکن دل کے ناسور رستے رہتے ہیں اور ہمیشہ رہتے ہیں۔ پاکیزہ ہنستی ہوئی ان کے ساتھ نیچے آگئی۔

آسمان نے اس چھوٹی سی لڑکی کی بڑی بڑی باتوں کو ہوا کے دوش پہ کاتب تقدیر تک پہنچایا۔ کوئی تو ہے صفحہ جس پر زندگی کا ہر آنے والا لمحہ ہمارے حال پر، ہماری خواہشوں پہ مسکرا رہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

سب جا رہے تھے اپنے خداؤں کو پوجنے

تب میں تیرے خیال کی گہرائیوں میں تھا

--"پاکیزہ حنا کا فون ہے۔" پھوپھو نے موبائل اس کی طرف بڑھایا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ پاکیزہ نوٹس بنانے میں بے انتہا مگن تھی۔ حنا کا نام سنتے ہی ذہن میں جھماکا ہوا۔ سکول میں اس کی کلاس فیلو کا نام حنا تھا لیکن اس سے اتنی دوستی تو نہ تھی کہ وہ یوں اتنے دن بعد فون کرتی۔ خیر پاکیزہ نے فون پکڑ کر کان سے لگا لیا۔

"ہیلو" اسپیکر میں غیر شناسا آواز ابھری۔

"اسلام و علیکم حنا کیسی ہو؟" پاکیزہ نے چار ماہ کے آئے ہوئے فاصلے کو پاٹنے کی کوشش کی۔

"وعلیکم اسلام میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟ مجھے بھول ہی گئی۔" اب جو آواز اسپیکر سے ابھری تھی وہ باریک ضرور تھی لیکن حنا کی نہیں تھی۔

حنا کی آواز کو باریک ہونے کی وجہ سے اکثر سکول میں مذاق کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔

"کون بات کر رہا ہے؟" پاکیزہ نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا۔

میں حنا بات کر رہی ہوں۔" آگے سے اصرار کیا گیا۔

"محترمہ آپ جو بھی بات کر رہی ہیں۔ صاف صاف بتائیں۔ مجھے حنا کی آواز کا اچھے سے اندازہ ہے۔ آپ حنا کے علاوہ کوئی بھی ہو سکتی ہیں۔ آپ خود بتائیں ورنہ میں فون رکھ دوں گی۔" پاکیزہ نے خاصے اکھڑ لہجے میں دوسری طرف موجود ڈھیٹ وجود کی کلاس لی۔

نہیں نہیں فون نہ رکھنا۔ میں ہوں۔ میں بات کر رہا ہوں۔'' اب کسی لڑکے کی آواز اسپیکر سے ابھری۔ پاکیزہ نے گڑبڑا کر فون رکھ دیا۔ موبائل پھوپھو کے کمرے میں لوٹانے آئی تو آواز سماعتوں سے ذہن کے دریچوں پہ انکشاف کرنے نکل پڑی۔۔۔ یہ تو آفتاب کی آواز تھی۔۔۔۔

ابھی فون پھوپھو کے ہاتھ میں پکڑایا ہی تھا کہ فون پھر سے بجنے لگا۔

''پاکیزہ تمہاری دوست کا فون پھر سے آ رہا ہے۔'' پھوپھو نے فون واپس اس کی طرف بڑھایا۔

''نہیں پھوپھو مجھے حنا کی آواز نہیں لگ رہی۔ پتہ نہیں کس کا فون ہے۔'' حنا کی آواز نہیں لگ رہی لیکن آفتاب کی آواز لگ رہی ہے پتہ نہیں یہ اعتراف وہ اپنے منہ سے کیوں نہ کر سکی۔

''حنا ہی ہو گی۔ تم نے اتنے عرصے سے اس کی آواز نہیں سنی ناں؟ اس لئے تمہیں ایسا لگ رہا ہو گا۔ یہ لو تم بات کرو۔ میں ذرا گوشت کی دکان والے سے حساب کتاب کر آؤں۔'' پھوپھو اس کے ہاتھ میں زبردستی فون پکڑا کر باہر چلی گئی۔

اتنی دیر میں فون بج بج کر خاموش ہو چکا تھا۔ پاکیزہ نے سکھ کا سانس لیا۔

ایک منٹ گزرنے کی دیر تھی۔ فون کی روشنی پاکیزہ کی آنکھوں میں چبھی اور فون پھر تھر تھرانے لگا۔ اب فون کی گھنٹی بھی سنائی دے رہی تھی۔ پاکیزہ نے کال ریسیو کر کے فون کان سے لگا لیا۔

''ہیلو'' پاکیزہ نے بہت واضح آواز میں کہا۔

''ہیلو۔ پاکیزہ میں آفتاب بول رہا ہوں۔ شکر ہے تم نے فون اٹھایا تمہیں پتہ ہے میں نے کتنی مشکل سے تمہارا نمبر لیا ہے۔'' آفتاب کی آواز میں وہی آنچ تھی جو اسکی جذبے لٹاتی آنکھوں میں محسوس ہوا کرتی تھی۔

''کہاں سے لیا ہے میرا نمبر۔'' پاکیزہ نے اس سے آرام سے سوال کیا۔

وہ کافی حد تک ریلیکس ہو گئی تھی۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ فون سے نکل کر وہ باہر نہیں آ سکتا اور نہ ہی اسے کھینچ کر اپنی طرف نکال سکتا تھا۔

''تمہیں یاد ہے تم نے مجھے کال کی تھی ایک دفعہ۔ تمہارا نمبر میرے فون کے بل میں تھا۔ لیکن پھر ہم نے گھر تبدیل کر دیا۔ پچھلے تین ماہ سے بل ہی نہیں مل رہے تھے۔ بل مل جاتا تو تمہارا نمبر بھی مل جاتا۔ آج دن میں ہی ردی کے کاغذوں میں دیکھا تو بل نظر آ گئے۔ میں نے بڑی مشکل سے تمہارا نمبر ڈھونڈا۔'' وہ ایک سانس میں ساری داستان سنانے لگا۔

آفتاب کم از کم جھوٹ تو نہ بولو۔ فون کے بل میں وہ نمبر آتے ہیں جن کو کال کی گئی ہوتی ہے وہ نمبر نہیں آتے جن سے کال آئی ہوتی ہے۔

پاکیزہ کی آواز میں سمجھداری کی گونج تھی۔"اوہو۔ تم اب بھی مجھے جھوٹا سمجھتی ہو۔ تم نے کبھی میرا اعتبار نہیں کیا لیکن ٹھیک کہا۔ تم ہو ہی ایسی کہ تمہارے پیچھے بھاگا جائے بے شک سراب ہو، سایہ ہو لیکن تمہارا تعاقب مجھے احساس دلاتا ہے کہ میں زندہ ہوں۔" آفتاب کے لہجے میں افسوس اور محبت نے پرانے سے انداز میں دستک دی۔

نمبر کہاں سے لیا ہے میرا۔" پاکیزہ کا سوال وہیں کا وہیں تھا۔

"اتنی بے اعتباری بھی اچھی نہیں پاکیزہ۔ تم مجھے جانتی ہو۔ میں شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اور تم ایسے ٹریٹ کر رہی ہو جیسے میں پولیس کو مطلوب دہشت گرد ہوں۔ بی بی جب تم نے مجھے کال کی تھی میں نے اسی دن تمہیں رنگ بیک کی تھی اپنے پی ٹی سی ایل فون سے نمبر نکال کر تاکہ تمہیں بتا سکوں کہ میں کل سکول آؤں گا۔ اس وقت فون تمہاری پھوپھو نے اٹھایا تھا پھر میری ڈر کے مارے آواز ہی نہیں نکلی۔ میں نے فون رکھ دیا لیکن دیکھو کتنا فائدہ ہوا میرے پاس تمہارا نمبر محفوظ رہ گیا۔" وہ بچوں کی طرح پر جوش ہونے لگا۔

فون کیوں کیا ہے؟" پاکیزہ کا اگلا سوال تیار ملا۔

"کیا ہو گیا ہے یار پاگل تو نہیں ہو تم؟" آفتاب اچانک بول پڑا لیکن ساتھ ہی اس نے اپنی زبان دانتوں میں دے دی۔ اس کے منہ سے غلط لفظ نکل چکا تھا۔ اب وہ جانتا تھا کہ پاکیزہ نے کیا کہنا ہے۔

یہ کئی دفعہ سکول میں بھی ہو چکا تھا۔ اب بھی وہی ہونا تھا۔ پاکیزہ نے وہی کیا۔

"خبردار جو مجھے دوبارہ یار کہا۔ تم خود ہو گے اپنے یار۔ کم از کم یہ لفظ تو استعمال نہ کرو۔ میں پاگل ہوں جو اتنی دیر سے تمہاری باتیں سن رہی ہوں۔ دوبارہ فون نہ کرنا۔ اللہ حافظ۔" وہ فون رکھ چکی تھی۔ اس لفظ یار سے اسے شروع سے چڑ تھی۔ خاص طور پر جب وہ یہ لفظ آج کی نسل کو بلادریغ استعمال کرتے دیکھتی تو اپنے غصے کو قابو نہ کر پاتی۔

فون اس کے ہاتھ میں ہی تھا کہ میسج کی گھنٹی بجی۔ پیغام آفتاب کی طرف سے تھا۔

میں کل شام آٹھ بجے فون کروں گا۔ موبائل اپنے پاس رکھنا۔

پاکیزہ نے ایک گہری سانس لی۔ پیغام مٹایا اور اپنے کمرے میں آگئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تو اگر بے نقاب ہو جائے

جستجو کامیاب ہو جائے

شام کسی سہمی ہوئی چڑیا کی طرح پھڑ پھڑاتی ہوئی رات کے گھونسلے کی پر سکون آغوش میں داخل ہونے لگی۔ سرمئی آسمان اپنے گہرے رنگ پر خود ہی ماتم کدہ ہوا تو ستارے اس کو دلاسہ دینے ٹمٹمانے لگے۔ پاکیزہ نے سرسری سی نظر کمرے کی کھڑکی سے باہر ڈالی۔ بے ارادہ نظریں گھڑی پہ جا پڑی۔ آٹھ ہونے میں بیس منٹ باقی تھے۔

وہ اپنے کمرے سے اٹھی اور پھوپھو کے کمرے میں آگئی۔ وہ کوئی دفتری کاغذات کھولے بیٹھی تھیں۔ پاکیزہ انگلیاں مروڑتی پاس آئی۔ تسکین نے نظریں اٹھا کر اس کی بے چینی کو جانچا۔

کچھ چاہیئے پاکیزہ؟''انہیں پوچھنا پڑا۔

"نہیں۔''پاکیزہ نے جواب نفی میں دیا لیکن اپنے چہرے کی بے چینی نہ چھپا سکی۔

"پیسے چاہیے تو بتاؤ۔۔ میرے پاس ہیں میں دے دیتی ہوں۔''پاکیزہ کو ہمیشہ پیسے مانگنے میں یوں ہی جھجک ہوتی تھی۔ تسکین نے اس کی ہچکچاہٹ دور کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں پھپو پیسے نہیں چاہیے۔''پاکیزہ تسکین کو کہہ کر بیڈ کے کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔

تسکین کو اپنے اندازے کے غلط ہونے کا احساس ہوا تو سر جھٹک کر اپنے کاغذات میں منہمک ہو گئیں۔

کوئی تین منٹ گزرے ہوں گے جب پاکیزہ دوبارہ گویا ہوئی۔

پھپو اگر آپ موبائل استعمال نہیں کر رہی تو میں لے جاؤں؟ وہ حنا کہہ رہی تھی اس نے فون کرنا ہے۔

"ہاں لے جاؤ''تسکین نے بیڈ کے ساتھ پڑے میز سے فون اُٹھا پاکیزہ کو دیا۔ وہ ابھی تک دفتری کاغذات میں الجھی نظر آرہی تھیں۔ پاکیزہ فون لے کر کمرے سے باہر جانے لگی۔ تسکین نے اسکی پشت کو پر سوچ نظروں سے دیکھا۔

کمرے میں آتے ہی موبائل مرتعش ہوا۔ پہلی گھنٹی پہ ہی کال اٹھالی گئی۔

"ہیلو۔''پاکیزہ نے بہت آہستگی سے سلام کیا کہ کہیں ردِ عمل میں اونچی آواز موبائل سے باہر نہ گونج پڑے۔

"اسلام علیکم! کیسی ہو؟''مشتاق آواز سنائی دی۔

"وعلیکم سلام۔۔ کیا مسئلہ ہے؟ کیوں فون کیا ہے؟''آہستہ آواز میں ناراضگی چھن کر نکلی۔

"شکر ہے فون تمہارے پاس ہے ورنہ آج بھی مجھے گلے کے آخری کونے سے آواز نکالنی پڑتی۔''دوسری طرف اس ناراضگی کا کوئی اثر نہ ہوا۔

"مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟''اب تنک کر پوچھا گیا۔

"مسئلہ میرے ساتھ نہیں مگر تمہارے ساتھ ضرور ہے۔ تم ایسے کیوں ڈیل کر رہی ہو۔ اجنبی تو نہیں ہوں میں۔ مجھے جانتی تو ہو تم۔''وہ شکوہ کناں ہوا۔

"تو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ میں تم سے باتیں کرنے لگ جاؤں۔ جانتی تو میں موچی، درزی اور دودھ والے کو بھی ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان سب سے بھی بات کروں۔" پاکیزہ نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

"میں سب کی نہیں صرف اپنی بات کر رہا ہوں۔" فوری طور پہ بات کو رد کیا گیا۔

"آفتاب میرے لیے تم میں اور باقی سب میں کوئی فرق نہیں۔ تم یہ کب سمجھو گے؟" آفتاب کی حساس آواز نے ایک بار پھر پاکیزہ کی ہمدردی سمیٹی۔

"اور پاکیزہ میرے لیے اس دنیا میں تم سے زیادہ کچھ بھی اہم نہیں۔ یہ بات تمہیں کب سمجھ آئے گی؟" اس کی آواز نے بے چارگی کی بیساکھیاں تھام لی۔

"فضول باتیں مت کرو۔" اسے ٹوکا گیا۔

"یہ فضول باتیں نہیں ہیں۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں۔ تم تھوڑی دیر مجھ سے بات کر لیا کرو۔" اصرار اپنی جگہ مصر رہا۔

"میں تم سے بات نہیں کر سکتی آفتاب۔۔۔ انفیکٹ میں تم سے بات کرنا ہی نہیں چاہتی۔" اس نے اپنے ارادوں کو واضح کیا۔

"اچھا بات نہ کرو صرف فون اُٹھا لیا کرو۔" آفتاب نے عجیب سی فرمائش کی۔

"بات نہیں کروں گی تو فون کس لیے اُٹھاؤں؟" آفتاب کے پاگل پن پہ وہ اتنے دن بعد پھر متحیر ہوئی۔

"تم کچھ نہ کرنا۔ میں تمہاری موجودگی محسوس کر لوں گا۔" بہت جذب سے کہا گیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" بے رخی سے تبصرہ کیا گیا۔

"ہاں میں پورا ہی خراب ہوں۔۔ تم بس فون اٹھا لینا اور ریسیو کر کے فون اپنے پاس رکھ دینا۔" اس نے بے ساختہ التجا کی۔

"میں نہیں اُٹھاؤں گی فون۔" دوٹوک لفظوں میں انکار کیا گیا۔

"میں کل پھر آٹھ بجے فون کروں گا۔" اس نے جیسے انکار کو ان سنا کر کے بتایا۔

"تم غلطی کرو گے۔" اس نے تنبیہہ کی۔

"میں ساری عمر یہ غلطیاں کرنے کو تیار ہوں۔۔ جو مجھے تم سے رابطے میں رکھیں۔" وہ مدہوشی سے اگلے مقام پہ کھڑا نظر آیا۔

"میں واقعی فون نہیں اُٹھاؤں گی۔۔ میں پھپھو کو بتا دوں گی۔" اس نے اب دھمکی دی۔

"یہ تو مجھے بھی پتہ ہے تم نہیں بتاؤ گی۔" وہ ہولا سا ہنسا۔

"تم مجھے چیلنج کر رہے ہو؟" انا کے بت پہ وار ہوا۔"

"نہیں نہیں۔۔ اوہو پاکیزہ تیس سیکنڈ رہتے ہیں کال اینڈ ہونے میں۔۔ اپنا بہت سا خیال رکھنا۔۔ کھانا وقت پر کھانا اور جلدی سو جانا اللہ حافظ۔۔" اس نے بے تابی سے ہدایات دیں۔

اس سے پہلے پاکیزہ جواباً اللہ حافظ کہتی فون بند ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

شاید یہ اندھیرے ہی مجھے راہ دکھائیں

اب چاند ستاروں سے میرا ذکر نہ کرنا

آج تسکین آفس سے جلدی واپس آگئی تھی۔ موڈ بھی نارمل کی نسبت بہتر تھا۔۔پاکیزہ نے پھپو کی بے شکن پیشانی کو دیکھا اور کچن میں ان کے لیے چائے بنانے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے لے کر ان کے کمرے میں آئی۔

شکریہ شکریہ یہ چائے نہ ہو تو دن آدھے راستے میں اٹک سا جاتا ہے، گزرتا ہی نہیں۔"تسکین نے والہانہ انداز میں چائے کا کپ تھاما۔

پتہ نہیں کیسے پی لیتی ہیں آپ اتنی چائے۔" پاکیزہ نے پھپو کو دیکھتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔

"جو نشہ کرتا ہے وہی جانتا ہے ہوش والو کو کیا خبر۔۔۔" چائے کے کپ کو اپنے سر سے اونچا کرتے انہوں نے مسکرا کر کہا۔

آج موڈ بہتر نہیں بہترین ہے۔پاکیزہ کو اندازہ ہوا۔

"پھپو مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"اس نے آخر ہمت کر ہی لی۔

"ہاں جی کہو کیا بتانا ہے؟" وہ چائے کی چسکیاں لیتی اسی اطمینان سے بولیں جو نجانے کیسے ان کی بے شکن پیشانی پر سر نیہوڑائے بیٹھا تھا۔

" مجھے حنا کا فون نہیں آتا، آفتاب فون کرتا ہے اور وہ دو دن سے کر رہا ہے۔" بتاتے ہوئے پاکیزہ کے چہرے پر ناگواری در آئی۔

"آفتاب نور۔۔تمہارا کلاس فیلو۔۔" انہوں نے پوچھتے ہوئے تائید چاہی۔پاکیزہ کے سب ہی کلاس فیلوز کو وہ نام کی حد تک جانتی تھی۔ آفتاب کے بارے میں بھی اتنا معلوم تھا کہ وہ پاکیزہ کا بہت پیچھا کرتا ہے اور پاکیزہ اتنا ہی چڑتی ہے۔

"جی وہی۔۔" پاکیزہ نے جیسے اعتراف گناہ کیا۔

"اس میں بتانے والی کون سی بات ہے؟" ان کے اطمینان میں رتی برابر بھی فرق نہ آیا۔

"پاکیزہ کو اس جواب سے حیرت ہوئی۔وہ آنکھیں کھول کر پھپو کو دیکھنے لگی۔

"پڑھائی میں کیسا ہے؟" انہوں نے یوں پوچھا جیسے اس کا رشتہ آیا ہو۔

"ٹھیک ہے۔بہت اچھے نمبرز نہیں لیتا مگر پاس ہو جاتا ہے۔" اس نے صفا چٹ جواب دیا جس میں اس کی بے زاری نمایاں تھی۔

"خاندانی پسِ منظر کیا ہے اس کا" ٹاک شو میں بیٹھے تجزیہ نگار کی طرح پر سوچ انداز میں اگلا سوال داغا گیا۔

"امیر کبیر گھرانے سے لگتا ہے۔ تین بھائی اور ایک بہن ہے۔سب سے چھوٹا ہے۔ تھوڑا بگڑا سا لگتا ہے۔" پاکیزہ نے اپنی زیرک رائے دی۔

"تم سے کیا چاہتا ہے؟" تیر کی طرح ایک اور سوال ہوا۔

"سچ بتاؤں تو بکواس کرتا ہے شادی کرنی ہے جبکہ یہ عمر ایسا سوچنے کی بھی نہیں ہے جیسی باتیں وہ کرتا ہے۔" جواب سچا دیا گیا۔

"میری مانو تو اس سے رابطے میں رہو" تسکین نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے ایسا مشورہ دیا جس کی امید پاکیزہ کو نہیں تھی۔

"کیا؟" پاکیزہ اپنی حیرانی چھپا نہ سکی۔

"ہاں! فضول کوئی بات نہ کرو مگر کوئی درز نہ ہونے سے بہتر کسی روزن کا کھلا ہونا ہے۔ ہزاروں لوگوں سے رابطہ تو انسان رکھتا ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کل کو یہی رابطہ تمہارے حق میں بہتر ثابت ہو جائے۔ ویسے بھی آنے والی زندگی میں تمہیں بہت سے لوگ ملنے ہیں۔ تم ان پہ یقین کرو گی اور وہ جانے تمہارا بھرم قائم بھی رکھ سکیں گے یا نہیں۔ جبکہ بچپن کے دوست کبھی دھوکہ نہیں دیتے۔ سکول کے ساتھی کبھی ہاتھ نہیں چھوڑتے۔ کیا پتہ واقعی سچا ہو۔۔ کل کو جب تم تنہا رہ جاؤ تو تنہائی تمہیں نچوڑ کر تمھارا سارا خون چوس لے گی۔ پھر بھر بھری ہڈیوں کو چٹخاتی اپنا سر اپنے ہی آپ سے مارتی پھرو گی۔ آج کی دنیا بہت رنگین ہے۔ سات پردوں میں بیٹھا نہیں جاتا۔ تھوڑی سی ہوا زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے۔ میں نہیں چاہتی تم دوسری تسکین بنو۔ فون سے نکل کر وہ تمھارے پاس آ سکتا ھے نہ تم اس کے پاس جا سکتی ہو۔ اپنی حدود کو قائم رکھ کر رابطے میں رہو، سلام دعا سے کچھ نہیں جاتا۔" وہ پاکیزہ کو اس زاویے سے دیکھنے پہ مجبور کر بیٹھی جس زاویے سے انہوں نے دنیا کو دیکھا تھا۔

دل میں اٹھے ہزار سوالوں کو دل میں لئے وہ ہی واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ شاید دل کو جو بہانہ چاہئے تھا وہ مل گیا تھا۔ اب اور کوئی حرف تسلی کو نہیں چاہئے تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ حادثہ ہوا کہ ذہانت عطا ہوئی

یہ سانحہ الگ کہ محبت نہیں ملی

آج تو آپ کو احساس نہیں ہے۔ کل آپ کو احساس ہو گا۔ کل آپ کو سمجھ آئے گا کہ آپ کے ساتھ ہوا کیا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ" آپ کو یہ سمجھ میں آئے گا کہ آپ کے ساتھ جو ہوا وہ تو کچھ بھی نہیں اس سے کہیں زیادہ آپ نے خود اپنے ساتھ برا کیا ہے۔ اس وقت آپ کو اپنا یہ آج، یہ وقت، یہ لمحہ اور یہ آنسو زہر لگیں گے۔ آپ کو سمجھ آ جائے گا کہ آپ نے بنجر زمین پر اپنے موتی رول دیئے ہیں۔۔۔ زمین بھی ایسی بنجر کہ نہ موتیوں کو نگلے گی نہ ان کو اگلے گی۔ آپ کا دل چاہے گا کہ آپ واپس اپنے ماضی میں جائیں اور ان روتے لمحوں کو اپنی زندگی سے نوچ پھینکیں۔ تب آپ واپس پیچھے نہیں آ سکیں گے، ان لمحوں کو نوچ نہیں سکیں گے پھر آپ کو اپنی اس بے بسی پہ رونا آئے گا۔ یوں زندگی کے آٹھ دنوں میں سے پہلے دو دن غلطی کرنے میں، دوسرے دو دن اس غلطی پہ رونے میں اور اگلے دو دن اس رونے پہ روتے ہوئے گزر جائیں گے۔ آپ ابھی کہہ رہی ہیں کہ وہ مجھے مل جاتا تو خدا کی خدائی میں

بھلا کیا فرق آجاتا۔ کل جب آپ کی آنکھوں سے اس نام نہاد رسوا کر دینے والی محبت کی پٹی اترے گی تو آپ خود کہیں گی۔ وہ میری دعا کے دکی دھڑکنوں کو نہ سمجھ سکا۔ میری دعا کے عین سے میرے لئے ایک دھیلے کی عزت نہ تلاش کر سکا۔ اسے میری دعا کے الف سے اعتبار کی کوئی ایک ہری شاخ نہ مل سکی، اور میں اس پر اپنی دعائیں ضائع کرتی رھی۔ میں اس پر اپنی مناجات لٹاتی رہی۔ ''میں اس پر تہجد کی آہ وفغاں وارتی رہی۔ میں پاگل تھی۔ میں واقعی پاگل تھی۔

اس نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ پندرہ سے اٹھارہ سال کی نوعمر لڑکیاں اپنے خوبصورت چہروں پر پریشانی سجائے اس کو دیکھ رہی تھیں۔ کتنی تھیں جن کے چہرے پر اس ڈر کی دبیز تہہ بیٹھی تھی جیسے ان کا کوئی راز افشاں ہو گیا ہو۔ یہ بولنے والی ان ہی کی کہانی دہرا رہی تھی۔ ان سب کی وہی ایک کہانی جس میں کرداروں کے نام مختلف تھے لیکن فطرت ازل سے مقرر تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کو آئینہ دکھانے والی روسٹر روم کے پیچھے اپنے بائیں ہاتھ کو مٹھی کی شکل دے کر اپنی ذاتی بے چینی اور بے بسی پر قابو پا رہی ہے۔ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

یہ کیا کہ محبت اور وفا کے نام پر آزمائشیں آپ سے لی جائیں۔ آپ کے اندر اپنی محبت زندہ کر کے ان سب رشتوں کی محبت آپ کے دل سے نکال دی جائے جو آپ سے سچ میں محبت کرتے ہیں۔ جب آپ اندھوں کی طرح اس نئی محبت کی تقلید کرنے لگیں تو یہ انہی محبتوں کے مجسموں کے سامنے آپ کو باغی بنا کر کھڑا کر دیں جن سے آپ نے محبت کے معنی سیکھے تھے۔ بھلا یہ کہاں کی محبت ہے؟ یہ کیسی محبت ہے؟ محبت تو قربانی سیکھاتی ہے۔ سر جھکانا بتاتی ہے۔ یہ کیسی محبت ہے جو پہلے آپ کو بے مول کرتی ہے پھر آپ سے ثبوت مانگتی ہے؟ آپ سے کہتی ہے کہ واقعی میری ہو تو یہ کر کے دکھاؤ۔ اور آپ اندھوں کی طرح بستر سے اٹھ کر جادوئی انگلیوں پر ناچنے تھرکنے لگ جاتی ہیں۔ یہ محبت تو نہ ہوئی، یہ تو فریب ہوا، یہ تو دھوکا ہوا۔ محبت کو کبھی بھی ثبوت کی ضرورت نہیں پڑتی، محبت آپ ثابت ہے۔" اس نے اپنے تھوک کو نگلا۔۔ لفظ محبت، محبت کہتے اس کے حلق سے لے کر دل تک کتنے آبلے پڑتے تھے اور کیسا ناسور درد چھڑ جاتا تھا۔۔ یہ صرف وہی جانتی تھی یہاں اسے ہمت نہیں ہارنی تھی۔ وہ ہمت ہارنے کے لیے کھڑی نہیں ہوئی تھی۔

"یہ زندگی آپ کو کسی انسان نے نہیں دی جس کے لئے آپ اس زندگی کو ضائع کر دیں۔ یہ زندگی اللہ نے دی ہے۔ اللہ سے ڈر نہیں لگتا آپ کو؟ اس کی دی ہوئی زندگی کسی انسان کے لئے کیسے ضائع کر سکتے ہیں آپ؟ اللہ نے اپنی عبادات اپنی محبت کے لیے ہمیں تخلیق کیا ہے لیکن ہم اپنے جیسے کاٹھ کے الوؤں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ دنیا سامنے رہ جاتی ہے اور دین کہیں پیچھے چلا جاتا ہے۔ ہماری سیڑھیاں ہی عجیب ہیں، ابھی چڑھنا شروع نہیں کرتے کہ سیڑھیاں خود اتارنا شروع کر دیتی ہیں۔ پاگل لڑکی جسے تم محبت سمجھتی ہو وہ سانپ سیڑھی کا کھیل ہے۔ جیسے ہی جیتنے کا یقین ہونا ہمارے سر سے آسمان چھین لیا جاتا ہے۔ ہم سر اٹھا کر اوپر دیکھتے ہیں اور پیروں کے نیچے سے زمین بھی نکال لی جاتی ہے۔ ہم پھر کہاں رہ جاتے ہیں؟ وہیں۔۔۔ فضا میں معلق! لیکن فضاء میں معلق رہ کر اگر میں کہوں کہ اب میں مر جاؤں۔۔۔ تو یہ غلطی نہیں بہت بڑی غلطی ہے۔

میں محبت اور وفا کے نام پر قربانیاں دینے والی، اپنے آپ کو بدلنے والی۔۔ اتنی ارازں اتنی عام ہوں کہ بس اب مر جاؤں؟ میں کیوں مروں؟ اس مرنے کی خواہش سے نکل کر دیکھیں۔ وہ جو آپ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکالتے ہیں ان کے گریبان پکڑیں۔ دنیا کے سامنے اپنے سر کا آسمان چھیننے والے کو للکار کر کہیں کہ محبت کے مجرم تم ہو تو تم مرو۔۔ میں کیوں مروں؟؟؟ بھلا میں ہی کیوں مروں۔ وہ کیوں نہ مرے جس نے میرے لئے محبت کی میم کو ماتم، ح کو حزن، ب کو بے بسی اور ت کو تہمت بنا دیا۔ یہ ماتم ہے کہ ہر وقت جاری رہتا ہے۔ یہ حزن ہے جو مجھے توڑ تا رہتا ہے۔ یہ بے بسی ہے جو مجھے جینے نہیں دیتی اور مرنے بھی نہیں دیتی۔ یہ تہمت ہے جو کالک کی طرح میرے ماتھے پر ایک بے وفا سے وفا نبھانے کے جرم میں تھوپ دی گئی ہے۔ میں کیوں مروں؟؟؟ وہ بے وفا ہے تو وہ مرے۔ محبت کی تعریف بدلنے والا وہ ہے تو سولی پر بھی اسی کو چڑھنا ہو گا۔ میں جو بھی ہوں اتنی ارازاں نہیں کہ ایک انسان کے لئے رول دی جاؤں۔ وہ انسان جو کہ میرا محرم بھی نہیں ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ کو اسی سختی سے بھینچا تھا۔ اس کی آواز میں بالکل بھی لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔

آنکھوں میں کچھ پل کو نمی چمکتی مگر ساتھ ہی غصہ اس نمی کو پی لیتا۔ اس نے کمزور نہیں بننا تھا۔ اپنی نمی کو اپنی طاقت بنانا تھا۔ وہ یہی کر رہی تھی اسی لیے آج یہاں کھڑی تھی۔ اتنی زیادہ لڑکیوں کے لئے وہ آئیڈیل تھی، حالانکہ صرف وہی جانتی تھی کہ وہ ایک عام سی لڑکی ہے۔ اتنی عام کی ایک انسان کے لئے رل گئی۔ وہ انسان جو اس کا محرم بھی نہیں تھا۔ اس کی دنیا سامنے رہ گئی اور دین کہیں پیچھے۔۔ وہ لڑکی ہے نا۔۔ اسی لئے جانتی ہے کہ ہر عام سے لڑکی میں بہت خاص لڑکی چھپی ہوتی ہے اور ہر خاص لڑکی میں کوئی نہ کوئی عام سی لڑکی دبکی بیٹھی ہوتی ہے۔ آگے کھڑی دنیا کے سامنے اس نے سر اٹھا کر جینا تھا۔ اس لیے عام سی لڑکی کو اپنے اندر کہیں دبکا ہی رہنے دیا اور دنیا نے ہمیشہ اسے ایسے دیکھا جیسے کسی خاص لڑکی کو دیکھتے ہیں۔

اپنی بات مکمل کر کے جب وہ اسٹیج سے اتری تو ان بکھری ہوئی لڑکیوں نے اس نکھری ہوئی لڑکی کے لئے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں۔

جس کو جتنی شدید ٹھوکر لگتی ہے وہ اتنا ہی زیادہ نکھرتا ہے!

ہال کے دروازے پر پہنچتے ہی اس کی آنکھ سے نمکین قطرہ نکلا جسے اس نے سب کی نظروں سے بچا کر فوراً شہادت کی انگلی سے فضا میں اچھال دیا۔ الٹے ہاتھوں سے بالوں میں ٹکے چشمے کو آنکھوں پہ لگایا۔ حسین مسکراہٹ کے ساتھ وہ دنیا کو ایسی ہی نظر آ رہی تھی جیسا وہ دکھانا چاہتی تھی۔ ایک بہت خوش قسمت۔۔۔ ایک بہت خاص لڑکی۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆

صاعقے اک تو میرے اس گھر کو جلانے آ گئے

لوگ بچا کھچا یہ سامان اٹھانے آ گئے

شب و روز یونہی گزرنے لگے تھے اور جونہی گھڑی کی سوئیاں آٹھ بجاتی فون بجنے لگتا پاکیزہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پاگل پن میں مسکرا اٹھتی فون ریسیو کرتی سلام دعا کا تبادلہ ہوتا اس کے بعد خاموشی گہری خاموشی۔۔۔

وہ خاموشی جو خاموش رہتے ہوئے بھی وہ سب کہہ دیتی ہے۔ آفتاب لاکھ چاہتا کہ باتوں کو لٹکائے، بات سے بات نکالے لیکن جو فن قدرت نے دیا ہی نہ ہو اس پہ عبور حاصل کیا بھی نہیں جا سکتا۔ مختصر سی باتوں سے ہی اسکی لگن اور جستجو کی آنچ اپنے پورے جوبن پر محسوس ہوتی۔ پاکیزہ لب کاٹتے ہوئے موبائل اپنے قریب رکھ دیتی اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔ آفتاب وہی کرتا رہتا جسکا اس نے کہا تھا۔ پاکیزہ کی موجودگی کو محسوس کرتے وقت بیت جاتا۔ ان دونوں کے درمیان تعلق خاموشی سے خاموشی تک کا تھا لیکن جتنی پرواہ آفتاب ظاہر کرتا اتنی پاکیزہ کے لیئے کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ اس پرواہ اور فکر نے پاکیزہ کو خود سے محبت کرنا سکھا دیا۔ آفتاب کئی بار اصرار کرتا کہ بات کرو کوئی بات کرو لیکن پاکیزہ کی ازلی احتیاط پسندی آڑے آجاتی۔ سلام دعا سے آگے وہ بات ہی نہ کرتی۔ آفتاب کچھ پوچھ لیتا تو جواب دے دیتی لیکن جواب بھی ایسا ہوتا کے بات وہی ختم ہو جاتی۔ یہ وہ دور تھا کے موبائل پیکجز ابھی ریوڑیوں کی طرح بٹنا شروع نہیں ہوئے تھے پھر بھی روزانہ ایک گھنٹے کی کال۔۔۔ پاکیزہ کو حیرت ہوتی کہ آفتاب روزانہ اتنے پیسے کیسے ضائع کر لیتا ہے۔ سو روپے کا کارڈ لوڈ کروا کے ۶۰ منٹ کی کال کرتا جس میں کسی خوش قسمت دن دس منٹ پاکیزہ اس سے بات کرتی پھر خاموشی راج کرتی۔ دو مہینے خاموشی اپنا کھیل کھیلتی رہی۔ دو مہینے میں ایک بھی دن ایسا نہیں آیا کہ آٹھ بج کر پانچ منٹ پر یا سات بج کر پچپن منٹ پر کال ہوتی۔ پورے آٹھ بجے ہی فون بجا کرتا۔ جب کوئی چیز آپ کو مسلسل ملنے لگے تو آپکو اس چیز کی عادت ہو جاتی ہے اور عادت ضرورت سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

رات کا پنچھی اپنے پر پھیلا کر روشنی کو اپنے پنجوں میں دبوچ چکا تھا۔ پاکیزہ موبائل اپنے پاس رکھے کیمسٹری کی کتاب پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ سر اٹھا کر دیوار پر لگے گھڑیال کو دیکھا تو سر نیچے جھکا لیا۔ ابھی آٹھ بجنے میں پانچ منٹ رہتے تھے۔ کچھ دیر بعد دوبارہ گھڑیال کی طرف نظر کی تو معلوم ہوا آٹھ بجنے میں دو منٹ رہتے ہیں۔ جب انتظار کیا جائے تو وقت طویل ہو جاتا ہے۔ ایک ایک لمحہ رینگنے لگ جاتا ہے۔ وقت کے پروں کی سرسراہٹ پاکیزہ کو اپنے وجود پہ محسوس ہوئی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا وہ آفتاب کا یوں انتظار کرے گی۔

کیمسٹری کا ایک بھی لفظ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ تنگ آ کر اس نے اپنی کتاب بند کی اور اسکیچ بک نکال لی۔ وقت گزارنے کے لیئے اسکیچ بک اس کی بہترین دوست تھی۔ اس کے ہلکے سانولے ہاتھ کی مخروطی انگلیاں پینسل تھام کر جب تصویر بناتی تو تصویر بولتی نظر آتی۔ یہ اس کا ایسا ہنر تھا جس کو ذرا سا نکھار ملتا تو پاکیزہ کی شخصیت کو چار چاند لگ جاتے۔ اسکیچنگ کرتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ گھڑیال اب ساڑھے آٹھ بجا رہا تھا۔ پاکیزہ نے پریشانی سے موبائل اٹھا کر سبز بٹن دبایا کے کہیں اس میں ہی تو خرابی نہیں لیکن خرابی تو کہیں اور تھی۔ پاکیزہ کا دل چاہا کہ وہ خود فون کر لے لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ نئے پیغام کو لکھنے کے لیئے موبائل کو

ہدایت دی۔ سکرین پر ہیلو لکھا پھر انگلیاں رک گئی۔ چمکتی آنکھوں میں اضطراب نمایاں تھا۔ اس نے یہ پانچ حرف پھر خود ہی مٹا دیئے۔ کال لاگ میں موصول ہوئی کالز کا ریکارڈ نکالا۔ آفتاب کا نمبر ڈائل کرنے ہی لگی تھی کہ موبائل سکرین روشن ہو گئی۔ ساتھ ہی اسکے ہاتھ بھی موبائل کی ارتعاش سے مرتعش ہوئے۔ ایک لمحے کو پاکیزہ نے سوچا کہ میں بھی اب آدھا گھنٹہ انتظار کرواتی ہوں لیکن کروا نہ سکی۔ فون کانوں سے لگا لیا۔

''السلام علیکم'' پاکیزہ نے روٹھے لہجے میں مخاطب کیا۔

جواب میں کوئی آواز نہ آئی ''ہیلو'' پاکیزہ کو دوبارہ کہنا پڑا۔

پھر بھی جواب نہ ملا

''ہیلو آفتاب۔'' اب پاکیزہ نے اسے پکارا۔

جواب میں سپیکر سے سسکی ابھری۔ پاکیزہ کو حیرت ہوئی، وہ دوسری طرف رو رہا تھا۔

''ہیلو۔۔۔ آفتاب کیا ہوا تمہیں؟'' پریشانی پاکیزہ کی آواز میں در آئی۔

''میں تھک گیا ہوں۔ پاکیزہ میں بہت تھک گیا ہوں۔'' آفتاب ہچکیوں کے درمیان بولا۔

پاکیزہ اس کو روتے ہوئے تصور ہی نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ لڑکا جو سب کو ہنستا ہنساتا رہتا تھا۔ اس کو خاموشی سے آنسو بہاتے دیکھ چکی تھی لیکن یوں بچوں کی طرح سسکنا واقعی حیران کرنے کو کافی تھا۔

''کس چیز سے تھک گئے ہو؟ کیا ہوا ہے؟'' پاکیزہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

''میں خوش رہنے کا ڈرامہ کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ میں سب پہ یہ ظاہر کرتے کرتے تھک گیا ہوں کہ میرے پیسے والے گھر کا پیسہ میری خوشیوں کے لیئے کافی ہے۔ میں گھر کے روز کے جھگڑوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ آج پھر بھابھی نے امی سے بدتمیزی کی اور بھائی بجائے بھابھی کو ڈانٹنے کے امی کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ بھابھی کو کہہ دیا کہ سامان پیک کرو۔ جس گھر میں تمہاری عزت نہیں ہے۔ ہمیں اس گھر میں رہنا ہی نہیں ہے۔ مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بیویاں کیا ایسا گھول کر پلاتی ہیں کہ سگی مائیں چبھنے لگ جاتی ہیں۔ امی کا رو رو کر برا حال ہے۔ انہوں نے تو وہ دن اتنی مشکل سے کاٹے تھے جب بھائی دوسرے شہر پڑھنے گئے تھے۔ اب بھلا وہ بھائی کی جدائی کیسے برداشت کریں گی۔'' آفتاب روتے ہوئے اسے اپنے گھر کے حالات بتانے لگا۔

''تم پریشان نہ ہو۔ آفتاب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بھائی نے غصے میں کہا ہو گا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک معمولی سی لڑائی پر وہ گھر ہی چھوڑ جائیں۔'' پاکیزہ نے اسے تسلی دی۔ اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

"سوری پاکیزہ میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ میں تم سے اپنی پریشانی شئیر کرنے لگ گیا۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم تنہا ہو۔ تمہیں دوست کی ضرورت ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں میں خود تنہا ہوں۔ میں اکیلا ہوں۔ مجھے کسی ایسے کی ضرورت ہے جس کے سامنے میں رو سکوں۔ اپنا غم جس کے ساتھ بانٹ سکوں۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی شامل تھی۔

"آفتاب تم مجھ سے اپنی پریشانی شئیر کر سکتے ہو۔ مجھے کوئی مسلہ نہیں ہے سننے میں۔" پاکیزہ کا دل پسیجا۔

"نہیں مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ میں تمہیں اپنی پریشانی بتاؤں۔ سوری میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ"۔

آفتاب اپنی بات مکمل کر کے فون رکھ چکا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کال ایک گھنٹہ نہیں چلی تھی۔ گھنٹے کی کال میں چاہے پانچ منٹ ہی بات ہوتی لیکن پاکیزہ موبائل کو اٹھا کر اسکی سکرین کو دیکھتی رہتی۔ آج روٹین میں فرق پڑا تھا پاکیزہ کا دل افسردہ ہوا۔ اس نے موبائل کی تاریک سکرین کو تاسف سے دیکھا۔

لوگ جیسے دکھائی دیتے ہیں ویسے ہوتے نہیں ہیں۔ جن کے قہقہے محفل میں سب سے اونچے ہوتے ہیں ان کے دل میں اتنی ہی آہ و بکا بھی جاری رہتی ہے۔ جن کی پیشانی پر شکن نہیں ابھرتی، ان کی نازک مزاجی کو سل پر رکھ کر پیسا گیا ہوتا ہے۔ جن کے چہرے سے مسکان جدا نہیں ہوتی وہ آپ اپنے آپ سے ملنا چھوڑ چکے ہوتے ہیں۔ لوگوں کے چہروں پر مت جائیں چہرے سے بڑا کوئی نقاب نہیں!۔

☆☆☆☆☆

عالمِ قضا میں اک شور جو بپا سا ہے

مجھ کو اپنے ہونے کا یار واہمہ سا ہے

کالج میں اسپورٹس ویک چل رہا تھا۔ سائنس کی طالبات کو ان کی ٹیچرز کی طرف سے اجازت نہیں تھی کہ وہ ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ ان کے خیال میں ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے والی طالبات نصابی سرگرمیوں میں بہتر صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کر سکتی۔ اس کی نسبت بزم ادب اور فنون لطیفہ کی انچارج ڈھونڈ ڈھونڈ کر سائنس کی طالبات کو حصہ دلوا رہی تھی۔ ان کے مطابق سائنس کی طالبات کی ذہنی استعداد باقی بچیوں کی نسبت بہتر ہوتی ہے لہذا انکو حصہ دلوا کر نہ صرف طالبات کی تخلیقی صلاحیتوں کو سامنے لایا جا سکتا ہے بلکہ کالج کا نام بھی روشن کیا جا سکتا ہے۔

پورے کالج میں واحد کیمیا جیسے خشک مضمون کی ٹیچر میم کنیز ایسی تھیں کہ سائنسی مضامین پڑھنے والے طالبات کو ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا مشورہ دے رہی تھیں۔ پاکستان کی بہترین یونیورسٹی کی گولڈ میڈلسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے پاس اور بھی بہت سے سرٹیفیکیٹ تھے جو ان کی صلاحیتوں کا ثبوت تھے۔ ان سب ہی سرگرمیوں سے میم کنیز کی شخصیت میں بھی ایک مخصوص رکھ رکھاؤ اور طلسم پیدا ہو گیا تھا جو طالبات کو ان کا گرویدہ کیئے رکھتا۔

"پاکیزہ آپ کس سرگرمی میں حصہ لے رہی ہیں؟" انہوں نے اپنی ہونہار طالبہ کی دلچسپی جاننا چاہی۔

"میم کچھ سوچا نہیں پڑھائی کے علاوہ اور کسی سرگرمی میں حصہ لینے کا شوق تو ہے لیکن اپنی capacity کا اندازہ نہیں ہے۔" کچھ لوگوں سے صرف سچ بولنے کا دل کرتا ہے۔ پاکیزہ نے ان سے صرف سچ ہی کہا۔

جن لوگوں سے سچ بولنے کا دل کرتا ہے وہ بھی ہمیشہ سچا مشورہ ہی دیتے ہیں۔ جیسی آپکی نیت ہوتی ہے ویسا آپکو پھل مل جاتا ہے۔

کچھ توقف کے بعد میم کنیز گویا ہوئی "جہان تک میرا خیال ہے آپ کی ڈرائنگ بہت خوبصورت ہے۔ آپ کی ڈایاگرامز اپنی "موجودگی کا احساس خود دلاتی ہیں۔ آپ فائن آرٹس کی ٹیچر سے پتہ کرو، کوئی مصوری کا مقابلہ ہے تو آپ ضرور حصہ لو۔

"میم میں نے دیکھا تھا مصوری کا مقابلہ تو ہے لیکن ایبسٹریکٹ آرٹ جیسا وسیع موضوع چنا گیا ہے۔ ہمیں تو اردو کی کتاب میں ضمیر جعفری کی مزاحیہ نظم پڑھا دی گئی ہے ایبسٹریکٹ آرٹ دیکھتے ہی فنون لطیفہ کی حس نہیں جاگتی بلکہ الٹا ہنسی آجاتی ہے۔" پاکیزہ نے مسکراتے ہوئے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

"بچے ایبسٹریکٹ آرٹ ہٹ کر کوئی الگ ناقابل فہم شے نہیں ہے۔ یہ جدید آرٹ ہے۔ روایتی آرٹ میں مخصوص اشیاء کی اشکال بنائی جاتی ہیں جب کہ ایبسٹریکٹ آرٹ میں رنگوں اور ان کی اقسام کا امتزاج ہوتا ہے۔ رنگ تو ہر شخص کو اچھے لگتے ہیں اور میں یہ مان ہی نہیں سکتی کہ میری ذہین بچی جسے عام سی شے پسند نہیں آتی، جس کی پسند کا ایک اپنا معیار ہے، وہ رنگوں کا بہتر امتزاج نہیں کر سکتی۔" میم کنیز نے پاکیزہ کی ہمت بندھائی۔

پاکیزہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہ میم کنیز کا دیا گیا حوصلہ تھا یا پھر پاکیزہ کے اپنے اندر کچھ کرنے کا جنون مصوری کے مقابلے میں اس نے اول انعام حاصل کیا۔ میم کنیز اس کی پینٹنگ دیکھ کر خود حیران رہ گئی

۔ گرے اور بلیک کلر کے نشانوں کے ارد گرد سے پھوٹتی بالکل سفید روشنی۔۔۔ امید، مشکلات اور آسانیوں کو بہت آسانی سے واضح کرتی زندگی کی تصویر۔۔۔ کسی بھی دائرے کا احاطہ نمایاں نہیں تھا۔

سب ایک دوسرے کے اوپر بالکل ایسے جیسے مشکلات زندگی میں آتی ہیں۔ انسان اپنی روزمرہ زندگی کو دیکھتے ہوئے کسی اور شے کا منتظر ہوتا ہے لیکن کوئی اور آزمائش سامنے آجاتی ہے۔ اس آزمائش سے نبرد آزما ہوتے ہوئے روشنی کی امید جس روزن سے ہوتی ہے نجانے اس سے حبس اور گھٹن میں اضافہ کیوں ہونے لگتا ہے۔ عین اسی سمے پاؤں میں چبھتا کانٹا آزمائش سے نکال بھی دیتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک کانٹا کیسے آزمائش سے نکال سکتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ زندگی اتنی ہی ناقابل بیان ہے۔۔۔ اتنی ہی متحیر کر دینے والی کہ اسکے ہر ہر داؤ سے کمرا کھاڑے سے جا لگتی ہے۔ اس وقت اوپر آسمان نظر آتا ہے نیچے زمین دکھائی دیتی ہے۔

اور یاد صرف اللہ آتا ہے صرف اللہ!

☆☆☆☆☆☆

"پاکیزہ تم نے ٹھیک کہا تھا بھائی گھر چھوڑ کر نہیں گئے۔" آفتاب کی آواز کی چہکار کو پاکیزہ نے محسوس کیا۔

وہ خوش ہوئی۔ روز بات کرتے کرتے اس کا مزاج بھی پاکیزہ کے مزاج پر اثر ڈالا کرتا تھا۔ اس نے سچ میں دعا کی تھی کہ آفتاب کا بھائی گھر چھوڑ کر نہ جائے۔

"چلو شکر ہے یہ تو بہت اچھا ہوا۔ لیکن آفتاب جانے والوں کو روکا تو نہیں جا سکتا اگر تمہارے بھائی نے ایک دفعہ بات کی ہے تو ضرور انہوں نے کچھ سوچ کر ہی کہا ہو گا۔ میرا خیال ہے تم صرف شکر کرنے پہ اکتفانہ کرو بلکہ اپنی امی کو بھی اس بات کے لیئے تیار کرو۔ اگر بھائی چلے جائیں تو وہ اس صدمے کو دل سے نہ لگائیں۔" پاکیزہ نے اپنی عقل میں سمائی بات اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

آفتاب نے جوابا ہنکارا ابھرا اور پھر بولا "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ امی اتنے پیار سے سحرش آپی کو دلہن بنا کر لائی تھی لیکن وہ یہاں آتے ہی بدل گئی۔ ویسے وہ میرے ماموں کی بیٹی ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ امی کا مائنڈ سیٹ چینج کروں۔"

پاکیزہ نے بے دھیانی سے سر ہلایا پھر کچھ سوچ کر آفتاب سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے یاد ہے کہ تمہارے تین بھائی اور ایک بہن ہیں، باجی کا نام شاید شائلہ ہے۔ بھائیوں کے نام مجھے پتا نہیں۔ کیا نام ہیں بھائیوں کے؟ کیسا لگتا ہے ویسے بہن بھائیوں کا ہونا۔۔۔۔ بہت مزا آتا ہو گا؟"

"مزہ؟ جب بچپن کے دن تھے تب اتنے پیسے نہیں تھے کہ مزہ کر سکتے پھر جب بھائی پڑھ لکھ گئے تو پیسہ کماتے کماتے اتنے دور ہو گئے کہ گھر میں پیسہ پیسہ تو آ گیا لیکن مزہ کہیں بہت دور رہ گیا۔"

آفتاب نے یاسیت بھرے لہجے میں اپنا خاندانی منظر نامہ کھینچا۔

پاکیزہ تنہا رہتے رہتے فیملی کو بہت مس کرتی تھی۔ اسے آفتاب کا گھر اپیل کرتا، ایسا گھر جس میں باپ بھی تھا، جس میں بھائی لڑتا بھی تھا اور بہن فرمائشیں بھی کرتی ہو گی۔ جب جب آفتاب اس سے گھر کی پریشانی شئیر کرتا۔ پاکیزہ سوچتی تنہائی سے اکیلے لڑنے سے تو کہیں بہتر کسی اپنے کی پریشانی میں پریشان ہونا ہے۔

" تمہیں پتا ہے آفتاب میں کمپٹیشن میں فرسٹ آئی ہوں۔" پاکیزہ کو شگفتہ جواب نہ ملا تو اس نے گفتگو کا رخ ایک مرتبہ پھر بدلا۔

"اچھا بہت بہت مبارک ہو۔ جیتنا تو تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تم تو بنی ہی جیتنے کے لئے ہو۔ ایک میں ہوں ایورج سا۔ مجھ جیسے بہت ہوں گے لیکن تمہارے جیسی کبھی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملنی۔ اچھا تمہیں پتا ہے میرے سب سے بڑے بھائی کا نام ہے ماہتاب اور ان کی بیوی سحرش آپی۔ میرے دوسرے بھائی کا نام ہے وسیم انکی بیوی سونیا بھابی۔ مجھ سے بڑا نسیم ہے اس کی شادی نہیں ہوئی۔ ابھی تم نے ابھی پوچھا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے تمہیں کبھی انکا نام ہی نہیں بتایا۔"

آفتاب نے اپنے بھائی بھابیوں کے نام خفیف سی ہنسی کے ساتھ بتائے۔

''اچھا چلو آج بہت باتیں ہو گئی۔ اب فون رکھو۔'' پاکیزہ کو فوراً احساس ہوا کہ وہ بغیر کسی پلاننگ کے کافی دیر بات کر چکی ہے۔

کہاں بہت دیر بات ہوئی ہے؟ ابھی صرف پچیس منٹ گزرے ہیں تم نے بات نہیں کرنی تو بس فون سائیڈ پہ رکھ دو۔ کاٹنا مت۔'' آفتاب کی آواز میں وہی ضد تھی۔

''تم واقعی پاگل ہو۔'' روز کا دیا جانے والا لقب ایک بار پھر دہرا دیا گیا۔

''ہاں ہوں پاگل۔۔۔ تمہارے لیئے!'' اعتراف کیا گیا۔

پاکیزہ نے اللہ حافظ کہہ کر فون اپنے پاس رکھ دیا۔ کال چل رہی تھی اور مسکراہٹ پاکیزہ کے لبوں پر چٹختی ہوئی کلی کی طرح خوشبو بکھیر رہی تھی۔ تسکین نے کھڑکی کے ادھ کھلے پٹ سے پاکیزہ کو دیکھا اور اپنی نظریں اپنے ہاتھوں پر لگی کیو ٹیکس پہ مرکوز کر لیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ سجی سجی رہنے لگی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

سال اول کے امتحانات قریب آ رہے تھے۔ ہم نصابی سرگرمیاں کم ہونے کے بجائے زور پکڑتی جا رہی تھی۔ ملک کے صدر اور وزیر اعظم کیا تبدیل ہوئے فنون لطیفہ کی اہمیت ہی بدل گئے۔ نئے وزیر اعظم کی بیگم شاعرہ اور صدر کی بیگم ناول نگار تھیں۔ سو ایک برقی رو تمام تعلیمی اداروں میں دوڑ گئی۔ ٹیچرز نے سر تھام رکھے تھے۔

''کیا خیال ہے آپ کا کہ کس کو بھیجا جائے؟'' میم آرزو نے میم تقویم کی رائے جاننی چاہی۔

''ایسی بچی ہو جس کی پڑھائی کا حرج بھی نہ ہو۔'' میم تقویم نے بھی پر سوچ انداز میں کہا۔

''ایسی افلاطون بچی کہاں سے لائی جائے۔ ایک طرف اچھا رزلٹ دینے کا بھی دباؤ ہے اور دوسری طرف ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی بچیوں کو بھجوانے پہ زور ہے۔'' میم آرزو نے اپنی فکر کا اظہار کیا۔

''اگر کوئی تقریر کے لیئے بچی تیار کرنی ہو تو وہ مشکل نہیں ہے۔ آج کے دور میں میڈیا نے بچوں کے دماغ کمپیوٹر کر دیئے ہیں اور زبانیں قینچیاں۔ اب انہیں مصورہ بچی چاہیئے جو کسی بھی تھیم پر ایٹ دی اسپاٹ کام کر سکے، تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہو''۔ میم تقویم نے بھی تنگ آئے لہجے میں پریشانی کا اظہار کیا۔

"اب بندہ کیا کرے میں تو کہتی ہوں صاف انکار کر دیتے ہیں کے متعلقہ Requirement پہ پوری اترنے والی کوئی اسٹوڈنٹ نہیں ہے''۔ میم تقویم نے چٹکی بجاتے ہوئے مسئلے کا حل نکالا۔"

میم آرزو نے بھی پر سوچ انداز میں سر ہلا دیا۔ اسی اثناء میں میم کنیز میٹنگ روم میں داخل ہوئی۔ آخر کار ایک گھنٹے کی بحث کے بعد قرعہ فال پاکیزہ کے نام نکلا۔ وہ واحد ایسی بچی تھی کہ اس کی سرگرمی سے اس کی نصابی سرگرمیوں پر رتی برابر بھی فرق نہ پڑتا۔ پتہ نہیں وہ میم کنیز کے اعتماد پر پوری اترنے والی تھی یا نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

تم تو اس پاگل دیوانے سے منہ مت موڑو

تیرے نام کی مالا جپتا رہتا ہے اک شخص

گزرتے چندماہ میں آفتاب کے اعتماد میں کافی فرق پڑا تھا۔پاکیزہ کو وہ اکثر معصوم چھوٹا سا بچہ لگتا جس کے اندر احساس کمتری کی اتنی مضبوط جڑیں تھی جن کے کٹتے کٹتے شاید عمر تمام ہو جاتی لیکن اثرات ختم نہ ہو پاتے۔پاکیزہ اپنے طور پر اسکی الجھنیں دور کرنے کی کوشش کرتی اور کافی حد تک کامیاب بھی رہتی لیکن جب وہ خواہشوں کا کشکول لے کر در کھٹکھٹاتا تو اسے نامراد ہی لوٹنا پڑتا۔ایک عجیب سی کھینچاتانی جو ان دونوں کے درمیان تھی۔پاکیزہ کا گریز تھا، جو ان دونوں کو قریب لاتے لاتے پھر دور لے جاتا۔اس مدوجزر میں ایک کام تھا جو مسلسل تھا،ایک چیز تھی جو مستقل تھی، آفتاب روز آٹھ بجے اسے فون کرتا۔چاہے پھر پاکیزہ کے مزاج کے موسم کیسے ہی کیوں نہ ہوتے گھنٹے بھر بعد ہی فون بند کرتا۔وہ خوشی سے اس کو جھیلتا،اس کو برداشت کرتا لیکن اسے برداشت کہاں کیا جاسکتا تھا۔۔۔وہ تو خوشبو تھی اس کی تعریف کی جاسکتی تھی۔اس سے مسحور ہوا جاسکتا تھا۔ایک اور چیز جو مستقل تھی وہ آفتاب کی مستقل مزاجی تھی۔اس کے لہجے میں روز اول سے لے کر اب تک ایک آنے کی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"کیسی ہو؟"اس نے پوچھا

"اللہ پاک شکر ہے۔ٹھیک ہوں۔"پاکیزہ نے ہشاش بشاش لہجے میں جواب دیا۔

"تمہیں پتا ہے اس چیز کا ثواب تمہیں ضرور ملتا ہوگا۔"وہ متعرف لہجے میں بولا۔

"کس چیز کا ثواب؟"پاکیزہ کو اچنبھا ہوا۔

"اللہ کا شکر ادا کرنے کا۔سب سے بڑی بات کہ تمہاری یہ عادت تم سے مجھے بھی لگ گئی ہے۔کوئی بھی مجھ سے حال پوچھے اور میرا حال کیسا بھی ہو تمہاری عادت کی وجہ سے عادتاً میرے منہ سے یہی نکلتا ہے کہ اللہ کا شکر ہے۔"تشکر آمیز آواز میں جواب دیا گیا۔

پاکیزہ کی مدھر سی ہنسی مائیک پہ بکھری اور اسپیکر کے دوسری طرف سماعتوں کی معطر کر گئی۔وہ بے چینی سے بولا"پاکیزہ"

"ہاں جی"آفتاب کے لہجے میں کچھ تو تھا جو پاکیزہ کے لہجے کی جھجک بن بیٹھا۔

"کتنا عرصہ ہو گیا ہے میں نے تمہیں دیکھا نہیں۔۔۔"اب آواز میں پیاس سی محسوس ہوئی۔

"تو کیا ہوا میں نے بھی تو تمہیں نہیں دیکھا۔"پاکیزہ کے لہجے میں اٹھلانے کی سی خوشی گھل گئی۔

یہ خوشی ترشی بن کر آفتاب کے حلق میں جالگی۔

"تمہیں تو کچھ نہیں ہوتا۔تمہیں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔مجھے فرق پڑتا ہے۔مجھے تمہیں دیکھنے یا نہ دیکھنے سے بہت فرق پڑتا ہے۔میں کتنی دفعہ تمہارے گھر کے باہر سے گزرا ہوں لیکن اس خیال سے نہیں بتایا کہ تم خفا نہ ہو جاؤ۔تمہارے کالج کے باہر بھی آسکتا تھا

لیکن نہیں تم تو مجھے قتل ہی کر دیتی۔ مجھے آج یہ اعتراف کرنے دو کہ تم عام لڑکیوں جیسی نہیں ہو۔ تمہیں امپریس نہیں کیا جا سکتا تمہیں صرف اور صرف اون کیا جا سکتا ہے۔ یہ تمہاری ثابت قدمی ہی ہے جو مجھے متزلزل نہیں ہونے دیتی۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ میرا کردار جو بھی ہے تمہاری وجہ سے ہے۔"

اس کی آواز نم ہو گئی تھی پاکیزہ کو چند لمحوں کے لیئے اپنے اوپر فخر محسوس ہوا پھر وہ اپنے سامنے پڑی نوٹ بک کو ناخن سے کریدتے ہوئے بولی۔

"تم بتاؤ تمہاری طبعیت کیسی ہے؟"

"اوہو آج دن میں چاند تو نہیں نکل آیا تھا۔ یہ معجزہ کیسے ہوا کہ آپکو بھی میری طبعیت پوچھنے کا خیال آ گیا۔" وہ شرارتی ہوا۔

" اگر تم ایسے مسخرے بازی کرو گے تو یہ خیال آخری دفعہ پوچھا جائے گا۔" اس نے نروٹھے لہجے میں دھمکایا۔

"سوری سوری طبعیت ٹھیک نہیں ہے لیکن ٹھیک ہو جائے گی۔۔۔ اگر ان ترسی ہوئی آنکھوں کو آپ کی ایک جھلک نصیب ہو جائے فرمائش کی گئی۔!"

"دن میں کون سی گھٹیا فلم دیکھی تھی جس کے اثرات ابھی تک نہیں گئے۔" پاکیزہ نے ہنستے ہوئے ٹالا۔

"میں سنجیدہ ہوں۔" پھر اصرار کیا گیا۔

"یہ کون سی فلم ہے؟" وہ مسلسل شرارت کرنے کے موڈ میں تھی۔

"پاکیزہ" پھر سے پیاسی آواز کی بازگشت اس کی سماعتوں کی نذر ہوئی۔

اس پر جیسے کوئی فسوں ساطاری ہوا۔

"جی" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

" میں تمہیں واقعی دیکھنا چاہتا ہوں بس ایک نظر" فرمائش دہرائی گئی۔

"کیسے ممکن ہے؟" پاکیزہ نے جیسے ہتھیار پھینک دیئے۔

"جیسے تم چاہو۔" آفتاب پہلے سے ہی سر جھکائے کھڑا تھا۔'

"کالج کے باہر تو نا ممکن ہے۔ میں نہیں چاہتی میرے اوپر انگلیاں اٹھیں۔ اگر تقدیر میں ایک دوسرے کو دیکھنا لکھا ہوا تو یوں ہی راہ چلتے مل جائیں گے۔" پاکزیہ نے خاموشی سے قدم پیچھے کیئے۔

"ایک وقت اور ایک راستہ ہے جب کوئی بھی نہیں دیکھے گا۔ صبح فجر کی اذانوں کے وقت میں تمہارے گھر کے سامنے آ جاؤں گا۔ تم کھڑکی میں آ جانا" آفتاب کئی قدم آگے بڑھا چکا تھا۔

"پاگل ہو؟ سردیاں ہیں۔ صبح اتنا اندھیرا ہوتا ہے۔ تم آؤ گے کیسے؟" پاکیزہ پریشان ہوئی۔

"آنا میرا مسئلہ ہے پلیز تم مان جاؤ۔" وہ قطعیت سے بولا۔

اگر میں مان بھی گئی تو۔۔۔

ابھی بات آدھی اس کے منہ میں ہی تھی کہ وہ بولا

بس پھر میں آؤں گا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔

" پاکیزہ ایک کام کرو گی" آفتاب نے پھر پوچھا۔

" کیا؟" وہ سوچ چکی تھی کہ مزید کوئی فرمائش کی گئی تو ساری لگا میں کھینچ ڈالے گی۔

"وہ آج رات موبائل اپنے پاس رکھنا تاکہ میں آؤں تو تم سے رابطہ کر سکوں۔"

بے ضرر سی خواہش تھی لہذا وہ مان گئی اور مزید بات کیے بغیر فون سرہانے کے نیچے رکھ دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

کوئی بات کرنی ہے چاند سے کسی شاخسار کی اوٹ میں

مجھے راستے میں یہیں کہیں کسی کنج گل میں اتار دو

پاکیزہ دروازے سے اندر ہوئی تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی مدھر سروں سے گنگناتی اپنے بالوں کو ایک طرف ڈالے ہاتھوں پہ موئسچرائزنگ لوشن لگاتی وہ کوئی اور نہیں تسکین پھوپھو ہی تھی۔ ان کی آنکھوں کے نیچے پڑے حلقوں میں کمی آئی تھی اور رنگ کچھ اور نکھر گیا تھا۔ یہ شاید مسکراہٹ کا اذن تھا جس نے ان کی پیشانی کو وسیع کر دیا تھا۔ پاکیزہ سچ میں حیران ہوئی۔ یہ وہ خفا خفا اکھڑی اکھڑی سی پھوپھو تو نہیں تھی۔

بعض اوقات ہم موبائل کی مدد سے اپنے سے دور لوگوں کے ساتھ فاصلے کم کرتے کرتے اپنے خونی رشتوں کے درمیان اتنے فاصلے لے آتے ہیں کہ وقت کے ہاتھوں آئی تبدیلیاں ہمیں حیران کر دیتی ہیں۔ ہم یہ کہنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں کے فلاں بدل گیا حالانکہ بدلا وہ نہیں ہوتا۔ بدلنے کا عمل ہماری طرف سے شروع ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کو نوٹ کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور پھر جب وہ مکمل بدل جاتے ہیں تو شکایت کرتے ہیں۔

پاکیزہ نے مشکل سے اپنے لبوں پر آنے والے شکوے کو روکا۔

"پھوپھو پیاری لگ رہی ہیں آپ۔" وہ تعریف کرنے سے خود کو روک نہ سکی۔

"محبت انسان کو حسین بنا دیتی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

اتنی میٹھی ہنسی کہ پاکیزہ مبہوت رہ گئی۔

"میری محبت سچی نہیں تھی اس لیئے اس نے آپ کو پریشان کیا۔ نئی محبت کہاں سے ملی جس نے آپ کو حسین بنادیا۔" وہ دونوں ہاتھ ان کے شانوں پہ رکھتے ہوئے گال سے گال مس کرتے ہوئے آئینے میں دیکھ کر پوچھنے لگی۔

تسکین نے پاکیزہ کی پیشانی چومی اور اس کے دونوں ہاتھوں کو ہاتھ میں لیکر بولی

"محبت نئی پرانی سچی یا جھوٹی نہیں ہوتی۔ محبت محبت ہوتی ہے۔ محبت کا اثر بھی محبت ہوتا ہے اور محبت کی تاثیر بھی محبت ہوتی ہے۔ آپ اس کو قبول کرنے میں دیر لگاسکتے ہیں۔ یہ اثر کرنے میں دیر نہیں لگاتی۔ بس قبول کرنے کی دیر ہے یہ دعا بن کر بادلوں سے اٹھکیلیاں کرتی عرش کو چھوتی ہے پھر باران بنتی ہے، باران برستی ہے تو سب دھل جاتا ہے، سارے گلے شکوے دم توڑ دیتے ہیں اندر باہر بس ایک چیز رہ جاتی ہے اور وہ محبت ہے!"

"تعلق ختم ہو جائے تو محبت ختم تو نہیں ہو جاتی پھوپھو؟" پاکیزہ نے کچھ کریدنے کے لیئے سوال پوچھا۔

"ہاہاہا پاگل لڑکی محبت محبت ہے۔ محبت کوئی مذاق نہیں ہے کہ ختم ہو جائے۔ محبت روگ بن جائے یا سنجوگ بن جائے محبت ساتھ رہتی ہے۔ دل کی آخری دھڑکن کے ساتھ کسی نا کسی صورت دھڑکتی رہتی ہے۔ محبت تو مہندی کے پسے ہوئے پتوں کی طرح ہے اس نے تو رنگ چھوڑنا ہی ہے۔ محبت تو پھولوں میں بسی ہوئی خوشبو جیسی ہے اس کے مقدر میں چہار سو مہکنا ہی ہے۔ محبت کسی درخت پہ کندے نام جیسی ہے اسے ہر موسم میں وہی رہنا ہی ہے۔ محبت پرندوں کی چہچہاہٹ جیسی ہے کچھ بھی ہو ان کی تقدیر میں چہکنا ہی ہے۔ محبت تمہارے میرے جیسے ہر انسان جیسی ہے ہم زندہ رہیں یا مر جائیں اسے کسی نا کسی صورت زندہ رہنا ہی ہے"۔ تسکین نے بہت تسلی سے جواب دیا۔

کمرے میں مدھم سی روشنی میں بھی پاکیزہ کا ہیولہ کپکپاتا ہوا صاف محسوس ہو رہا تھا۔ تسکین جو اتنی دیر سے اس کے اضطراب کو نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"موبائل اپنے پاس رکھ لوں۔ بعض اوقات دوستوں سے کچھ پوچھنا پڑ جاتا ہے۔ کل ٹیسٹ ہے نامیرا۔" پاکیزہ نے دانتوں سے لب کاٹتے ہوئے بہانہ تراشا۔

تسکین نے ہاتھ اپنی پیشانی پہ مارا۔ نظریں اٹھا کر پاکیزہ کو دیکھا۔

" اوہو میں تو بھول ہی گئی۔"

"پاکیزہ کو لگا کہ تسکین کو ضرور کوئی اہم کام ہے اور خود موبائل کی ضرورت ہو گی۔ اب وہ ضرور منع کر دے گی۔ میں کیسے رابطے میں رہوں گی۔ سوال دماغ میں بازگشت کرنے لگ گئے۔"

تسکین نے اٹھ کر بستر کے ساتھ پڑی الماری سے ایک ڈبہ نکالا اور پاکیزہ کی طرف بڑھایا۔

"یہ لو۔"

"یہ کیا ہے؟" پاکیزہ حیرت سے بولی۔

اتنی کم روشنی میں وہ ڈبے کو زیادہ دھیان سے دیکھ نہیں سکی تھی۔

"تمہارے میٹرک کے رزلٹ کا گفٹ ہے۔ میں دفتر سے لیٹ آتی ہوں۔ تم گھر آکر مجھے انفارم کر دیا کرو۔ دوستوں سے بھی رابطے میں رہنے کے لیئے تمہیں چاہیئے ہو گا۔ بس اتنا دھیان رکھنا کہ موبائل کے ساتھ میں تمہیں اپنا بھروسہ بھی دے رہی ہوں۔" تسکین نے ڈبہ اب باقاعدہ پاکیزہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"تھینک یو پھوپھو۔ تھینک یو سوچ۔۔۔" پاکیزہ تسکین کے گلے لگ گئی۔

"اچھا اب مکھن نہیں لگاؤ۔ وہ والی سم اس موبائل میں ڈال کر استعمال کرو اور میرا موبائل مجھے واپس کر دو۔" تسکین نے نرمی سے اسے خود سے علیحدہ کیا اور اپنی توجہ سنگھار میز کی جانب کر لی جیسے اس سے اہم کوئی کام نہیں ہے۔۔

☆☆☆☆☆☆☆

اب مجھ سے ان آنکھوں کی حفاظت نہیں ہوتی

اب مجھ سے ترے خواب سنبھالے نہیں جاتے

آنکھوں سے نکلتے ہو مگر دھیان میں رکھنا

تم ایسے کبھی دل سے نکالے نہیں جاتے

رات کے دس بجے پاکیزہ نے اپنے سارے کام ختم کر کے موبائل اٹھایا۔

مجھے پھوپھو نے موبائل گفٹ کیا ہے" میسج لکھا اور آفتاب کے نمبر پہ بھیج دیا۔

پہلے وہ آفتاب کا نمبر محفوظ کرنے لگی تھی لیکن اسے لگا شاید اس سے رابطے اور گفتگو میں اضافہ ہو جائے گا۔ اس نے نمبر محفوظ نہیں کیا۔

فوراً موبائل تھرتھرایا۔ ایک نیا پیغام سکرین پہ لکھا نظر آرہا تھا۔ پاکیزہ نے فوراً پڑھنے کرنے کے لیئے بٹن دبایا۔

"واہ اس کا مطلب اب میں ہر وقت تم سے رابطے میں رہ سکتا ہوں۔ ساری رات تم سے باتیں کر سکتا ہوں۔" ٹھک کر کے جواب موصول ہوا۔ پیغام میں بے چینی عیاں تھی۔

"نہیں ہم مخصوص وقت پر ہی بات کریں گے بس صرف آج رات ہی رابطہ رہے گا۔" پاکیزہ نے مخصوص اکھڑ انداز میں جواب دیا۔

مجھے تو آج رات نیند ہی نہیں آئے گی۔" وہ پر جوش تھا۔

"ٹھیک ہے تم جاگتے رہو۔ میں موبائل سائلنٹ کر کے سو رہی ہوں۔" پاکیزہ نے اسے ہری جھنڈی دکھائی اور الارم لگا کر سو گئی۔

الارم فجر سے پندرہ منٹ پہلے کا لگا تھا۔ مخصوص وقت پر موبائل بجا تو پاکیزہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ اس نے فوراً الارم بند کیا۔ دیکھا تو پندرہ مسڈ کالز اور پینتس میسج آئے ہوئے تھے۔ ابھی موبائل ہاتھ ہی میں تھا کہ پھر فون کال آئی۔ پاکیزہ نے کال ریسیو کر کے موبائل کان سے لگایا۔

" ہیلو۔"

"اف" آفتاب کی آواز آئی۔

"کیا ہوا؟" پاکیزہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اسے پورا یقین تھا کہ آفتاب آج نہیں آئے گا۔ اب اتنی بھی کیا دیوانگی کہ سردیوں کی صبح گھر کی چوکھٹ پر آ جائے ضرور وہ ۔۔"اف" کے بعد کوئی بہانہ گھڑنے والا تھا۔

"تمہاری آواز کتنی خوبصورت لگتی ہے سو کر اٹھنے کے بعد۔۔۔ مجھے آج پتا چلا" وہ جذب کے عالم میں بولا۔

اس کے پاس گھڑنے کو کوئی بہانہ نہیں تھا۔

پاکیزہ نے غیر ارادی طور پر گلا کھنکارا۔

"پاکیزہ جلدی سے کھڑکی میں آؤ۔' مجھے تو ڈر لگ رہا تھا کہ اگر تمہاری آنکھ ہی نہ کھلی۔' آفتاب نے اسے بلایا۔

"سیریسلی؟ تم آ گئے ہو؟" پاکیزہ حیران ہوئی۔

"میڈم میں پچھلے آدھے گھنٹے سے باہر کھڑا ہوں۔ اب تو میری قلفی جمنے والی ہے۔ اپنے روپ کی حدت دو تا کہ مجھے زندگی کا احساس ہو۔" آفتاب کی آواز میں کپکپی نمایاں تھی۔

پاکیزہ اس کی بات سنتے ہوئے بے یقینی سے کھڑکی کے قریب گئی۔ کھڑکی کے پٹ وا کیئے تو وہ وہیں تھا۔ وہ واقعی نیچے کھڑا ہوا تھا۔ سٹریٹ بلب کی روشنی میں اس کی سفید ناک سرخ ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ہاتھوں کو آپس میں رگڑ رہا تھا۔

کھڑکی کے کھلتے ہی اس کی آنکھیں خوشی سے چمکی۔ ایک برقی رو جیسے اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

شوخ نگاہوں نے پاکیزہ کو جھجکنے پہ مجبور کر دیا۔ پاکیزہ فوراً دو قدم پیچھے ہٹی۔ وہ اس کی نگاہوں کے دائرے سے دور نکل آئی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو کمرے کا دروازہ ہمیشہ کی طرح کھلا تھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا ہاتھ میں پکڑا موبائل تھرتھرایا۔

"سامنے آؤ نا۔" گزارش سکرین پر سرگوشی بکھیرتی دکھائی دی۔

وہ مسکرائی اور پل دو پل کو سامنے آئی۔ پاکیزہ کی فطری جھجک تھی۔

اس میں نگاہیں اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ موبائل پھر تھرتھرایا۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔"

سانولے رنگ میں گلابیاں گھل گئی، حیا سے ہاتھ لرزنے لگے۔

اس نے فوری جواب لکھا۔

"اب چلے جاؤ پلیز۔"

"چلا جاؤں گا۔ میری طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرا دو۔" اصرار کیا گیا۔

"نہیں ناں۔" وہ گھبرائی۔

"بس پھر میں نہیں جاؤں گا۔" وہ بضد ہوا۔

"میں نے نماز بھی پڑھنی ہے" وہ جیسے ہولے سے کسمسائی۔

"آج تو میں بھی پڑھوں گا۔ نفل فجر کے ساتھ نہیں پڑھے جاسکتے۔ ظہر تک یہ شکرانے کے نفل ادھار رہے" وہ کچھ اور شوخ ہوا۔

"اب جاؤ بھی۔" وہ زچ ہوئی۔

"نہیں پہلے تم سامنے آؤ" وہ کچا سا لڑکا اسے دیکھنے کی دھن کا پکا تھا۔

"اچھا میں دیکھتی ہوں۔" وہ مجبور ہوئی۔

نظریں اٹھا کر نظروں سے ملائی تو بس پل بھر کا تصادم ہوا بجانے کتنے بند ٹوٹ گئے اور ایک ریلا سا بہہ نکلا۔ اسے لگا وہ خود بھی اس میں ڈوب جائے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

جان کہنے سے کبھی جان نہیں ہوتی ہیں

لڑکیاں اتنی بھی نادان نہیں ہوتی ہیں

ہال میں خاموشی تھی۔ اتنی خاموشی کہ ارد گرد موجود لوگوں کے سانس تک کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔ تیز روشنی میں چہروں پہ تناؤ نمایاں نظر آرہا تھا۔ مقابلے کی فضا نے ماحول کو بوجھل کر رکھا تھا۔

پورے ملک سے آئے پچاس کے قریب طالب علم اپنے اپنے کینوس کے قریب کھڑے تھے۔ پردہ ہٹنے کی دیر تھی، تھیم ملنے والی تھی۔ موقع پر ان کو پینٹنگز بنانی تھی جو اس تین لفظی تھیم پر پوری اترتی ہو۔ وقت صرف آدھا گھنٹہ تھا۔ رنگ موجود تھے لیکن برش کوئی نہیں تھا۔ بڑی سی سکرین پر پہلے تین کا ہندسہ آیا پھر دو کا اور پھر ایک کا۔۔۔ ساتھ ہی پردہ سرکا دیا گیا۔ تھیم کے لیئے دیئے گئے الفاظ نے سب کی دھڑکنیں منجمند کر دی تھیں۔ صرف ایک دل تھا تو جو نارمل انداز میں دھڑک رہا تھا۔

"روشنی کے پر" سب سوچ رہے تھے کہ کیا بنائیں۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے کیا بنانا ہے۔ وہ بہت پر سکون تھی۔ اس کی سانولی خوبصورت انگلیاں رنگوں سے کھیلنے لگیں۔ ہال میں بہت سی مخروطی انگلیاں رنگوں میں ڈوبی ہوئی تھی اور چابک دستی سے کینوس پر رنگ بکھیر رہی تھیں۔ گھڑیال نے پورے بارہ بجنے کا سندیسہ دیا اور وقت تمام ہو گیا۔ سب پینٹنگز کی پشت سامعین کی طرف تھی۔ مقابلے کے شرکاء کو نشستیں سنبھالنے کا کہہ دیا گیا۔

ججز کے بعد دیگرے سب پینٹنگز کے قریب جا رہے تھے اور انہیں بغور دیکھ رہے تھے۔ کچھ پینٹنگز کے پاس جا کر ان کے تاثرات میں حیرت نمایاں نظر آتی اور کچھ کے پاس جانے پر ستائش۔ اللہ اللہ کر کے انتظار کے لمحات ختم ہوئے۔ نتائج کا اعلان ہونے لگا۔

معزز مہمان گرامی کو اسٹیج پر بلایا گیا۔ وہ مخاطب ہوئے

اللہ نے ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی رکھی ہے۔ کوئی ایسا نہیں ہے جس کے اندر کوئی خوبی نہ ہو۔ آپ خوش نصیب ہیں اگر" آپ کو پتہ ہے کہ اللہ تعالی آپ سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ ہر عطا کا حساب ہو گا۔ اگر بالفرض آپ خوش نصیب نہیں ہیں یعنی اپنی خوبی سے واقف نہیں ہیں۔ تب بھی اللہ نے آپ کو دیکھنے سننے سمجھنے اور بولنے کی صلاحیت دی ہے۔ کل کو آپ سے اسی کے متعلق سوال ہو گا کہ آیا آپ نے کیا دیکھا، کیا سمجھا، کیا سنا اور کیا بول۔ اپنی خوبیوں کو استعمال کریں تا کہ جواب دے سکیں۔

جب آپ ان خوبیوں کو استعمال کرنے کی کوشش کریں گے تو سب چیزیں آپ کے حق میں نہیں ہو گی۔ بہت سی چیزیں مخالف بھی ہوں گی۔ انعام کی صورت میں آپ کو آسانی ملنی ہے تو آپ کو پہلے مشکل بھی تو دیکھنی پڑے گی۔

سب سے بڑا حربہ جس سے ہمارے نوجوانوں کو ان کی صلاحیتوں کے استعمال میں ناکارہ بنا دیا جاتا ہے، وہ ان کے کردار پر وار ہے۔ آپ کے گھروں میں ٹی وی سکریںز سے عجیب وغریب کردار آپ کے گھر میں گھس رہے ہیں۔ وہ ان قدروں کو پامال کر رہے ہیں جو بحثیت مسلمان آپ کا خاصہ ہیں۔۔ موبائل کے سگنلز کے ذریعے ہزاروں دلدلیں آپ کے قدموں سے لپٹتی جا رہی ہیں۔ یہ آپ کے پیروں میں زنجیر کی طرح پڑ جائیں گی اور ان کے شکنجے میں آپ کا کردار مسخ ہو کر رہ جائے گا۔ جس کا کردار مسخ ہو جائے وہ تخلیق نہیں کر سکتا۔ یہاں موجود سارے نو عمر اذہان تخلیق کار ہیں۔ اپنے کردار کی حفاظت کریں تا کہ تخلیق کر سکیں۔" ہال میں دیر تک تالیاں گونجتی رہیں۔

کردار اور تخلیق کا سبق کسی نے دل سے سنا، اس کے دل میں اتر گیا تھا۔

نتائج کا اعلان کیا گیا۔ تیسرا انعام ایسی پینٹنگ کو ملا جس میں قلم اور دوات بنی تھی ساتھ الفظ اقراء لکھا تھا۔ تخلیق کار کو خوب سراہا گیا وہ پینٹنگ جسے دوسرا انعام ملا اس میں کتاب کے سرورق پر ننھا فرشتہ پشت کیئے فاختہ کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے پروں پر صرف سفید رنگ تھا پہلا انعام جس پینٹنگ کو ملا اس کو دیکھنے والوں نے کھڑا ہو کر دیکھا پہلی نظر میں وہ قوس قزح لگتی تھی، ذرا غور

سے دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ قوس قزح میں ماں کا چہرہ بنا ہوا تھا اور اس کی گود میں چھوٹا سا بچہ سو رہا ہے۔ سب سے خوبصورت چیز ماں اور بچے کی مسکراہٹ سے ان کے گال پر پڑنے والا ایک جیسا چھوٹا سا ڈمپل تھا۔ مزید غور کرنے پر بچہ کسی کتاب کا سرورق معلوم ہوتا۔ یہ ایک پینٹنگ نہیں انکشاف در انکشاف تھا۔

ہال میں مصورہ کے لیئے دیر تک تالیاں بجائی گئیں۔ اسٹیج پر کھڑے ہو کر انعام وصول کرتے ہوئے پاکیزہ کی آنکھوں میں نمی در آئی۔ اس نے صرف ماں کی محرومی کو کینوس پر بکھیرا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

ہم سانجھ سے کی چھایا ہیں، تم چڑھتی رات کی چندرما

ہم جاتے ہیں تم آتے ہو، پھر میل کی صورت کیونکر ہو

بارش کے قطرے بہت نرمی سے پتوں کو چوم رہے تھے۔ مٹی سے اٹھنے والی خوشبو نے فضا میں عجیب سی طمانیت پھیلا دی تھی۔ ایسا اطمینان جس میں اسرار بھی ہو اور پرت در پرت ہو۔ وہ خود کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کیا وہ وہ کر رہی تھی جو وہ کرنا چاہتی تھی؟ نہیں یہ تو اس کا راستہ نہیں تھا۔ اس راستے کی منزل کا تو اسے خود پتہ نہیں تھا۔ کیا وہ وہی سب کرنا چاہتی ہے جو اس کے ارد گرد ہو رہا ہے؟ اس نے خود سے سوال پوچھا۔ جواب نفی میں ملا۔ اپنے آپ سے لڑتے وہ آخر کار ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی اس نے کیا کرنا ہے۔ اب فضا میں صرف طمانیت تھی۔ کچھ عجب نہیں رہا تھا۔ سارے اسرار پرت در پرت اس پر وا ہو چکے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کر دی۔

نمکین سے چہرے پہ بارش کی چند شریر سی بوندیں اپنی چھب دکھلانے لگیں۔ چمکتی سڈول کلائی میں پہنے ہوئے بریسلٹ کو اس نے ہاتھ سے تھوڑا اور پیچھے کیا۔ وہ ٹشو پیپر نکالنے کے لیئے دراز کھولنے ہی لگی تھی کہ موبائل پہ میسج ٹون بجی۔ اس کی تنہائی میں ایک دفعہ پھر مخل ہونے کی کوشش کی گئی تھی۔

"اسلام علیکم کیسی ہو؟" پیغام سکرین پر جھلملا رہا تھا۔

پاکیزہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر کوئی میسج آیا۔ اب پاکیزہ نے پڑھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ آدھے گھنٹے میں پندرہ سے بیس میسجز آ چکے تھے۔ وہ ایک نوٹفکیشن کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔ پاکیزہ نے موبائل سائلنٹ کیا اور وضو کرنے چلی گئی۔ لوٹی تو آنکھوں میں سرخ ڈورے اور ہلکی سی نمی تھی۔ دو نفل برائے حاجت پڑھے اور اللہ کے سامنے جھولی پھیلا کر بیٹھ گئی۔

"اللہ جی وہ میرا راستہ بھی نہیں ہے، میری منزل بھی نہیں ہے۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچتی اور اگر میں نے زندگی میں کبھی کچھ سوچا بھی تو مجھے لگتا ہے آفتاب کے بارے میں نہیں ہو گا۔ میں جانتی ہوں کہ میں رشتوں کو ترسی ہوئی ہوں لیکن میرا کاسہ اس کی نگاہ سے نہ بھر۔۔ مجھے اس کے ذریعے سے نہ عطا کر۔۔۔ وہ جو بھی ہے جیسا بھی ہے جتنا بھی اچھا ہے میری دعاؤں سے اچھا

نہیں ہے، تیری آیتوں سے اچھا نہیں ہے، تیرے وعدوں سے اچھا نہیں ہے۔ وہ نامحرم میرے راستے میں آنے لگا ہے۔ پتا نہیں میری بصارت اور بصیرت پہ اس دن کیسی پٹی بندھ گئی کہ میں نے اسے گھر کے نیچے تک بلا لیا۔ میرے آس پاس بے شمار لڑکیاں ہیں جن کو میں نے اس راستے پر چلتے دیکھا ہے۔ محبت کے نام پر رسوائی ایسا راستہ ہے جس پر آگے بڑھنے پر بہت سے راستے کھلے ملتے ہیں لیکن واپسی کا کوئی ایک بھی راستہ نہیں ہوتا۔ اللہ جی میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہونا چاہتی۔ اللہ جی میں صم بکم عمی نہیں ہونا چاہتی۔ ''میں اس سے فاصلہ رکھنا چاہتی ہوں۔ میں اس سے فاصلے پہ رہنا چاہتی ہوں۔ میرے Instincts مجھے کہہ رہے ہیں کہ میں اس سے بات کرنے کی عادت میں مبتلا ہونے والی ہوں۔ اللہ جی میں گناہگار ہوں۔ میں جو بھی ہوں، تیری بندی ہوں۔ مجھ پہ آزمائش نہ ڈالنا۔ مجھے اس بندے کے قریب نہ کرنا۔ مجھے پتہ ہے کہ آج کل کی ان چیزوں میں اتنی کشش ہے کہ ہاتھ پاؤں بندھے محسوس ہوتے ہیں لیکن اللہ جی آپ میرے دل پر مہر لگا دیں۔ مجھے ایک انسان کا کر کے نشان عبرت نہ بنانا۔ مجھے کسی عظیم کام کے لیئے مختص کر لیں۔ مجھ سے اپنی مخلوق کے لیئے کوئی بڑا کام کروالیں۔ مجھے اشتہار نہ بننے دینا''

روتے اور گڑگڑاتے ہوئے اس نے اپنی دعا مکمل کی۔ آمین کہا تو چہرے پر پھیرے گئے۔ دونوں ہاتھ آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ وہ مطمئن ہو گئی تھی اس نے اپنے اللہ سے بات کر لی تھی۔ اب اسے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ دل بہت ہلکا سا محسوس ہوا۔ اس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ چھوڑنے کے لیئے بتانا ضروری نہیں ہوتا۔ چھوڑنے کے لئے صرف چھوڑنا ضروری ہوتا ہے۔ آگے بڑھ کر اس نے کھڑکی کھولی تو ٹھنڈی ہواؤں نے اس کی صبیح پیشانی کو چوم لیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

میرے تن برہنہ دشمن اسی غم میں گھل رہے ہیں
کہ مرے بدن پہ سالم یہ لباس ہے تو کیوں ہے

ہاں میں نے کو ایجوکیشن سے پڑھا ہے لیکن اب تو مجھے نام بھی نہیں یاد لڑکوں کے ''پاکیزہ سے اس کے اعتماد کا پس منظر جاننے کے لیئے لڑکیاں مختلف سوالات کرتی تھیں ایسے ہی ایک سوال کے جواب پہ پاکیزہ نے ناک سے مکھی اڑائی۔

پھر تو تم ان سے بات بھی کرتی ہو گی۔'' کہنے والی کی آواز میں حسرت ناتمام گونجتی سنائی دی۔

پاکیزہ زچ ہوئی۔

''ہاں ظاہر ہے۔ سو کام پڑتے ہیں بات تو کرنی پڑتی ہے۔ بات کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ حماد مجھے پینسل دے دو، حمزہ تم اپنی کاپی لے لو۔ اس طرح کے دو چار جملوں سے کون سا کوئی مجھے اٹھا کر لے جائے گا۔ ضرورتا بولنے پڑتے ہیں۔''

''لیکن میں نے کبھی کسی لڑکے سے رسمی سی بات نہیں کی۔ کسی سے بات کرنی پڑ جائے اگر تو میں تو شاید بے ہوش ہی ہو جاؤں۔ میرے ہاتھوں میں ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں۔'' ماہ روش اپنی ازلی اعتماد کی کمی کا رونا رونے لگی۔''

"تم کبھی دکاندار سے کوئی چیز لینے نہیں گئی؟" پاکیزہ نے سنجیدگی سے سوال پوچھا۔

"ہاں بچپن میں اکثر سکول جاتے کوئی چیز لینی پڑ جاتی تھی تو لے لیتی تھی۔ ابھی بھی اگر بھائی گھر نہ ہو تو ضروری کتاب وغیرہ چاہیئے ہو تو چلی جاتی ہوں۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

پاکیزہ کے انداز میں سکون سمٹ کر آ گیا۔

"دیکھو تم اس دکاندار کو انکل سمجھتی ہو۔ اس لیئے ریلیکس رہتی ہو۔ تمہیں چاہیئے کہ اب جب کسی لڑکے سے واسطہ پڑے تو اپنا اور اس کا رشتہ سامنے رکھو۔ یہ نہ سوچو کہ وہ لڑکا ہے، مرد ہے۔ یاد رکھو کہ وہ ماموں کا بیٹا ہے، پھوپھی کا بیٹا ہے، بس کنڈیکٹر ہے، دکان والا ہے، پکوڑے بیچتا ہے، کپڑے سیتا ہے۔ اس سے ٹو دا پوائنٹ بات کرو۔ اس کی صنف کو ہوا نہ بناؤ۔ رشتے کو سمجھو پھر تمہیں ڈر نہیں لگے گا۔ ٹھنڈے پسینے بھی نہیں آئیں گے۔"

ماہ روش نے شکر گزار نظروں سے پاکیزہ کو دیکھا۔ طیبہ اور ریحانہ ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

وہ تھوڑا بور ہوئیں ریحانہ نے طیبہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"ہم ذرا سموسے لے کر آتے ہیں۔ تم لوگوں نے مزید جتنی گھسی پٹی باتیں کرنی ہیں۔ کر لو۔"

پاکیزہ اور ماہ روش کے چہرے پر مسکراہٹ در آئی۔ وہ کینٹین کے ایک خالی بینچ پر بیٹھ گئی۔

"ایک بات اور کہوں ماہ روش" پاکیزہ نے جھجک کر پوچھا۔

"ہاں کہو۔" ماہ روش ٹشو سے بینچ کے سامنے پڑا میز صاف کرتے ہوئے بولی۔

"کبھی کسی کو غلط چیز پر بھی پوائنٹ آؤٹ نہ کیا کرو۔ بعض اوقات ہم خود بہت اچھے ہوتے ہیں لیکن اللہ کے نزدیک وہ شخص زیادہ پیارا ہوتا ہے جسے ہم پوائنٹ آؤٹ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس پوائنٹ آؤٹ کرنے سے ہوتا بس یہی ہے کہ ہمیں آخری سانس تب تک نہیں آتا جب تک ہم بھی وہی غلطی نہ کر لیں۔ ہم مکمل تو ہیں نہیں کسی کی تصویر کے اڑتے رنگوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ہمیشہ ہمارے رنگ دھندلے پڑ جاتے ہیں۔"

ماہ روش پاکیزہ کے لہجے پر غور کر رہی تھی۔ ریحانہ اور طیبہ اتنے میں سموسے لے کر وارد ہوئیں۔ ماہ روش کی آنکھوں میں اب تشکر کا شائبہ تک نہ تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

بھونچال کوئی زیرِ زمین کس نے چھپایا

ذی روح، سبھی کوہ و بحر کانپ رہے ہیں

مغرب کے بعد عشاء ہونے کو آئی تھی لیکن پھو پھو ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ پاکیزہ جلے پیروں والی بلی کی طرح مسلسل چکر کاٹ رہی تھی۔ تسکین پھو پھو کا نمبر بھی نہیں مل رہا تھا۔ اس نے فقط اتنا بتانا تھا کہ کل مصوری کے دوسرے اور حتمی راؤنڈ کے لیئے آرٹ کونسل جانا ہے۔ شاید آنے میں دیر ہو جائے لیکن پھو پھو تھی اور گھر ہی نہیں آ رہی تھی۔ اس نے موبائل کا بٹن دبا کر وقت دیکھنے کی کوشش کی تو پھو پھو کا لنگ دیکھ کر جان میں جان آئی۔

"پاکیزہ مجھے ایک ضروری کام ہے، میں تھوڑا لیٹ آؤں گی۔ تم کھانا کھا کر سو جانا۔ چابیاں میرے پاس ہیں۔ میں خود ہی ان لاک کر لوں گی۔" پھو پھو نے اپنی بات تیزی سے کی۔

"پھو پھو میری بات تو سنیں۔" پاکیزہ فوراً بولی، اس نے اپنی بات کہنی چاہی۔

"بیٹا کل بات کر لینا، ابھی مجھے بہت کام ہے۔" پھو پھو کو شاید واقعی بہت کام تھا، ان کے پیچھے لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھی۔ انہوں نے فون رکھ دیا۔

پاکیزہ روہانسی ہو گئی۔ اس نے دودھ گرم کر کے عشاء کی نماز پڑھی۔ دروازہ اچھی طرح لاکڈ کر کے سونے کے لیئے بستر پر آ گئی۔ بلیک لسٹ میں ستاون مسڈ کالز پڑی ہوئی تھیں اور میسجز تو اس نے مکمل بلاک کر رکھے تھے۔ آفتاب کا نام اس کے ذہن کے دریچے پر دستک دے کر معدوم ہو گیا۔ وہ آنے والے کل کے بارے میں سوچنے لگی۔

"اب میں پھو پھو کو سرپرائز دوں گی۔ میں بھی انہیں نہیں بتاؤں گی۔ میرا کل مقابلہ ہے۔ کل جب انعام لے کر گھر آؤں گی تو وہ خوش ہو جائیں گی۔"

اپنی سمجھ کے مطابق ایک اور فیصلہ لے کر وہ مطمئن ہو گئی۔ سرخروئی کے خوابوں نے اس کی آنکھوں میں نیند کی لوریاں پرو دیں۔ وہ غفلت کے مزے لینے لگی۔

☆☆☆☆☆☆☆

شبِ غم کی سحر نے روند ڈالا ہے اسے گویا
زمیں سے اپنی کرچیاں اٹھاتا شخص دیکھو تو

"آ گئی؟ تم نے یہی کرنا تھا۔ تم واقعی عذاب ہو جسے مجھ پہ مسلط کر دیا گیا۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں تمہیں موبائل تو دے رہی ہوں لیکن ساتھ اپنا بھروسہ بھی۔۔۔ تمہیں میرے بھروسے کا مان رکھنا تھا۔ تمہیں میرے اعتماد کا مان رکھنا تھا۔ تم نے وہی کیا جو تم کر سکتی تھی۔ بڑی بڑی باتیں کرنے والے اندر سے کتنے چھوٹے ہوتے ہیں۔ آج تم نے یہ ثابت کر دیا۔ دل کرتا ہے تمہارا منہ توڑ دوں۔ میں نے کیسے سوچ لیا کہ یہ لڑکی میرے لیئے پریشانی کا باعث نہیں بنے گی۔۔۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ تمہارے والدین کبھی میرے بارے میں نہ سوچ سکے۔ تم نے بھی کیوں سوچنا تھا۔ نہیں سوچنا تھا۔ تم نے نہیں سوچا۔"

وہ دھاڑتی ہوئی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ ایک تھپڑ اس کے چہرے پہ رسید کیا۔ وہ ہکا بکا آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہیں کھڑی رہی۔

"اب دیدہ دلیری تو دیکھو کیسے آنکھوں میں جھانک رہی ہو۔ دیدوں کی شرم تو مر گئی ہے۔ تمہارے ماں باپ اگر زندہ ہوتے تو تمہیں اپنے ہاتھوں سے مار دیتے۔ تم کبھی کسی کا سر فخر سے بلند نہیں کر سکتی۔ تم اذیت ہو۔ تم بدنامی ہو۔ تمہاری جیسی لڑکیاں ہوتی ہوں جو گھر والوں کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑتی۔ تم جیسی لڑکیوں کے چہرے تیزاب پھینک کر مسخ کر دینے چاہیئے۔"

وہ وہیں کھڑی تھی۔ پھوپھو نے اسے اب کی بار اتنے زور کا تھپڑ مارا کہ وہ زمین پہ گر گئی۔ اس کی ناک سے خون نکل رہا تھا۔

"کس سے ملنے گئی تھی؟ میں نے تمہیں کسی چیز سے نہیں روکا۔ تم مجھے اعتماد میں لیتی۔ مجھے ایک دفعہ بتاتی کہ کہاں جانا ہے لیکن نہیں ---۔ تمہارے ماں باپ نے جینے نہیں دیا اور اب تم سکون سے مرنے بھی نہیں دینا چاہتی۔ گھٹیا لڑکی۔ اتنی ہی آگ لگی ہے تو مجھے "بتاتی میں تمہیں رخصت کر دیتی۔ مجھے کیا پتہ جو مشورے مجھے دینے کی کوشش کر رہی تھی وہ تم اپنے لئے دے رہی تھی

پنجوں کے بل گری ہوئی پاکیزہ کے پاس بیٹھ کر انہوں نے اس کی کمر پہ دو تھپڑ مزید جڑ دیئے۔ وہ اس وقت جاہل لگ رہی تھیں۔

خیر تمہیں کیا فرق پڑنا؟ تمہیں فرق پڑتا ہوتا تو تم اس گھر سے قدم باہر نکالنے سے پہلے کم از کم ایک دفعہ رو سوچتی۔ مر جاؤ۔ تمہیں مر جانا چاہیئے۔ تمہیں اپنے نام کی لاج بھی نہیں آئی۔ تمہیں واقعی مر جانا چاہیئے۔

وہ اسے کہہ کر اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ پاکیزہ کی آنکھیں خشک تھیں، مکمل خشک۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

کئی لوگ تھے جو بچھڑ گئے کئی نقش تھے جو بگڑ گئے
کئی شہر تھے جو اجڑ گئے ابھی ظلم کیا کوئی اور ہے
وہ عجیب منظرِ خواب تھا کہ وجود تھا نہ سراب تھا
کبھی یوں لگا کوئی اور ہے کبھی یوں لگا کوئی اور ہے

"میں نے کہیں بہت غلط تو نہیں کر دیا۔ اس نے بیڈ کی کراؤن سے ٹیک لگا کر خود سے سوال کیا۔

"کر کے پوچھ رہی ہو کہ ٹھیک کیا یا غلط؟ اگر بہت غلط نہ ہوتا تو تمہیں اتنی بے سکونی نہ ہوتی۔ کوئی اس کے اندر پوری قوت سے چلایا تھا۔

کھڑکی سے آنے والی روشنی میں بھی اس کے نین نقش واضح نظر نہیں آ رہے تھے۔

!کچھ ایسا ویسا کرنے کے بعد اپنی شکل خود دیکھنے کا دل نہیں کرتا

روشنی کہاں اس کے چہرے کا طواف کرنا پسند کرتی ---۔

"اتنا بھی برا نہیں کیا۔ اس کی وجہ سے میں ریجیکٹ ہو جاتی ہوں۔ اس نے خود کو تسلی دی۔

خوبصورت نقوش پر سوچ کا عکس پڑ رہا تھا۔ وہ بدصورت لگ رہی تھی۔

"کوئی کبھی کسی دوسرے کے لیئے ریجیکٹ نہیں ہوتا۔ ہمیشہ اپنی ہی کسی وجہ سے ریجیکٹ ہوتا ہے۔ وہ بے چاری تو تم سے ہمدردی کر رہی تھی۔ کوئی اس کے اندر ایک بار پھر چلایا۔

"ہونہہ چیز کیا ہے وہ؟ وہ مجھے نصیحت کرے گی؟ مجھ سے ہمدردی کرے گی؟ کیوں؟ وہ تو میرے ہی جتنی ہے۔۔۔ وہ کون سا آسمان سے اتری ہے؟ سانولی سی اور اگر سفاک سچ بولا جائے تو کالی سی لڑکی کا مجھ سے کیا مقابلہ؟ میں اس کے اعتماد کے نیچے آ کر کیوں دب جاؤں؟ اس نے اڑیل پن سے اٹھ آنے والی آوازوں کا گلا گھونٹا تھا۔ وہ بے چینی سے اٹھ کر اپنے بال باندھنے لگی۔ روشنی کی کرنیں اس کی ہنسلی کی ہڈی پر پڑی اور اس کی خوبصورتی سہہ نہ سکیں تو شرما گئیں۔

کچھ چیزیں ہوتی ہیں جو بس حُسن کی شاہد بنتی ہیں۔ کچھ انسان بھی ایسے ہی ہوتے ہیں جن کے لئے حُسن سے بڑی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔

"تم نے خود اس سے مشورہ لینا چاہا تھا۔۔۔ اگر تمہیں ٹیچرز نے اس مقابلے کے لیئے نہیں بھیجا تو اس میں اس کا کیا قصور؟ تم نے اس کی خوشی کیوں خراب کی؟ کوئی مسلسل سوال کر رہا تھا۔ اندر سے آنے والی آوازیں یقیناً کمزور نہیں تھی۔

"افوہ۔۔۔ اب ایسا بھی کیا کر دیا۔۔۔ بس اس کی پھوپھو کو یہی کہا ہے نا کہ پاکیزہ آج حماد کے ساتھ ڈیٹ پر گئی ہے۔ اگر اس کا کردار اتنا ہی مضبوط ہوا تو پھوپھو پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ شیلڈ لے کر گھر گئی ہے۔ وہ سمجھ جائیں گی کسی کی شرارت ہے۔ اگر میں مقابلے میں نہیں جا سکی اور ابھی تک پر اعتماد نہیں ہو سکی تو کیا ہوا پوری جیت کا مزہ تو اسے بھی نہیں لینے دوں گی۔"

آخر کار اس نے اپنا دامن جھاڑ لیا تھا۔

وہ اٹھ کر باہر آئی اور چھپاک چھپاک ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگ گئی۔

ماہ روش نے اپنے گیلے خوبصورت ہاتھوں کو سراہا تھا لیکن آئینے کو وہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ وہ کیا ہے ناں کہ۔۔۔ کچھ ایسا ویسا کرنے کے بعد اپنی شکل خود بھی دیکھنے کا دل نہیں کرتا!

☆☆☆☆

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی

اب ایسی شکستی کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

اس نے اپنا بستہ وہیں صحن میں چھوڑا جس میں بہترین پینٹنگ پر دی گئی شیلڈ اور انعام میں ملا چیک اس عجیب خوش آمدید پر افسردہ تھا۔ وہ خشک آنکھیں لئے اپنے کمرے میں آئی اور چٹخنی چڑھا دی۔ بس ہو گئی تھی۔۔۔ بس اتنا ہی انتظار ہو سکتا تھا۔۔۔ آنسوؤں نے

برداشت کے بندھن سے دامن آذاد کروایا۔اب وہ اس کے چہرے پہ آئی سیاہ زلفوں کو نم کر رہے تھے اور اس کے گال بھگو رہے تھے۔

"میں کون ہوں؟میں کیا ہوں؟میں کس لئے ہوں؟میں کچھ بھی کر لوں۔۔۔جو مرضی بن جاؤں۔۔۔میرا ماضی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا!مجھے ان گناہوں کی سزا ملتی رہے گی جنہیں میں نے کیا ہی نہیں۔میں یتیم تھی یتیم ہی رہوں گی۔مجھے لاوارث ہی کہا جائے گا،مجھے لاوارث ہی ٹریٹ کیا جائے گا۔میری محبت کا کوئی اجر نہیں ہے،میری محنت کا کوئی صلہ نہیں ہے۔!"

مجھ سے ایک بار تو پوچھتی کہ میں کیوں لیٹ آئی ہوں؟مجھ پر الزام لگادیا بغیر سوچے بغیر سمجھے۔۔۔اللہ جی مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ اس بھری دنیا میں جب کوئی میرا ہے ہی نہیں۔۔۔۔جب کسی کو میرا احساس ہی نہیں ہے تو میں کیوں زندہ ہوں؟مجھے تو زندہ ہی نہیں رہنا چاہیے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میرے لیئے مرنا جینے کی نسبت ہمیشہ آسان رہا ہے!

میں ہی ڈھیٹ تھی۔یہ میں ہی تھی کہ کبھی مرنے کو جینے پر ترجیح نہ دی۔مجھے اس روز مر جانا چاہیے تھا جس روز میرے والدین مرے تھے۔اگر میں اس دن بھی نہیں مری تو پھر تب مر جاتی جب میری سہیلیوں کو سرد گرم سے بچانے کے لئے ان کے بھائی ہوتے تھے اور میرا کوئی بھائی نہیں تھا!میرا کوئی بھائی نہیں تھا جو مجھے سکول چھوڑتا۔۔۔میرا کوئی بھائی نہیں تھا جو دنیا کی اٹھتی نظریں روکتا۔۔۔لیکن نہیں میں تب بھی نہیں مری۔۔۔میں نے جینے کو ترجیح دی!میں نے اپنے اندر اپنا بھائی خود پیدا کیا۔اپنے آپ کو مضبوط کیا اور لوگوں سے اپنے حصے کی جگہ وصول کر زمین کے سینے پر مونگ دلتی رہی۔

مجھے تو تب مر جانا چاہیے تھا جب میرے پاس گھر گھر کھیلنے کو کوئی ساتھی نہیں ہوتا تھا۔میں اور میری گڑیا اکیلے رہ جاتے تھے۔میری الجھنیں سلجھانے کو کوئی نہیں ہوتا تھا۔میرے بال بنانے کے لیئے کسی بہن کا ہاتھ نہیں تھا لیکن میں نہیں مری۔میں تب بھی نہیں مری!

"میں نے سوچا مجھے دنیا میں کچھ ایسا کرنا ہے جو یاد رکھا جائے۔۔۔میں کیسے بھول گئی کہ یہ دنیا فانی ہے۔۔۔یہاں کچھ بھی یاد نہیں رکھا جاتا!میں کیسے بھول گئی کہ یہ دنیا میرے ہوتے ہوئے مجھے کچھ نہیں سمجھتی۔۔۔میرے بعد کیا خاک سمجھے گی؟میں کیسے بھول گئی قسمت اور خوش قسمتی میں بہت فرق ہوتا ہے۔۔۔میرے پاس قسمت تو ہے لیکن خوش قسمتی نہیں؟۔"

وہ خود کلامی کر رہی تھی۔اس کے آنسو گال سے گردن تک بہتے چلے جا رہے تھے۔

وہ نیچے فرش پر بیٹھی تھی۔اس کا سر بیڈ پہ ٹکا ہوا تھا۔نم بال اس کی گردن پر چپک رہے تھے۔اسے بالکل بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔اس وقت تو وہ چاہتی تھی کہ اس کے لمبے بال کسی دھاری دار چاقو میں بدل جائیں اور اس کی گردن کو چیر کر رکھ دے۔

"مجھے اب مر جانا چاہئیے بس اسی سوچ کی بازگشت دماغ میں سنائی دے رہی تھی۔

عین اسی لمحے تکیے کے نیچے پڑا موبائل تھرتھرایا۔ بائیں ہاتھ کی پشت سے گال صاف کرتے ہوئے اس نے اپنی سسکی دبائی۔ موبائل کی سکرین کو دیکھا۔۔۔ انجان نمبر سے آنے والی کال منتظر پائی۔ وہ مکمل یقین اور ارادے سے مرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔

موبائل کو مٹھی میں دبائے اضطرابی انداز میں قدموں پہ پورا زور لگا کر کھڑی ہوئی تھی لیکن پھر بھی لگتا تھا کہ گر جائے گی۔ غصے سے اس کا وجود اس کے اپنے قابو میں نہیں تھا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ بیڈ کی پائنتی تھام کر اس نے خود کو سہارا دیا۔ وہ لمبے لمبے سانس بھرنے لگی۔ ایک آتش تھی جو اسے جھلسا رہی تھی۔ شام کی خاموشی میں ماتم کا سا سماں تھا۔ اسے لگا بین دستک دیتے ہوئے اس گھر میں داخل ہو گئے ہیں۔ ڈرے ہوئے انداز میں کمرے کے دروازے کو تکا۔ اس کی نظر درز سے آنے والی روشنی کی طرف نہیں تھی۔۔۔ وہ اندھیرا دیکھ رہی تھی صرف اندھیرا !

☆☆☆☆☆☆

موبائل تو اس نے کان سے لگا لیا۔

"السلام علیکم! تسکین بہت بہت مبارک ہو آپ کو انجان نمبر سے آنے والی کال تھی۔ وہ تھوڑا حیران ہوئی۔ موبائل کان سے ہٹا کر سکرین پہ آنے والے نمبر کو پہچاننے کی خاطر دیکھا لیکن پھر بھی پہچان نہ پائی۔

"وعلیکم السلام۔ جی کون؟ میں نے پہچانا نہیں۔ اس نے حیران لہجے میں سوال کیا۔

"میں پاکیزہ کی ٹیچر کنیز بات کر رہی ہوں۔ اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اس کے ساتھ گھر آؤں آپ کے لیکن میرے بیٹے کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لئے مجھے گھر آنا پڑا۔ قومی سطح کے مقابلے میں اول آنا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ میں تو ماشاء اللہ پاکیزہ کی ذہانت پہ اس کی صلاحیت پہ حیران ہوں۔ بن ماں باپ کے بچی ہے لیکن ہیرا ہے۔ مس کنیز اپنا تعارف کروانے کے بعد بلا تکان بولنے لگ گئیں۔

"جی جی! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تسکین تو بوکھلا ہی گئی۔

"آپ کو بھی کریڈٹ جاتا ہے آپ نے بچی پر بند نہیں باندھے بلکہ ہمیشہ اس کو ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت دی ہے۔ میں پھر کبھی آپ کے گھر آؤں گی۔ اپنا خیال رکھیئے گا۔ تسکین کی بوکھلاہٹ سے مس کنیز کو اور کچھ سوجھا نہیں تو انہوں نے فون رکھ دیا۔

اسے وہ سب پھول یاد آ رہے تھے جو اس نے کچھ دیر قبل پاکیزہ پر برسائے تھے۔

"مجھے بھی کریڈٹ جاتا ہے۔۔۔ میں نے بند نہیں باندھا! اس نے خود کلامی کی۔

"ہاں میں نے توڑنے کی کوشش کی ہے۔ خود کو خود ہی کہتے ہوئے اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھر گئی۔

" لیکن میں نے جان بوجھ کر اسے نہیں توڑا۔ مجھے اکسایا گیا تھا۔ خود کلامی جاری تھی۔

اسے اب فوراً پاکیزہ کے ٹوٹے دل کو جوڑنا تھا نظریں درز سے آتی ہوئی روشنی کے سنہرے پن سے الجھ گئی۔

"پھر وہ کال کس کی تھی اس نے خود سے پوچھے جانے کے قابل سوال کیا۔

☆☆☆☆☆☆

گلیوں میں گھومتی ہیں ہزاروں کہانیاں

چہروں پہ نقش وقت کی پہنائیوں کو دیکھ

"ہیلو۔ السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام! کون بول رہا ہے؟"

آپ کی خیر خواہ بات کر رہی ہوں۔ آپ کو پاکیزہ کے بارے میں کچھ بتانا تھا"

"پاکیزہ کے بارے میں۔۔۔ خیریت؟ وہ ٹھیک تو ہے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن شاید آپ کو ٹھیک نہیں رہنے دے گی"

"کیا مطلب؟ آپ کون ہیں؟ کیا کہنا چاہتی ہیں؟ اس کے ہوش اڑے تھے۔"

"مطلب صاف ہے پاکیزہ کو آپ کی عزت کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں ہے۔ آپ کی تربیت کو چولہے میں جھونک کر وہ آج ڈیٹ پر گئی ہے۔"

"کون ہیں آپ؟ کیوں فضول باتیں کر رہی ہیں؟ وہ وقتی طور پر طیش میں آئی تھی۔"

"میں فضول باتیں نہیں کر رہی۔ سچ بول رہی ہوں۔ اپنے سکول کے دوست حمزہ کے ساتھ اس کا معاشقہ چل رہا ہے۔ آج محبت کو نذرانہ پیش کرنے گئی ہے۔ آپ کو یقین نہیں آتا تو دیکھ لیجیئے گا وہ آج کتنے بجے گھر آتی ہے۔"

"ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔ کون ہیں آپ؟"

تسکین ہیلو ہیلو ہی کرتی رہ گئی تھی اور فون دوسری طرف سے بند کر دیا گیا تھا۔

ماہ روش نے اپنی معلومات کی آگ سے تیلی لگا دی تھی۔ اس فون سے بہت کچھ بدلنے والا تھا۔ کون جانتا تھا یہ ایک تیلی کہاں آگ لگانے والی تھی۔ کس کو معلوم تھا۔۔۔

تیزی سے بھسم کر دینے والی آگ کے رنگ کچھ اور گہرے ہو گئے!

☆☆☆☆☆☆

جو آگ لگائی تھی تم نے، اس کو تو بجھایا اشکوں نے

جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دنیا نے ہمیں چھوڑا جذبی، ہم چھور نہ دیں کیوں دنیا کو

دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب دنیا دنیا کون کرے

مجھے اب مر ہی جانا چاہئیے کسی کو میری ضرورت نہیں ہے۔کوئی میرا نہیں ہے۔میرے ہونے یا نہ ہونے سے کسی کو فرق نہیں پڑتا۔ اپنے خیالات کا خود کلامی کے انداز میں اظہار کرتے ہوئے وہ بیڈ کے ساتھ پڑے دراز کو کھولنے لگی۔

اس میں بلیڈ پڑا تھا۔۔۔

بس کچھ لمحوں کی دوری پر تھا زندگی اور موت کا فاصلہ!

وہ ٹوٹ چکی تھی۔۔۔ایک ایسا الزام جو اس نے کیا بھی نہیں تھا۔اس کا دل چھلنی ہو گیا تھا۔

چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے بہت بڑے خواب چکنا چور ہوئے تھے اور لہو رس رس کر اسے شکست خوردہ کر رہا تھا۔

ساتھ ہی موبائل فون کی گھنٹی بجی، وہ کسی خوفناک خواب سے جاگی اور فون کو کان سے لگا لیا۔

"ہیلو۔پلیز پلیز۔۔۔فون نہیں رکھنا۔دوسری طرف آفتاب تھا۔"

"بولو کیا مسئلہ ہے؟ پاکیزہ کی آواز رندھی ہوئی تھی۔"

"میں مر رہا ہوں تمہارے بغیر وہ فریادی ہوا۔"

"تو تم مر کیوں نہیں جاتے ایک ہی دفعہ۔وہ اکتائی۔آواز پر نمی غالب تھی۔"

"تمہیں کیا ہوا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔۔۔آواز ٹھیک نہیں لگ رہی۔وہ بری طرح فکر مند ہوا۔"

"مجھے کچھ ہو یا نہ ہو کسی کو کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔اس دنیا میں میرا ہے ہی کون؟ آنسو آنکھوں سے یوں ٹوٹ کر گرے جیسے آسمان سے تارے ٹوٹ کر گرتے ہیں۔انہیں تو بس سامع کی ہی ضرورت تھی۔"

"کیا ہوا ہے پاکیزہ؟ پلیز ایسے نہیں روتے۔کیا ہو گیا ہے؟ مجھے فرق پڑتا ہے۔مجھے بہت فرق پڑتا ہے۔مجھ سے پوچھو تمہارا ہونا یا نہ ہونا کیسا ہے۔میں تمہاری آواز سن لیتا ہوں یا تمہاری موجودگی محسوس کر لیتا ہوں میرا دن سنور جاتا ہے، میں ہلکا پھلکا ہو جاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کسی بلیسنگ کی طرح اللہ نے مجھے تم سے نوازا ہے، میں اللہ کا گناہگار بندہ اور مجھے تم دے دی گئی ہو۔وہ بے ربط جملے کہہ رہا تھا۔اسے بولنے کا موقع ملا تھا۔"

"میں تمہاری نہیں ہوں۔یہ بات کیوں سمجھ نہیں آتی۔بس اوٹ پٹانگ بولنے لگ جاتے ہو'۔'وہ چڑ گئی۔"

"تم میری ہو ورنہ ہم ابھی بات نہ کر رہے ہوتے۔ کوئی کنکشن تو میرے اور تمہارے درمیان ہے ورنہ تم روز کی طرح آج بھی انجان نمبر دیکھ کر فون ہی نہ اٹھاتی۔ مان لو کہ ہمیں ایک دوسرے کی تنہائی دور کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ اگر تمہارا اور میرا ملنا نصیب میں نہ لکھا ہوتا تو مجھے تمہارا نمبر بھی نہ ملتا۔ تقدیر میں ہمارا ملنا لکھا ہے اس لئے تو راستے بنتے جا رہے ہیں"

وہ لڑکی تھی اور اس وقت ویسے بھی دکھی ہوئی تھی۔ دم بخود اس کے کھل جا سِم سِم کا ورد سننے لگی۔

"تم ایک دفعہ میرا ہاتھ تھام لو تو راستے کو پھولوں سے بھر دوں گا۔ تم نہیں ہوتی تو مجھے لگتا ہے کوئی ادھورا پن سا ہے کوئی کمی سی ہے ۔ میں اس ادھورے پن کو کوئی نام نہیں دے سکتا۔ سچ ہے تو یہ ہے کے تمہارے نہ ہونے سے میں نامکمل سا رہتا ہوں۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا یا سحر پھونک رہا تھا۔ ہوا کو سمجھ نہیں آیا کہ کیسا فسوں اس کے کندھے پر لاد دیا گیا ہے۔"

پاکیزہ کے بہتے آنسو تھم چکے تھے۔ اسے اب رونا نہیں آ رہا تھا۔

"میرے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لفظوں کے جال نہ پھینکو مجھ پر۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا لفظوں کے جال سے۔ وہ تین سیکنڈ بعد بولی تھی لیکن اس کا لہجہ جھوٹ کی چغلی کھا رہا تھا۔"

"اب بتا بھی دو۔ کیا ہوا ہے؟ میں بھی تو تمہیں اپنی ساری پریشانیاں بتاتا ہوں۔ دوست نہ سمجھو۔۔۔ ڈسٹ بن سمجھو! اپنے اندر کا غبار نکال دو۔ وہ خود کو گرا کر اسے اٹھا رہا تھا۔"

"دوست ڈسٹ بن نہیں ہوتے وہ جیکٹ کی اندرونی طرف والی جیب ہوتے ہیں۔ جو چیزیں ہم دنیا میں کسی کو دکھانا نہیں چاہتے۔ ان کے حوالے کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ خیر میں آج قومی سطح پر پینٹنگ کمپٹیشن جیت کر آئی ہوں لیکن پھوپھو نے اسکو کوئی weightage ہی نہیں دی۔ وہ پگھل گئی۔ حقیقت تو خود بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ ابھی تک شاک میں تھی۔"

"حق ہاہ! تم نے مجھے بتایا نہیں۔ مانو نہ مانو تمہیں میری آہ لگی ہے۔ یہاں یہ بندہ غریب تمہاری آواز سننے کو ترس رہا ہے اور تم اس چیز کا افسوس کر رہی ہو کہ کوئی تمہیں اہمیت نہیں دیتا۔ ضروری تو نہیں کہ آپ کو ہر جگہ سے بہت پیار ملے، اگر کسی ایک جگہ سے پیار نہ ملے تو یہ مطلب نہیں کے آپ کے نصیب میں پیار نہیں ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ اس جگہ سے آپ کو پیار نہیں ملتا۔ کہیں اور سے ہو سکتا ہے بہت زیادہ پیار آپ کا منتظر ہو۔ بات کے اختتام تک لہجہ شرارتی ہوا۔"

لیکن آفتاب میری زندگی میں تسکین پھوپھو کے علاوہ ہے ہی کون۔ میں نے ان کے علاوہ اپنی زندگی میں کوئی رشتہ نہیں دیکھا۔ وہ جیسی بھی ہیں، میرا ہر رشتہ ہیں۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی ہر بات سے، ان کے رویے سے متاثر ہوتی ہوں۔ آفتاب کی ساری باتیں اس نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دی تھی۔"

"میں ہوں ناں تمہاری زندگی میں۔۔۔ پاکیزہ! رشتے وہ نہیں جو ہمارے ساتھ دنیا میں آتے ہیں۔ وہ تو بس مجبوریاں ہوتی ہیں جن کے ساتھ بندہ بندھ کر رہ جاتا ہے، رشتے تو وہ ہوتے ہیں جو نبھائے جاتے ہیں۔ اگر تمہارے ساتھ پھوپھو پیار نہیں کر رہی، اظہار نہیں کر

رہی تم ہضم کرلو۔ وہ کم از کم تمہارے ساتھ تو ہیں۔ اگر تم ان سے پیار کرتی ہو تو ان کا ہونا تمہارے لئے کافی ہونا چاہیے۔ جیسے مجھے تمہارا ہونا کافی لگتا ہے۔ ہر جگہ سے سب کچھ تو نہیں ملتا ناں۔ اپنی ذات کی پیچیدگیوں میں الجھا ہوا وہ شخص اسے دھیمے لہجے میں سلجھا رہا تھا۔"

"شکریہ آفتاب تم سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ میں ریلیکس ہو گئی۔ ایک منٹ پہلے تک میں سوچ رہی تھی کہ خود کو نقصان پہنچا لوں۔ خود کو کچھ کرلوں۔ تم نے مجھے ایزی کر دیا ہے۔ اس نے کھلے دل سے آفتاب کے کردار کو سراہا۔"

"شکریہ ادا کرنا ہے تو بس میرا نمبر ان بلاک کر دو۔ تمہاری آواز سن کر تمہیں نہیں پتا میں کتنا ریلیکس ہو گیا ہوں۔ اور خبردار ایسا سوچنا بھی مت کہ تم خود کو کچھ کرلو گی۔ تمہیں اپنا نہیں خیال میرا تو خیال کرو۔ میں تمہارے بغیر کیا کروں گا۔۔۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"بہت خاص لہجے میں آفتاب عام سی باتیں کہہ رہا تھا۔ آنسو پاکیزہ کی پلکوں کا رستہ بھول چکے تھے۔ اب کسی طرف سے ملنے والی اہمیت نے سانولاہٹ کو تمتماہٹ میں بدل دیا تھا۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی، ساری پریشانی ساری کلفت اڑن چھو ہو گئی تھی۔ آفتاب جتنا باہر سے خوبصورت ہے اس سے کہیں زیادہ اندر سے پیارا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوا۔"

☆☆☆☆☆☆

یہ شہر کسی آئینہ کردار بدن پر

الزام لگاتے ہوئے ڈرتا بھی نہیں ہے

تسکین کو سمجھ نہیں آرہی تھی وہ کیسے پاکیزہ کا سامنا کرے۔ اتنی سخت سست سنانے کے بعد کیسے معافی مانگے۔

سخت لفظ بولنا جتنا آسان ہے معافی مانگنا اتنا ہی مشکل ہے!

وال کلاک کی ٹک ٹک ہوتی ہی چلی جارہی تھی مگر وہ کمرے میں جامد کھڑی تھی۔ عمرِ رواں کے سفر نے اس کے چہرے کی تازگی چرا لی تھی۔ اب غازے کی مدد سے چہرے کو سنوار رکھا تھا۔ اس وقت غازہ بھی مضحکہ خیز معلوم ہو رہا تھا۔

چلو غلطی ہو گئی تو کیا ہوا۔ معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے پاکیزہ تو مجھ سے چھوٹی ہے۔ وہ خود سے ہم کلام ہوئی۔

باہر روشنی کونے کھدروں سے نکل کر اندھیرے میں گم ہوتی جارہی تھی۔ وہ مشکل سے قدم اٹھاتی باہر آئی۔ معافی مانگنے کے خیال سے کسلمندی چھا گئی تھی۔

"بھائی نے بھی تو میرے ساتھ اچھا نہیں کیا، میری تنہائی کا خیال نہیں کیا۔ منوں مٹی تلے جا سوئے۔ انہوں نے تو مجھ سے معافی نہیں مانگی۔ ہم کلامی جاری تھی۔ ہاتھ سویٹر میں ڈالے ہوئے وہ کمرے سے نکل آئی۔ کہنی میز پر پڑے پاکیزہ کے بیگ سے متصادم ہوئی اور وہ شور کی آواز پیدا کرتا نیچے گر گیا۔"

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



کتابوں سے ایسا شور۔۔۔وہ تھوڑا حیران ہوئی۔

پنجوں کے بل نیچے زمین پر بیٹھ کر بیگ کھولا۔نیم اندھیرے صحن میں اس کی آنکھیں چندھیا گئی۔

یہ بہت خوبصورت سلور کی ٹرافی تھی جس کے حصوں کو الگ الگ کر کے زبردستی بیگ میں پورا کیا گیا تھا۔

"بھائی اٹھ کر نہیں آیا تو کیا ہوا؟ میں تسکین تھی وہ پاکیزہ ہے۔میں عام سی تھی وہ بہت خاص ہے۔یہ اس نے زندگی کو جو ہے جیسے ہے کی بنیاد پر قبول کر لیا۔اس نے پلکوں پر خواب ٹکا کر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رکھی ہیں۔اس کا جینے پر مجھ سے زیادہ حق ہے''

شہادت کی انگلی کا رخ ہتھیلی کی طرف موڑ کر اس نے پاکیزہ کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

دروازے کے پار نارمل سے تاثرات لئے سوچتی کالی آنکھیں اکتا گئی۔بہر حال وہ دروازہ کھول کر سامنے کھڑی ہو گئی۔

"سوری پاکیزہ۔۔۔میں بہت پریشان تھی۔بیٹا مجھے پتا ہی نہیں چلا۔تم آئی تو پریشانی میں میرے منہ سے غلط سلط نکل گیا حالانکہ میں جانتی ہوں تم میں کوئی خرابی نہیں ہے۔تم تو بہت شاندار بیٹی ہو، ان فیکٹ میری بیٹی ہو۔تم نہ ہوتی تو اید میرے پاس جینے کا جواز ہی نہیں تھا۔"سارا پیار ایک ہی دفعہ میں امڈ کر سامنے آیا تھا۔

کسی صلاحیت کا سنہرا رنگ کیوں ضروری ہوتا ہے؟ صرف اپنائیت کے اجلے پن سے گزارا کیوں نہیں کیا جاسکتا۔ہم انسانوں کو ان کی صلاحیتوں کی وجہ سے قابل کیوں جانتے ہیں؟ ہم ان کو انسان ہونے کے ناطے عزت کیوں نہیں دیتے؟ ہم ان سے جڑے اپنے تعلق کو اہمیت کیوں نہیں دیتے؟ سوال اندھیرے میں سیاہ حاشیہ بناتے معدوم ہو رہے تھے۔

"اٹس اوکے" پاکیزہ کے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ تھی۔اس پر ان الفاظ کا کچھ خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ان الفاظ کی ضرورت اسے تھوڑی دیر پہلے تھی جسے کسی اور نے پورا کر دیا۔ضرورت پوری ہو گئی تھی اب میزبان سے فرق نہین پڑتا تھا۔سب سے پہلے جو مرہم لگاتا ہے وہی طبیب یاد رہتا ہے۔

"تسکین پھوپھو نے اسے گلے سے لگایا ہوا تھا پاکیزہ کے ہاتھ البتہ بالکل سیدھے تھے۔وہ تسکین کے وجود کے گرد لپٹے ہوئے نہیں تھے۔روشنی آہستہ آہستہ کرتے اب مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی!"

☆☆☆☆☆☆

اس شہر میں کتنے چہرے تھے کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
اک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص زبانی یاد ہوا

انسان تنہا کچھ بھی نہیں جیسے جیسے شعور کی سیڑھی پہ قدم رکھتا ہے تو کچھ اختلافات اس کے اندر جنم لیتے ہیں، کچھ لوگوں کے بارے میں رائے قائم ہو جاتی ہے۔بھری دنیا میں کس کو فکر ہے کہ کسی ایک کے خیالات سنے۔ہم کسی رہنما کی بھی نہیں سنتے جب تک وہ

سیاستدان نہیں بن جاتا۔ ایسے خیالات کون سنے جو خام ہیں۔۔۔ جب تک یہ خیالات اندر رہتے ہیں لاوا پکتا رہتا ہے۔ ان خیالات کو بھی ایک مین ول چاہیے۔ جس کا جب چاہے ڈھکن کھول لیا جائے اور اپنے خیالات کا ریلا اس میں انڈیل دیا جائے۔

گزرتے ماہ وسال میں وہ ایک دوسرے کے لئے مین ہول ہی بن گئے تھے۔

" میں کھانا کھانے لگا ہوں"

"تم نے صبح سے پانی نہیں پیا۔ چلو دو گلاس پانی پی کر میسج کرو"

"یار ہوم ورک بعد میں کر لینا۔ پہلے میری بات سنو"

" کس کلر کے کپڑے پہنے ہیں؟"

"ٹھنڈ میں آئس کریم نہ کھاؤ۔"

"ابھی تم ساتھ ہوتی تو اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر دیتا۔"

" تم سے بات کر کے نیند اچھی آتی ہے۔"

"میں اکیڈمی کے راستے میں ہوں لیکن تم ساتھ ساتھ بات کرو"

"رات کے پہلے خواب کو سونے سے پہلے شب بخیر!"

"صبح کے پہلے خیال کو میری طرف سے صبح بخیر!"

"یہ موسم ہو، تم ساتھ ہو اور کسی دریا کنارے میں تمہیں گانا سناؤں۔"

"موسم ہے بارش کا اور یاد تمہاری آتی ہے۔"

"مجھے تمہاری بالکل یاد نہیں آ رہی۔"

مجھ کو ہیں کام کچھ اور بھی کچھ تو میرا خیال کر۔۔۔

آتے ہو جب خیال میں جاتے نہیں خیال سے

"میں ہر لڑکی کو اس امید سے دیکھتا ہوں کہ شاید تم سے بہتر ہوں لیکن واللہ جو کشش تم میں ہے وہ کسی میں نہیں۔"

"آج میں نے تمہیں خواب میں دیکھا تھا۔"

"تمہیں نہیں معلوم تم میرے لئے کیا ہو۔ تمہارے آنے سے مجھے زندگی کا مقصد مل گیا ہے۔"

"اب خواب میں ملیں گے'۔"

بن تیرے کیا ہے جینا!"

اس جیسے کئی میسجز پاکیزہ روز پڑھتی تھی اور ہنس دیتی تھی۔ یہ کیسا پاگل سا لڑکا ہے اس کا پاگل پن تو کم نہیں ہوتا، روز بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہی بات جب اس سے کہتی تو وہ کہتا

"میرا اسٹار سرطان ہے میرے اندر تمہارا پیار بھی سرطان کی طرح پھیل رہا ہے۔ اپنی جڑیں مسلسل مضبوط کر رہا ہے اور یہی سرطان ایک دن تم دیکھنا تمہیں بھی ہو جائے گا"

"ہونہہ خوش فہمیاں! پاکیزہ زور سے سر جھٹکتی اور ایک ہی پل میں سارے ڈائیلاگ دماغ سے محو ہو جاتے۔ یاد رہتا تو فقط اتنا کہ میں نے بہت اونچا اڑنا ہے۔ یہ اور بات کہ وہ وزن بھی اٹھائے رکھنا چاہتی تھی۔"

☆☆☆☆☆☆

میں معتبر ہوں اپنے قبیلے میں اس لئے

منانؔ میرے تن پہ وفا کا لباس ہے

بہار کی آمد کی چاپ درختوں پر نئی کونپل بن کر دکھائی دے رہی تھی۔ زرد ہوتے پتے شاخوں سے گرتے جا رہے تھے اور زمین کو چوم رہے تھے۔ وہ ان پتوں کو اپنے قدموں سے چرمراتی ہوئی فون کان سے لگائے کھڑی تھی۔ تیسری بیل پر فون اٹھالیا گیا۔

"یہ پہلی بار ہوا تھا۔ اس نے آفتاب کو خود فون کیا تھا۔ پیپر کے دوران بھی اس کا دھیان آفتاب میں اٹکا رہا تھا۔ پہلے پہل کوئی بات ہوتی ہے تو تھوڑا عجیب لگتا ہے اور پھر اسی عجیب بات کی عادت ہو جاتی ہے۔"

"آفتاب میرا پیپر ہو گیا ہے، بہت اچھا ہوا ہے۔ خوشی سے اس کے گال تمتما رہے تھے۔"

سورج کی سنہری کرنیں اس کے سرخ ہوتے گالوں کو چومنے لگیں۔ قدموں تلے فگار ہوتے ہوئے پتے بھی ست رنگ بہار دکھانے لگے حالانکہ پاکیزہ اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔ پاکیزہ ابھی بھی اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔"

"پاکیزہ وہ شائلہ باجی کے بیٹے نومیر کو ہسپتال لے کر گئے ہیں۔ وہ چھت سے گرا ہے۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز لڑکھڑاہٹ سچائی کی شاہد بنی۔"

بس پل بھر کی بات تھی حالانکہ پاکیزہ آفتاب سے محبت نہیں کرتی تھی۔ اس نے کبھی بھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کے گالوں کی سرخی فوراً سانولاہٹ میں بدلی۔ پتوں نے قدموں تلے شور سا برپا کر دیا۔ پیپر تیاری سب دماغ سے نکل گیا۔ کچھ اس کے حلق میں آ کر اٹک گیا۔

"نمیر کو لے کر گئے ہیں؟ زیادہ چوٹ لگی ہے؟"

اس نے بھی لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

"ہاں دوسری منزل کی چھت سے سر کے بل گرا ہے۔ ابھی پانچ سال کا تو ہے۔ اتنا خون نکلا ہے۔ ڈاکٹرز بالکل بھی پُر امید نہیں ہیں ۔ تم دعا کرو۔ مجھے اور کسی پہ یقین نہیں ہے۔ کسی کا پتا نہیں ہے لیکن تم تو بہت اچھی ہو۔ اگر تم دعا کرو گی تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ تو اس سے محبت کرتا تھا۔ ہر بڑے چھوٹے موقع پر اظہار کرتا تھا۔ اپنے یقین کا کشکول اس کے آگے پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔"

"ہاں میں کروں گی دعا۔ تم پریشان نہ ہو۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر خون نہ نکلتا تو بات پریشانی کی تھی۔ خون بہہ جانا اچھا ہوتا ہے۔ وہ پتا نہیں کہاں سے ہمت لائی تھی۔"

"لیکن پاکیزہ ڈاکٹرز نے ہاتھ اٹھالیا ہے۔ باجی اس نومیر کے سر پر ہی بس رہی ہیں۔ بھائی کو دونوں بچیوں سے تو کوئی ہمدردی نہیں۔ آفتاب کے لہجے میں پھر حساس بھائی بولا۔"

پاکیزہ کو رشک آیا۔

"خواہ مخواہ کے وسوسے نہ پالو۔ ڈاکٹرز نے ہاتھ اٹھالیا تو کیا ہوا؟ اللہ جی تو کبھی ہاتھ نہیں اٹھاتے، وہ کبھی تنہا نہیں چھوڑتے۔ دعائیں تقدیر بدل سکتی ہیں۔ دعا کرو، صدقہ دو، صدقہ مصیبت کو ٹالتا ہے۔ اس نے ہمت بندھائی۔"

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو تم دعا کرنا اس نے پھر تلقین کرنا ضروری سمجھا اور فون رکھ دیا گیا۔"

موسم کی خنکی بڑھ گئی تھی۔ پاکیزہ نے بازو سینے پر باندھ کر سرد ہاتھ انہی میں چھپا لئے پھر ڈوبتے سورج کے رنگ دیکھنے لگی۔

☆☆☆☆☆☆

اس بستی پر چاند کا پہرہ رہتا ہے

اس بستی میں کچھ دل والے بستے ہیں

آنکھیں کتنی سچی ہوتی ہیں۔۔۔ ایسے جیسے آئینہ !

ہم اپنے اندر جھانک کر جن سوالوں کے جواب نہیں ڈھونڈ سکتے۔ وہ ان آنکھوں میں خود اتر آتے ہیں پھر ہم لاکھ نظر سے نظر چرائیں، حقیقتیں ہمارے اردگرد قہقہے لگاتی رہتی ہیں۔

اپنا عکس آئینے میں دیکھ کر وہ خود ہی پریشان ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولی اور ہتھیلیوں میں پانی بھر کر آنکھوں میں ڈالا۔ حقیقتیں ابھی بھی ہنس رہی تھیں۔ تولیے سے اپنا منہ تھپتھپاتے ہوئے وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ گھر پہنچتے پہنچتے مغرب ہو چکی تھی۔

اس نے تسکین پھوپھو کا سوال کیا ہوا نظر انداز کیا اور فوری وضو کرنے گھس گئی۔ اب باہر نکل کر جائے نماز بچھا رہی تھی۔

نماز پڑھ کر بس سو جاؤ۔ ریسٹ کرو کل بھی ساری رات جاگتی رہی ہو۔ تسکین پھوپھو کو اس کی سرخ آنکھوں سے فکر لاحق ہو رہی تھی۔ وہ کسی اور کی فکر میں غلطاں تھی۔

سر اثبات میں ہلاتے ہوئے جائے نماز پر کھڑی ہو گئی۔ پھوپھو باہر نکل گئی۔ اس نے فرض نماز پڑھی اور سلام پھیرا۔ دعا ہاتھ کے لئے اٹھانے لگی مگر آنکھوں میں نمی در آئی۔ وہ نوافل ادا کرنے لگی۔

میں نیت کرتی ہوں اس نماز کی۔۔۔ دو رکعت نفل حاجتِ شفاء۔۔۔ خاص اللہ تعالی کے واسطے۔۔۔ میرا منہ خانہ کعبہ شریف کی طرف۔۔۔ اللہ اکبر!

دو، چار، چھ آٹھ، دس۔۔۔ نفل پڑھ کر اس کے دل کو کچھ کچھ سکون ملا۔

اللہ جی بہت گناہ گار ہوں لیکن آج اپنے لئے کچھ نہیں مانگ رہی۔ میں تو ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں جن کو سب کچھ بنا مانگے مل جاتا ہے۔ اللہ جی میں اس بچے نومیر کی زندگی مانگتی ہوں۔ خون جتنا بھی بہہ نکلا ہو روح تب تک نہیں نکلتی، جب تک اللہ کا حکم نہ ہو۔ آپ اس کی روح کو اتنی جلدی واپس نہ بلائیں۔ اسے اپنی ماں کے دل کا چین اور آنکھوں کی ٹھنڈک بننے دیں۔ اللہ جی اسے زندگی دیں جیسے آپ زمین کو زندہ کرتے ہیں اور اس میں پھل اگاتے ہیں۔ اسے بھی اپنے والدین کے لئے باثمر کر دیں۔

اللہ جی! آپ کو حضرت ایوب کے صبر کا واسطہ! اسے شفاء کاملہ عطا کریں۔ ایسی شفاء جس میں بیماری کی کوئی جھلک نہ ہو اللہ جی مانا میں بہت بری ہوں۔۔۔ میرا اس بچے سے کوئی تعلق بھی نہیں لیکن میرا تعلق آپ سے تو ہے آپ کے کلام سے تو ہے۔ اللہ جی آپ کو اپنے بابرکت کلام کا واسطہ! جسے آپ نے اپنے پیارے نبی ﷺ پر اتارا، جسے آپ نے حافظین کے حافظے میں شامل کیا، ہماری دعاؤں اور ہماری نماز کا حصہ بنایا، جس کی حفاظت اپنے ذمہ لی، آپ کو اس شاندار کلام کا واسطہ! اس بچے کو زندگی عطا کریں۔ اس کی زندگی کی حفاظت کریں۔ اس وقت دنیا کے نجانے کتنے سر آپ کے آگے جھکے ہوں گے اور آپ کو اپنی جانب متوجہ کر رہے ہوں گے۔۔۔ اللہ جی لیکن آپ تو رب ہیں ناں سب کا پالنے والا۔۔۔ آپ کو معلوم ہے کہ کس دعا کا قبول ہونا کس کے حق میں کیسا ہے۔ میں اس دعا کو شمائلہ باجی کے حق میں بہترین سمجھ کر مانگ رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں موسیٰؑ جب حضرت خضر کی رہنمائی میں ایک جگہ پہنچے تو چھوٹے بچے کو مار دیا تھا وجہ صرف یہ تھی کے اس کے والدین صالح تھے، ان کو اس اولاد سے بہتر اولاد سے نوازنا مقصود تھا۔

"اللہ جی! شمائلہ باجی کے حق میں نومیر کو ہی بہترین بنا دیں، اسے نئی زندگی دے دیں۔ اللہ جی! معجزہ کر دیں۔۔۔ سارے معجزے آپ کے کن کے منتظر ہیں۔ اللہ جی! دعاؤں کو قبول کر لیں۔"

بہت آنسوؤں کے ساتھ وہ رب کے حضور گڑگڑا کر اب درود شریف پڑھ رہی تھی۔ اپنی دعاؤں کو پر بھی تو لگانے تھے۔ نام محمد ﷺ آنے پر اس نے اپنی انگلیوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا۔

کمرے کے باہر سے گزرتی ہوئی تسکین نے اسے ابھی تک جائے نماز پر بیٹھا دیکھ کر اندازہ لگایا۔

یقیناً آج پیپر ٹھیک نہیں ہوا۔

☆☆☆☆☆☆

تری خوشبو نہیں ملتی، ترا لہجہ نہیں ملتا

ہمیں تو شہر میں کوئی ترے جیسا نہیں ملتا

"پاکیزہ نومیر اب خطرے سے باہر ہے"۔ "وہ ہاسپٹل سے ابھی باہر نکلا تھا اور پہلا فون پاکیزہ کو ہی کیا تھا۔

شمائلہ باجی آفتاب کے لیے بھی پریشان ہو رہی تھیں۔ وہ رات سے ان کے ساتھ ہی تھا۔ جیسے ہی ڈاکٹر نے تسلی آمیز الفاظ کہے شمائلہ باجی نے اسے گھر جانے کو کہا۔ ویسے بھی اب بڑے بھائی آنے والے تھے۔

"اللہ جی آپ کا شکر ہے۔ اللہ جی آپ کا شکریہ۔ وہ مزید اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آواز میں شکر ہی نمایاں تھا۔ اللہ اسے ہمیشہ نوازتا تھا۔"

"تھینک یو یار۔۔۔ تم میری گڈ لک ہو۔ تمہیں مسئلہ بتاؤں تو مسئلہ فوری حل ہو جاتا ہے۔ تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو یہ مشکل وقت کاٹنا کٹھن ہو جاتا۔ تمہاری دعاؤں کا بہت شکریہ۔" وہ فرطِ جذبات سے کپکپاتی آواز میں بولا۔

اس نے پاکیزہ کی جذب میں کی گئی دعا نہیں سنی تھی لیکن اس کی صدق دلی کا ہمیشہ کی طرح گرویدہ ہوا تھا۔

" اوہو۔۔۔ کوئی بات نہیں شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔ اب تم گھر جا رہے ہو۔ گھر جا کر کھانا کھاؤ اور ریسٹ کرو۔"

پاکیزہ نے اسے تسلی دی۔

"ہاں بس گھر ہی جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر نے تسلی دی تو باجی نے مجھے گھر جانے کو کہہ دیا" آفتاب اس سے بات کرتا بائیک کے قریب آ گیا۔

تیز ہوائیں درختوں کو چھو رہی تھیں ایک درخت کے سائے میں آئس کریم والا کھڑا بچوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے موسیقی کا استعمال کر رہا تھا۔

"کیا باجی ادھر ہسپتال ہی ہیں؟ ارے وہ بھی تو کل رات سے گھر نہیں گئی، تم انہیں بھی گھر لے کر جاؤ" پاکیزہ آفتاب کی لاپرواہی پر حیران ہوئی۔

میں نے ان سے کہا تھا۔ وہ مان ہی نہیں رہی۔

چھوٹی سی بچی اپنے والد کا ہاتھ کھینچتے آئس کریم والے کے پاس آئی۔ لڑکی کا والد اکتائے ہوئے انداز میں آئس کریم والے کو دیکھ رہا تھا۔ بچی کی مسکراہٹ مشروط تھی اور آنکھوں میں آئس کریم نہ لے پانے کا ڈر ہلکورے لے رہا تھا۔

"وہ تو ماں ہیں۔۔۔ وہ بھلا کیسے مان سکتی ہیں۔ تمہیں انہیں زبردستی ساتھ لے جانا پڑے گا ورنہ ایسے تو وہ اپنی طبیعت خراب کر لیں گی جاؤ اور انہیں بھی گھر ساتھ لے کر جانا۔" پاکیزہ نے اب اسے ڈپٹ کر کہا تھا۔

آفتاب مسکرایا اور سر تسلیم خم کر کے فون رکھ دیا۔

بچی اپنے والد کو آئس کریم لے کر دینے پر راضی کر چکی تھی۔ آئس کریم ملی تو اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام لی اور باپ کا ہاتھ چھوڑ دیا!

ہوا نے بنتِ حوا کے سفر کے پڑاؤ دیکھے اور مسکرانے لگی۔ یوں ہی تو مرد کا نگہبان مقرر نہیں کیا گیا۔ وہ بھی ریجھ جاتا ہے لیکن عورت سے کم۔

آفتاب نے میسج ٹائپ کیا اور پاکیزہ کو بھیج دیا۔

"میں نے سکول کی تمام تصویریں سکین کر کے موبائل میں رکھی ہیں۔ تمہاری ششم کلاس کی تصویر جس میں تم نے براؤن کلر کا فراک پہنا ہے اور دو پونیاں بنائی ہیں۔۔۔ وہ اتنی پیاری ہے کہ لگتا ہے براؤن کلر بنا ہی تمہارے لئے ہے۔ اس کے سب شیڈز تم پر حسین لگیں گے۔ پچھلی رات میں نے تمہارا ہر شیڈ میں تصور کر کے ہی وقت گزارا ہے۔"

پاکیزہ نے مسکراتے ہوئے پیغام پڑھا اور اپنی وارڈروب کھول کر دیکھنے لگی۔

☆☆☆☆☆☆

چند لمحے جو تمہیں یاد نہیں ہوں گے مگر

وہ ہمیں جان سے پیارے ہیں تمہیں کیا معلوم

وقت کا پرندہ گھونٹ گھونٹ زندگی کے سمندر سے پانی پیتا رہا اور عمر گھٹتی رہی۔ نجانے کیسا پرندہ تھا اور کیسی پیاس تھی کہ روز بروز بڑھتی ہی جانے لگی۔ پہلے ایک گھونٹ میں ہفتہ آتا تھا پھر ایک گھونٹ میں مہینہ سمانے لگا۔ پریشانیاں تھی کہ بڑھتی ہی جاتی تھیں۔ **سلجھنیں** آنے لگتی تھیں کہ الجھ ہی جاتی تھیں۔

"میں الجھا ہوا ہوں۔ مجھے نہ چھیڑو۔ وہ واقعی پریشان تھا۔"

"تمہیں نہیں چھیڑوں گی تو کس کو چھیڑوں گی؟ اب دوستی ہو گئی تھی۔ وہ تقاضے نبھا رہی تھی۔ اس کی پریشانی کی وجہ بھی جانتی تھی۔"

"تمہیں تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ خوب مزے لے سکتی ہو، مذاق اڑا سکتی ہو۔ حُسن کو اجازت ہے جو چاہے ستم کرے۔ آفتاب کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا ہوا تھا۔"

"میں امتحان سے پہلے پریشانی لیتی ہوں۔ امتحان کے بعد بس نتیجے کا انتظار کرتی ہوں۔ پریشانی کا وقت پہلے تھا اب دعا کا وقت ہے۔ تم پہلے دعائیں کرتے رہے کہ خود ہی تمہیں سب آجائے، ساری کتابیں رٹ جائیں اور اب تم دعاؤں کے پریشانی لے رہے ہو۔ وہ ناک سے مکھی اڑا رہی تھی۔"

"اچھا ایک کام کرو؟ وہ ہمیشہ کی طرح فریادی بنا۔"

سارے کام میں ہی کروں۔ تم خود کچھ کیوں نہیں کر لیتے؟ اپنے رزلٹ کے لیے وہ ایکسائیٹڈ تھی۔ اس کی باتوں سے سمجھ آ رہا تھا۔

"میں تمہیں اپنا رولنمبر بھیجوں گا۔ میرا رزلٹ تم دیکھنا۔ ہمیشہ کی طرح عجیب سی خواہش

"اگر تم اس لئے اپنا رول نمبر بھیج رہے ہو کہ پھر میں تمہیں بتاؤں گی تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں کہ اپنا رول نمبر کسی کو دے دوں۔"

"تمہیں کس نے کہا تم کوئی اور ہو۔"

"کوئی اور تو ہوں لیکن بات صرف عقل کی ہے جو تمہاری کام نہیں کرتی۔"

"دل تو کام کرتا ہے ناں؟ تمہیں پتا ہے پاکیزہ تم میری خوش قسمتی ہو۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں میرا رزلٹ تم دیکھو۔"

اسے کسی نے کبھی قسمت نہیں سمجھا تھا اور وہ اسے خوش قسمتی قرار دے رہا تھا۔ پاکیزہ کو لگا اس کے اَن دیکھے پر نکل آئے ہو اور یہ پر اُسے ہوا کے دوش پر نیلے گگن کی سیر کروائے جا رہے ہیں۔ اس نے بے ساختگی سے اپنے کان کی لو کو چھوا۔ ہوش و حواس قائم تھے بھی اور نہیں بھی۔ ہمیشہ کی طرح بے یقینی نے سر اٹھایا۔

"اور اگر تم فیل ہو گئے؟"

"تمہارے منہ سے سنوں گا تو اتنا دکھ نہیں ہو گا۔"

"اتنی شدتوں کے جواب میں اپنے حواس پر قابو پانا مشکل تھا لیکن وہ پا چکی تھی۔"

"پاکیزہ"

"ہاں"

"ایک بات کہوں"

"اجازت تو مجھ سے ایسے لیتے ہو جیسے میں منع کر دوں گی تو واقعی نہیں بولو گے"

"ہاں اگر تمہیں میرا بولنا پسند نہیں ہے تو میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاؤں گا۔ سارا زور ہمیشہ پر تھا۔"

"فضول مت بولو۔ کہو جو کہنا ہے؟" پاکیزہ نے فوراً ڈپٹا۔

"اس کا اکلوتا دوست تھا اتنی پرواہ کا حق تو رکھتا تھا۔ "

"کوئی اور تمہیں دیکھے تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ وہ حق جتا رہا تھا۔"

"مطلب؟ وہ جانتے ہوئے بھی انجان بنی۔"

"یہ سچ تھا اسے چار دیواری کی چاہ تھی لیکن بینائی چھن جائے۔۔۔ یہ وہ کبھی نہیں چاہتی تھی!"

"کیا ایسا ممکن ہے کہ پینٹنگز کے جو مقابلے لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان ہو۔ تم ان میں حصہ نہ لو بہت چھوٹی سی عمر میں وہ اسے ان دیکھی زنجیروں میں جکڑ رہا تھا۔"

ایک گھنٹہ مکمل ہو چکا ہے آفتاب۔ وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔

"اچھا اس بات کا جواب تو دو۔ تم کچھ ایسا نہیں کر سکتی کہ مخلوط مقابلوں میں حصہ نہ لو۔ تمہاری پینٹنگ کو جب سراہا جاتا ہو گا تو نہ جانے کتنے لوگ تمہیں دیکھتے ہوں گے۔ کتنی نظریں تمہارے اندر تک اترتی ہوں گی مجھے یہ سوچ کر بھی وحشت ہوتی ہے۔ میں پاگل ہوتا ہوں۔ راستہ ملتے ہی پانی نے راستہ بنایا۔"

"تم پاگل ہوتے نہیں ہو۔۔ تم پاگل ہو! اللہ حافظ۔" وہ فون رکھ چکی تھی۔

"پانی کے آگے بندھ باندھ کر اس نے آنکھیں موند لی۔ فیصلہ ہو گیا اسے فیصلہ ہی تو کرنا آتا تھا۔ فیصلہ صحیح یا غلط؟ اس کا انداز تو پرندہ !لگاتا۔۔ وہی پیاسا پرندہ۔۔۔"

☆☆☆☆☆☆

میں کسی پرچھائیں کے پیچھے نکل جاؤں گا جب
تو گلی کوچوں میں مجھ کو ڈھونڈتا رہ جائے گا
بدگماں ہو کر بچھڑ جانے کا اس کے غم نہ کر
اب تو مل کر بھی دلوں کا فاصلہ رہ جائے گا

کمپیوٹر آن کیا تو ساتھ ساتھ درود شریف کا ورد کرتی رہی۔

تھکا ہوا کمپیوٹر آن ہونے میں اتنا ہی وقت لگاتا ہے جتنا ناراض محبوب ماننے میں لگاتا ہے !

اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کمپیوٹر کو دیکھا۔ دل میں تھوڑا سا ڈر تھا اور بہت زیادہ اشتیاق۔۔۔

وہ زندگی کے لیے ہمیشہ متجسس رہی تھی کہ زندگی اس کے لیے کیا لانے والی ہے۔ وہ کمرے سے باہر آئی۔ صرف اپنی ذمہ داری ہی نہیں تھی، کسی اور نے اپنا بوجھ بھی ڈالا تھا۔ خود کو ہلکا کرنے کے لیے وضو کیا تھا۔

لمبی پلکوں پہ پانی کے قطرے ستاروں کی طرح اٹکے ہوئے تھے۔ لب تجسس سے لرزنے لگے۔ اپنے رزلٹ کی فکر بالکل نہیں تھی۔ اس نے اپنا بہترین دے دیا تھا۔ اب اسے صرف پھل کا انتظار تھا۔ دو نفل حاجت کی نیت باندھی نفل پڑھ کر سلام پھیرا تو نظریں مانیٹر کی سکرین پر چلی گئی۔ کہیں محبوب مان چکا تھا۔ اپنے قیاس پہ ہلکی سی مسکراہٹ لبوں کے کونوں کو چھو گئی۔ سانولی رنگت میں وقت کی لالی نے سرخیاں گھول دی تھیں۔

"اب وہ دعا مانگ رہی تھی۔ سونی کلائیاں سونے کی طرح دمک رہی تھیں۔"

"اللہ جی! آفتاب پاس ہو جائے۔۔۔ آپ چاہیں تو کیا نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی ہو ہی سکتا ہے۔ مجھے نہیں پتا وہ نکما ہے یا قابل ہے۔ میں نہیں جانتی کہ مجھے اس کے لیے دعا کرنی چاہیے کہ نہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ اس کے پیپرز واقعی ایسے ہوئے ہیں کہ جیسے اس نے مجھے بتائے لیکن آپ تو رب تعالی ہے۔ آپ سے تو کچھ بھی مخفی نہیں ہے۔ آپ اسے اپنی رحمت کے دریا سے ایک بوند دے دیں۔ اس امتحان میں سرخرو کر دیں۔ آپ تقدیر بدل سکتے ہیں، آپ چاہیں تو اس دنیا میں ہوئی چیزیں لوگوں کو بھول جائیں۔ رزلٹ ابھی بھی بدل سکتا ہے اگر وہ اس کے حق میں بہتر نہیں ہے تو اسے بہتر کر دیں۔ آمین!"

دعا سے مطمئن ہو کر اس نے اپنے ہاتھ چہرے پر پھیرنے ہی تھے کہ ایسی بے وقوفی پر تاؤ آ گیا۔ وہ پھر اپنے سچے دوست سے مخاطب ہوئی۔

"اے میرے اللہ، اے سارے جہانوں کے پالنے والے میں آپ کی رحمت پر اتنا یقین رکھتی ہوں کہ مجھے لگتا ہے آپ مجھے مانگے بغیر بھی دے دیں گے حالانکہ میں بے وقوف جانتی ہوں کہ مانگنے سے انسان آپ کے اور بھی قریب ہو جاتا ہے۔ اللہ جی! میرے دونوں ہاتھ آپ کے سامنے پھیلے ہوئے ہیں۔ میں آپ کی بزرگی و برتری کو تسلیم کرتی ہوں۔ اللہ جی میں آپ سے اپنے لیے بھی خیر مانگتی ہوں۔ میرے رزلٹ کو میرے حق میں بہترین کر دیں۔ جو آپ چاہتے ہیں میری تقدیر میں وہ لکھ دیں اور مجھے اپنے مقدر پر صابر و شاکر کر دیں۔ آمین!"

تجسس کی مسلسل دستک وہ نظر انداز نہ کر پا رہی تھی۔ اپنے رول نمبر سے پہلے اس نے آفتاب کا رول نمبر درج کیا۔ گول چکر گھومتا ہوا کمپیوٹر کی سکرین پہ ویب سائٹ کی مصروفیت کا اشارہ دے رہا تھا اور پاکیزہ کا دل اللہ کو یاد کر رہا تھا۔

"رزلٹ دیکھ کر پہلے تو وہ حیران ہوئی اور پھر اس کے دل کو تاسف نے گھیر لیا۔ آفتاب سب مضامین میں پاس تھا سوائے ایک کے اور وہ ایک اسلامیات تھا۔ اس نے اب اپنا رول نمبر درج کیا، دل یکبارگی زور سے دھڑکنے لگا، ساری لاپرواہی اڑن چھو ہو گئی، ڈر لگنے لگا، رزلٹ سکرین پہ کھل چکا تھا۔ پاکیزہ کے پانچ سو پچاس میں سے چار سو اٹھانوے نمبر تھے۔ وہ ٹھیک جا رہی تھی اسے ایسا ہی جانا تھا۔ دل اس خوشی پر خوش نہ تھا۔ ایک دکھ کی لہر خوشی پر دبیز تہہ بیٹھا چکی تھی۔"

موبائل فون کی ٹون اسے خیالات کی رو سے واپس حقیقت میں لائی۔ آفتاب کا فون تھا۔

"ہیلو! پاکیزہ کیا بنا؟ آواز میں گھلا تجسس نتیجے سے لاعلمی کا گواہ بنا۔"

"اسلام وعلیکم! پاکیزہ نے پھر اپنے طریقے سے بات کا آغاز کیا۔ وہ پھر چاروں شانے چت ہوا۔"

"وعلیکم السلام! رزلٹ دیکھا۔ تجسس بہر حال برقرار تھا۔"

"ہاں جی! باقی سب میں پاس ہو لیکن وہ۔۔۔"

"ہاں بتاؤ ناں؟ کیا ہوا؟"

"تمہاری اسلامیات میں سپلی ہے۔"

"مجھے پتا تھا یہی ہو گا۔ اسلامیات میں بھی بھلا کوئی فیل ہوتا ہے لیکن میں ہوا۔ میں تو ہوں ہی۔۔۔ دلبر داشتگی اس کے انداز سے جھلک دکھانے لگی"

"میں نے کہا تھا مجھے مت کہو رزلٹ دیکھنے کو۔ اب آرام ہے؟ بہت خوش قسمتی خوش قسمتی کہہ رہے تھے۔ اب کیا خیال ہے؟ پاکیزہ کو بہت طریقے سے اس کی ذہنی حالت کو سنوارنا تھا۔"

"خوش قسمتی تو ہو تم۔ میں خود دیکھتا رزلٹ تو سارے سبجیکٹس میں فیل ہوتا اور صرف اسلامیات میں پاس ہوتا۔ تمہاری وجہ سے اکاؤنٹنگ میں بھی پاس ہو گیا ہوں۔ وہ شکریہ ادا کرنے لگا۔"

"اچھا اب میں پھوپھو کو فون کر کے رزلٹ بتا دوں۔ پاکیزہ کو یاد آیا کہ وہ اکیلی نہیں رہتی۔"

"انہیں میرا رزلٹ نہ بتانا۔ آفتاب ایک دم چوکنا ہوا۔"

"تمہارا رزلٹ کون بتا رہا ہے؟ میں اپنا بتاؤں گی۔"

"اوہ سوری! مجھے یاد نہیں رہا۔ تمہارے کتنے نمبر آئے ہیں؟ آفتاب کو اپنی بے وقوفی پر تاؤ آیا۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ چار سو اٹھانوے نمبر ہیں کاش پورے پانچ سو آ جاتے۔ پاکیزہ نے لمبا سا کاش کہتے ہوئے منہ بنایا"

"حق ہاہ! اے اللہ! تیری دنیا میں کیسے ناشکرے لوگ بستے ہیں۔ میں ایک پورے مضمون کو رو رہا ہوں اور اس بندی کو دو نمبروں کا افسوس ہے۔" آفتاب نے اسے چھیڑا۔

"اچھا لمبیاں نہ لگاؤ۔ یہ تمہارا وقت نہیں ہے۔ اللہ حافظ۔" پاکیزہ نے فون رکھ دیا۔

"فون کاٹتے ہی وہ پھوپھو کا نمبر نکالنے لگی جتنی دیر میں وہ نمبر نکالتی، پھوپھو کا فون خود ہی آ گیا۔"

"ہیلو پاکیزہ! تمہارا نمبر بزی جا رہا تھا۔ کیا بنا رزلٹ کا؟"

"دوست کی فون آئی تھی، رزلٹ کا ہی پوچھ رہی تھی۔ میرے چار سو اٹھانوے نمبر ہیں۔"

"چلو شکر ہے! مبارک ہو! میں گھر آتی ہوں پھر بات ہو گی۔ فون رکھ دیا گیا تھا۔"

"پاکیزہ اس رسمی سی مبارک کے جواب میں خیر مبارک بھی نہ کہہ سکی۔ اسے بہت افسوس ہوا۔ اس سے کئی بہتر تھا کہ وہ آفتاب سے ہی بات کر لیتی۔ کم از کم وہ اس کی خوشی کو سلیبریٹ تو کرتا۔"

☆☆☆☆☆☆

سانسوں میں بسے ہو تم آنکھوں میں چھپا لوں گا
جب چاہوں تمہیں دیکھوں آئینہ بنا لوں گا

"میں بہت پریشان ہوں۔ مجھ سے مت پوچھو۔ مجھے بس میرے حال پہ چھوڑ دو۔ آفتاب کی آواز سے واقعی پریشانی کی گونج سنائی دے رہی تھی۔"

" اس بات کو تم اپنے آپ سے لگا کر رکھو گے تو ایسے ہی پریشان ہو گے مجھ سے شئیر کرلو گے تو ایزی ہو جاؤ گے۔ اس نے کریدا۔

"کیا بتاؤں؟ اس سے اچھے تو وہ دن تھے جب ہمارے گھر میں کھانے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کم از کم سب ساتھ تو تھے، اب ساتھ رہ کر بھی ساتھ نہیں ہیں۔ بھائی بھائی نہیں رہے، بھابیوں کے شوہر ہو گئے ہیں۔ داخلہ فیس بھیجنی ہے اسلامیات کے پیپر کی لیکن پیسے ہی نہیں ہیں۔ مانگوں کا تو بھابیاں بولنے لگ جائیں گی۔ اس پہ لگانے کی کیا ضرورت ہے پڑھنا تو اس نے ویسے بھی نہیں۔ وہ پھٹ پڑا۔"

"بات تو ان کی بھی ٹھیک ہے تمہیں دل لگا کر پڑھنا چاہیے تھا۔ یہ کوئی طریقہ تو ہے نہیں کہ بندہ اسلامیات میں فیل ہو جائے اور پیسے تم نے ضروری بھائی سے مانگنے ہیں؟ اپنی امی سے مانگ لو۔ پاکیزہ نے اپنی نظر میں اس کے گھر کے حالات دیکھتے ہوئے مشورہ دیا۔

"امی کے پیسے کہاں ہیں؟ سارے گھر پر تو بھابیوں کا راج ہے۔ سودا سلف لینے بھی وہ بھائیوں کے ساتھ خود جاتی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں"

"کسی دکان پہ بیٹھنا شروع کر دوں۔ تھوڑے پیسے تو میرے ہاتھ میں آئیں گے۔" وہ روہانسے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"پاکیزہ کو لگا وقت کی گردش اسے دو سال پیچھے لے گئی ہے اور آفتاب اس کے سر پر کھڑا رو رہا ہے۔ "

"کیا مطلب تم پڑھائی چھوڑ دو گے پھر کیا کرو گے؟ کبھی سوچا ہے تمہارا لائف سٹائل کیا ہو گا؟ تمہارے بھائی کتنی اچھی پوسٹس پر کام کر رہے ہیں اور تم دکان پر بیٹھنا چاہتے ہو؟ پاکیزہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔"

"ان کی اچھی پوسٹس میرے کس کام کی ہیں؟ مجھے وہ کیا دیتے ہیں؟ بائیک پیٹرول۔۔۔ اپنی ضرورت ہو تو گاڑی۔۔ بھابی اور بچوں کا نوکر بنا کر رکھا ہوا ہے فیس تو دے نہیں سکتے۔ اس سے کہیں زیادہ بہتر یہی ہے کہ میں چھوڑ دوں۔" وہ قطعیت سے بولا۔

"پاکیزہ کو اس کے زاویہ نظر پہ افسوس ہوا۔ کتنے میں جائے گا ایڈمیشن؟"

"بارہ سو میں وہ جواب دے کر پہلے خاموش ہوا پھر بولا تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"پیسے مجھ سے لے لینا۔ پڑھائی نہ چھوڑنا۔ بارہ سو کوئی اتنی بڑی رقم نہیں ہے کہ اس کے لیے پڑھائی چھوڑ دی جائے۔ اس نے اب یہ منوانا تھا۔"

"جس کے پاس پیسے ہوں اس کو کم یا زیادہ نہیں لگتے۔ میرے پاس نہیں ہیں۔ مجھے بہت زیادہ لگ رہے ہیں۔ تم مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔ تھوڑی دیر کے ٹینشن ہے، اس کے بعد میں خود ٹھیک ہو جاؤں گا۔ میں انتظام کر لوں گا۔ "

"میرے دوست نہیں ہو؟ جس کے پاس جو چیز زیادہ ہوتی ہے وہ وہی دوسرے کو دیتا ہے۔ تم مجھے وقت دیتے ہو، فکر کرتے ہو، خیال رکھتے ہو، اپنا کاندھا دیتے ہو۔ میں صرف مادی چیز دے سکتی ہوں یہ تو تمہیں لینے ہی پڑے گی۔ وہ اپنے دراز میں رکھے ہوئے تھوڑے تھوڑے کر کے جمع کیے ہوئے پیسوں کا حساب دماغ میں لگاتے ہوئے بولی۔"

"ویسے کاندھا تو میں نے تمہیں بہت بار دینا چاہا ہے لیکن تم نے لیا نہیں حالانکہ میرا کاندھا تمہارے نازک وجود کے لیئے کافی سے زیادہ ہی ہے"۔ وہ شرارت پر اتر آیا۔

"اب فضول گوئی پر اترنے کی کوشش مت کرو۔"

"میں تو ہمیشہ سے فضول گو ہوں جیسے تم ہمیشہ سے خوبصورت ہو۔"

"یعنی تم جھوٹے بھی ہو۔"

اپنی زندگی میں ایک یہی سچ تو جانا ہے میں نے

اک خوبصورت پری کو اپنا بنانا ہے میں نے

"بے تکے شاعر! تمہارے مجموعہ ءکلام کا نام ہو گا 'پری دیو کے قبضے میں"

"تم مجھے دیو کہہ رہی ہو؟ دنیا مجھے حسین کہتی ہے۔۔۔ابھی کل امی کہہ رہی تھی کہ آفتاب کے پاؤں لڑکیوں کے پاؤں جیسے ہیں۔

"اب مجھے شک میں مبتلا نہ کرو لڑکیوں جیسے پاؤں۔۔ وہ ہنس پڑی۔"

"میں پاؤں کی رنگت کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔"

پاکیزہ کو چپ لگ گئی۔ رنگت کی بات پہ اسے آفتاب سے بات کرتے ہوئے ایسے ہی چپ لگتی تھی۔"

"کیا ہوا پاکیزہ؟"

"کچھ نہیں! اس کے پاس واقعی جواب نہیں تھا۔"

"تم بغیر نمک والے آٹے کی روٹی کھاتی ہو؟" سوال عجیب تھا۔

"نہیں"

"کبھی کھا کر دیکھنا۔ تمہیں احساس ہو گا کہ بغیر نمک کا آٹا کیسا لگتا ہے۔ تمہاری رنگت کو سنہرا بھی کہا جا سکتا ہے اور نمکین بھی۔ سفید رنگ تو پھیکا شلجم ہی ہے"۔

"میں تمہاری سائنس سے متاثر نہیں ہوئی۔"

"سب باتوں کی ایک بات۔ اگر میں آٹا ہوں تو تم میرا نمک ہو۔ تمہاری نمکین رنگت میرے من کو بھاتی ہے۔ تمہیں کیا معلوم ہے تم میرا ذائقہ ہو اور میں تمہارے بغیر بدذائقہ ہوں۔"

"وہ بہت بے تکی باتیں کر رہا تھا لیکن چاند نے دیکھا لڑکی کان سے موبائل لگائے فسوں طاری ہونے دے رہی تھی۔ لڑکی کی آنکھوں میں اترتے ستاروں کی چمک دیکھ کر چاند بھی مبہوت ہو گیا۔"

☆☆☆☆☆☆

دلِ وحشی کی یہ حسرت بھی نکالی جائے
چاندنی جتنی بھی ممکن ہو چرالی جائے

"یہ دیکھیں یہ زیادہ پیارا لگ رہا ہے پاکیزہ اپنی پسند کا کپڑا سامنے پھیلا کر تسکین کی رائے جاننا چاہ رہی تھی۔"

دکان میں موجود دکاندار اب ان کی مزید ہونے والی بحث سے پیشگی زچ ہونے لگا۔ وہ جانتا تھا جو لڑائی پہلے دو جوڑے خریدنے میں ہو چکی ہے وہی اب تیسرے میں بھی ہو گی۔

"پاکیزہ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟ یہ بھی براؤن شیڈ ہے۔ تسکین کی آنکھیں استعجاب لیے ہوئے ممکنہ حد تک پھیل گئیں۔"

"تو کیا ہوا پھوپھو؟ آپ نے مجھے فرسٹ ائیر کے رزلٹ کا گفٹ دینا ہے تو میری مرضی کا ہی دے دیں۔ میری کیا غلطی ہے؟ اگر ہر ڈیزائن اسی رنگ میں اچھا لگ رہا ہے تو۔ پاکیزہ کی ضد کی آنچ تسکین کو محسوس ہوئی۔"

"یہ نیلا رنگ دیکھو کتنا کھلتا ہوا ہے، سفید رنگ دیکھو کتنا خوبصورت ہے، بلیک کلر بھی اچھی چوائس ہے، تم پنک بھی لے سکتی ہو۔ اپنی طرف سے وہ ایک بار پھر اپنے موقف کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔"

"آپ نے نہیں لے کر دینا تو نہ لے کر دیں۔ ضد سلگتی ہوئی چہرے کا رنگ اڑانے لگی۔"

پاکیزہ ہاتھ جھاڑ کر پیچھے ہو کر آرام سے بیٹھ گئی۔

"ہونہہ میرا کیا جاتا ہے۔ اور کالی لگو گی۔ یہ بھی لے لو براؤن۔ تسکین نے ہنکارا بھرتے ہوئے باآواز بلند تبصرہ کیا۔"

پاکیزہ کی عزت نفس مجروح ہوئی۔

"میں ہی کالی لگوں گی آپ تو نہیں لگیں گی ناں؟ اس سے اچھا ہے مجھے لے کر ہی نہ دیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔"

دکاندار نے دل ہی دل میں شکر کے کلمے پڑھے۔ جو بھی تھا دو آپسی جھگڑوں کے شکار گاہک اس کی دہلیز سے اپنے جھگڑے کی نحوست لے کر جا رہے تھے۔"

"تمہاری مرضی کے کپڑے ہی لیے ہیں۔ اب ایسے منہ نہ بناؤ۔" تسکین کو پاکیزہ کے سپاٹ تاثرات دیکھ کر احساس ہوا کہ وہ بڑی ہو گئی ہے۔ دکاندار کو پیسے پکڑا کر اس نے کپڑوں کے شاپر پاکیزہ کو تھمائے۔ زبردستی کی مسکراہٹ نے پاکیزہ کے چہرے کو سجا دیا۔ دل ہی دل میں وہ کہہ رہی تھی۔"

"آپ کو کیا پتا براؤن رنگ مجھ پہ کتنا سوٹ کرتا ہے۔۔۔اس سے اچھا کوئی اور رنگ لگ ہی نہیں سکتا۔وہ کسی کے یقین کی کشتی میں دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے سوار تھی۔"

☆☆☆☆☆☆

کسی مورت جیسی صورت پر اک سایہ نور اجالوں کا

کسی چال جمال خیال کی چھب پر واہمہ پڑے غزالوں کا

سیب کاٹتے ہوئے اس کی انگلی پہ ہلکا سا زخم آیا۔سی کی آواز نکال کر اس نے اپنی انگلی کو منہ میں دبا لیا۔تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔زبان اپنے ہی خون کے ذائقے سے آشنا ہوئی۔

"یہ جو لوگ مر رہے ہوتے ہیں پیاس سے۔۔۔اپنا ہی خون نکال کر کیوں نہیں پی لیتے۔"

عجیب سا سوال دماغ کی چار دیواری میں ٹکرانے لگا۔اسے خود پہ ہنسی آئی۔

مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔۔۔بے مقصد باتیں سوچتی ہوں بے دھیانی سے کام کرتی ہوں۔۔۔آدھی پاگل ہو گئی ہوں۔۔۔یا شاید ' پوری پاگل!

اگر اسے پتا چلے کہ میں بھی دن کے کئی پہر اسے سوچتے ہوئے بیتا دیتی ہوں تو کیا سوچے گا وہ۔۔۔خوش ہو گا؟نہیں!یقین ہی نہیں کرے گا۔۔۔'خود ہی سوال جواب کر کے وہ ہنسنے لگی۔

اب سیب کی قاشوں پر ہلکا سا نمک چھڑک کر وہ کمرے میں لے آئی تھی۔

اس کی پسند کے کپڑے تو اکٹھے کر لیے لیکن پہننا اوڑھنا کس کام کا؟

سجنا سنورنا کس لیئے دیکھنے والی آنکھ تو ہے نہیں۔وہ ایک دفعہ مجھے دیکھے تو سہی۔۔۔مجھے بتائے اس رنگ میں اس کے تصور میں جتنی پیاری لگی تھی اتنی حقیقت میں بھی میری تصویر بھاتی ہے یا نہیں۔۔۔

موبائل اٹھا کر سیدھے ہاتھ میں پکڑا اور الٹے ہاتھوں سے کانوں کے پیچھے بالوں کی لٹ اڑسی۔لمبے بال چٹیا کی شکل میں باندھ کر جوڑا بنایا ہوا تھا۔کچھ لمبی لٹیں پھر بھی شرارت پر آمادہ تھیں۔

میری انگلی کٹ گئی اس نے پیغام بھیجا۔

موبائل رکھ کر سیب کی قاش منہ میں رکھی ہی تھی کہ جوابی پیغام آیا۔

اوہو کب؟کیسے؟اب کیسی ہو؟

پاکیزہ نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ اس کی بے چینی سے محظوظ ہو رہی تھی۔ٹھیک دو منٹ بعد سکرین پر آفتاب کالنگ لکھا آ رہا تھا۔ثابت ہوا کہ اس کا محظوظ ہونا درست ہے۔

"ہیلو پاکیزہ! کیسی ہو"

"اسلام علیکم! پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، ہلکا سا کٹ لگا ہے۔ بس ذرا سا خون نکلا ہے۔"

"وعلیکم سلام! دھیان کیوں نہیں رکھتی ہو؟ اپنی خاطر نہیں رکھ سکتی تو میرے خاطر رکھ لیا کرو۔"

" تمہاری خاطر اپنا دھیان رکھا کروں۔۔۔ واہ کیا سائنس ہے!"

"اسے سائنس نہیں۔۔۔ محبت کہتے ہیں۔"

" تم محبت کو اتنا آسان سمجھتے ہو؟"

" محبت اتنی آسان نہیں ہوتی لیکن محبت ہم سفر ہو تو زندگی سہل کر دیتی ہے۔"

" کیسی عجیب اور بہکی بہکی باتیں کرتے ہو تم؟ "

" تمہاری آواز سے ہی میرا دل پٹری سے اتر جاتا ہے۔ تسلی دو میرے دل کو۔۔۔ بتاؤ کتنی لگی ہے انگلی پر؟"

" بس ہلکا سا کٹ ہے۔"

"یہ سن کر ہلکا سا کٹ میرے دل پر بھی لگ گیا ہے اس کا کیا؟ "

" دل پٹری سے اترنے لگے تو زخم ہی کھائے گا۔ وہ تمہاری داخلہ فیس کے پیسے مجھ سے لے جاؤ۔"

"میں خود آ کر لے جاؤں؟ واقعی؟"

"نہیں اور۔۔۔ میں تمہیں دینے آؤں گی؟"

"ایک شرط پر تم سے پیسے لوں گا۔"

"ہاں بابا میں تم سے واپس بھی لوں گی پیسے۔۔۔"

"یہ شرط نہیں ہے میری۔ شرط دراصل اجازت ہے۔ مجھے یہ اجازت بھی دو کہ تمہیں ایک جھلک دیکھ سکوں۔ جھلک ایسی ہونی چاہئے کہ بعد میں تم مجھ سے ناراض بھی نہ ہو۔"

"اچھا دیکھ لینا۔"

"ہیں تم مجھے دیکھنے کی اجازت دے رہی ہو؟ اب کی بار ناراض تو نہیں ہو گی؟"

"میں پیسے دے رہی ہوں اور اپنی مرضی سے دے رہی ہوں۔ اس لیے ناراض نہیں ہو سکتی۔ "

"چھوڑو سب۔ یہ بتاؤ کب آؤں؟"

"عشاء کی نماز کے ایک گھنٹے بعد آ جانا۔ اس نے آہستگی سے کہا لیکن کہنے کے بعد اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔"

اذان ہو رہی ہے اب میں خاموشی سے سنتا ہوں اور اور نماز کے بعد شکرانے کے دو نفل پڑھ کر نکلتا ہوں۔ اس نے شرارت سے کہا۔

پاکیزہ نے فون رکھ کر چٹیا کھولی۔ گھنی زلفوں میں کنگھی پھیرنے لگی۔ پہلے پونی ٹیل بنائی لیکن وہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ سامنے کے بالوں کا ٹوئسٹ بنایا لیکن وہ اوور لگ رہا تھا۔ درمیان سے مانگ نکالی لیکن وہ بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی پھر سٹپٹا کر بالوں کو لپیٹ کر جوڑا بنالیا۔ فٹافٹ نماز پڑھی۔ دوبارہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

تسکین پھوپھو کے کمرے سے کھانسنے کی آواز آئی۔ فوراً پیسے مٹھی میں پکڑے اور گھر کا بیرونی دروازہ کھول کر سیڑھی پر پڑے پودوں کی جڑوں میں رکھ دیئے۔ دروازے کو بند کیا اور اندر سے کنڈی لگالی۔

پھوپھو دروازہ لاک کر دیا ہے۔ میں سونے جا رہی ہوں۔

آواز لگا کر اس نے بنا جواب سنے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ مسڈ کال آئی تو فوراً موبائل سائلنٹ کیا۔

آدھے بالوں کو کیچر میں جکڑا۔ ایک لٹ کو چہرے پر آوارگی کے لیے چھوڑ دیا، سانولی رنگت حیا کی سرخی سے تمتما رہی تھی۔

آنکھوں میں چاند کی چاندنی نے اپنا روپ نچھاور کر رکھا تھا۔

وہ کھڑکی کے قریب ہوئی پھر پیچھے ہو گئی۔ پھر پیغام بھیجا کہ

"موتیے کے پودے کی جڑوں سے پیسے اٹھالو"

اب کھڑکی سے چپک کر کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی مکان کی پچھلی طرف تھی۔ داخلی دروازہ اگلی جانب تھا۔ آفتاب پیسے اٹھانے گیا تھا وہ بائیک لے کر جب پچھلی طرف کی گلی میں داخل ہوا۔ پاکیزہ نے فوراً اس کا نمبر ڈائل کیا۔ ایک ہاتھ سے بائیک سنبھالتے اس نے فوراً کال پک کی تھی۔

"آفتاب" نچلے لب کو دانتوں میں دابتے ہوئے آج اس نے گفتگو کا آغاز اس کے نام سے کیا تھا۔

"ہاں" وہ مخصوص جگہ پر کھڑا ہونے کے لیے بائیک کو آہستہ آہستہ لے جا رہا تھا۔

"مجھے پیسے مل گئے شکریہ" وہ اوپر نہیں دیکھ رہا تھا لیکن بول رہا تھا۔ دودھیا رنگت شاید پیسے لینے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھی۔

وہ پاکیزہ کو تنگ کرنے کے لئے کہتا تھا کہ میری طرف دیکھو۔ خود کبھی زیادہ دیر تک پاکیزہ کو نہ دیکھتا۔ اسے خدشہ تھا کہ کانچ کی گڑیا کو نظر سے ہی نظر نہ لگ جائے۔

"آفتاب" اس کی آواز میں سچی پکار تھی۔

" ہاں" آفتاب اب کی بار بھی اوپر نہیں دیکھ سکا تھا۔

جس ہاتھ سے وہ بائیک سنبھال رہا تھا غالباً اسی میں پسینے تھے۔ ہتھیلی سرخ ہو رہی تھی، وہ بائیک کی چابی گھما رہا تھا۔ اب قدم قدم چلتے ہوئے وہ بائیک کو کھڑا کر کے اس سے اترنے لگا۔

جو بات میں کہہ نہیں سکتی وہ میں فرض کرتی ہوں

چلو میں فرض کرتی ہوں مجھے تم سے محبت ہے

بہت ہچکچاتے ہوئے پاکیزہ نے وہ کہہ دیا تھا جو اسے سمجھ میں آیا تھا۔

بائیک سے اترتا ہوا آفتاب سنبھل نہیں پایا تھا۔ لڑکھڑا گیا۔ بائیک اس کے اوپر آن گری تھی۔ پاکیزہ پریشانی میں ایک قدم مزید آگے بڑھی۔ خوبصورت اپالو کا مجسمہ، یونانی دیوتا مکمل ساکن ہوا کھڑکی میں اترے اپنے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں وہ اس اظہار پر ہزار دفعہ صدقے جا چکا ہے اور سو دفعہ دل و جان ہار چکا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

کچھ یادیں، موسم تابندہ، کچھ عکس اور خواب سدا زندہ

دل عجب عجائب خانہ ہے کچھ تصویروں تمثالوں کا

صبح کا سورج رات بھر کے کورے کو پگھلانے کی ناکام کوشش کر تا بادلوں میں سے اپنی روشنی نچھاور کر رہا تھا۔ کورے نے اپنی پوری آنکھیں سورج پر گاڑ دی۔ بھلا جو رات بھر ہوا تھا وہ کچھ لمحوں کے وجدان سے چھوٹ جائے گا؟ کئی گھنٹے لگیں گے اور ظاہری طور پر اشیاء اسے بھلا بیٹھیں گی لیکن دُور کوئی اس سب کو لکھ رہا ہو گا۔۔۔ محفوظ کر رہا ہو گا !

وہ سورج کے آنکھ کھولنے سے کچھ دیر پہلے ہی نیند کی آغوش میں لپٹی تھی۔

وہ کون سا وعدہ تھا جو آفتاب نے نہیں کیا تھا سوائے ساتھ چھوڑنے کے۔۔۔!

وہ کون سی تعریف تھی جو پاکیزہ کی نہیں ہوئی تھی سوائے ستمِ صنم کے!

اس کی ہر خامی اسکی خوبی بن گئی تھی۔ کوئی تھا جو اسے اس سے زیادہ جانتا تھا، جو اسے اس سے زیادہ سمجھتا تھا۔ اس کو ایک کتاب کی مانند دیکھتا تھا، پڑھتا تھا اور طالب کی طرح سینت سینت کر رکھتا تھا۔ وہ اس جہاں میں کسی کو تو مطلوب تھی۔ اس احساس نے نیند کی طلب پر غلبہ پا لیا۔

رات کا ایک پہر گزرنے کے بعد دونوں کو احساس ہوا تھا کہ دوری ہر محبت کا لازمی جزہے۔ وہ ایک دوسرے سے دور تھے اور ان کو جوڑنے والے موبائل کا بیلنس ختم ہو چکا تھا۔ اسی وقت آفتاب اپنے کمرے کی کھڑکی سے لان میں کودا، دیوار پھلانگی اور دو کلو میٹر کے فاصلے پر کھلی دکان سے پاکیزہ سے جڑنے کی نوید لے کر آیا۔ اس کے پیچھے راستے میں کتے بھی لگے تھے۔ حواس باختگی میں دو دفعہ

گرا، گھٹنوں اور ٹانگوں پر خراشیں آئی لیکن پاکیزہ سے ساری رات بات کرنے کے لیے یہ تکلیف کچھ بھی نہیں تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے پاکیزہ کو بتایا تھا اور پاکیزہ کو اس دیوانگی پر ہنسی آئی تھی۔ ساتھ ہی چھوٹے سے دل کو فکرمندی نے اپنے شکنجے میں لے لیا۔

"ٹیٹنس کا **انجیکشن** صبح اٹھتے ہی لگوا لینا۔" تاکید کی گئی، دوسری طرف سر خم ہوا۔ وہ سر جھکانے کے لیے بے تاب ہی تو تھا۔

ہم دوسروں کی طرح کبھی کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھائیں گے۔

" جتنی جلدی ہو سکے گا شادی کر لیں گے۔ "

"میں تمہارے ساتھ والی سیٹ پر گاڑی میں تب ہی بیٹھوں گی جب ہماری شادی ہو جائے گی۔"

شادی سے اگلی صبح ہم سکول جائیں گے تاکہ اس جگہ کو خراج عقیدت پیش کر سکیں جس نے آسمان پہ بچھڑی ہوئی روحوں کو ایک دوسرے سے ملایا۔

"تمہیں پتا ہے آج کل کی جنریشن بات یہاں سے شروع کرتی ہے 'آر یو گڈ اِن بیڈ؟' یہ تم ہو جس کی وجہ سے میں آج تک اپنی حد سے تجاوز نہیں کر سکا۔"

"تم ایسی لڑکی ہو جس کے ساتھ فلرٹ نہیں کیا جا سکتا، صرف شادی کی جا سکتی ہے۔"

"میں آج کے بعد تمہیں کبھی آپ نہیں کہہ سکوں گا کیوں کہ تم میرے دل کے بہت قریب ہو گئی ہو۔"

"اور میں آپ کو آج کے بعد کبھی تم نہیں کہہ سکوں گی۔۔۔"

"ایک لڑکی کا کسی لڑکے کے لیے جب تم سے سفر آپ پر ختم ہو جاتا ہے تو دراصل وہ اپنی ذات کی مٹی سے ایک مٹی نکال کر ایک بت تعمیر کرتی ہے اسے اپنے دل کی مسند پر بٹھاتی ہے اس کے صدقے واری جاتی ہے اس کی اتنی نظر اتارتی ہے کہ اپنا حسب نسب بھول جاتی ہے وہ لڑکی سے جوگن بن جاتی ہے تب ہی تم سے آپ پر آتی ہے"

آئینے میں اپنا آپ دیکھ کر وہ مسکرائی۔ آنکھیں وہی تھیں لیکن ان میں سرخ ڈورے کسی اور کے روپ کو جگہ دیئے خوبصورت لگ رہے تھے۔ وہ واقعی یونانی دیوتا ہے یا اس نے مجھے محبت سے چھو کر قیمتی کر لیا ہے جسے نظر میں بسایا ہے وہ تو ہے ہی خوبصورت۔۔۔ اتنا خوبصورت کے میں اسے سوچ کر خوبصورت ہو رہی ہوں اس کی سرگوشیاں میری سماعت میں رقص کر رہی ہیں اور میری روح اس کی آواز کے وجد میں مبتلا ہے اس کا لمس جس نے مجھے چھوا تک نہیں میرے دل کو مسلسل گدگدا رہا ہے میری مسکراہٹ اس کی بے ساختگی اور دیوانگی سے حسین ہو گئی ہے۔ وہ کیسے میرے اندر تک اتر گیا ہے میرے سارے رنگ پیچ ہوئے اس کی محبت کا رنگ پکا نکلا وہ سچ کہتا ہے اس کی محبت کی صداقت پر میں نے لبیک نہیں کہا میری رگوں میں دوڑتے خون نے جی حضوری کی ہے آج مجھے پتا چلا ہے کے مجھے دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے اسے مکمل کرنے کے لیئے آج مجھے پتا چلا کے اسے دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے مجھے مکمل کرنے کے لیئے۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆

لڑکیاں بیٹھی تھیں پاؤں میں ڈال کر

روشنی سی ہو گئی تالاب میں

جکڑے جانے کی تمنا تیز تھی

آ گئے پھر حلقہ ء گرداب میں

"تمنا نہیں آئی؟ایک نے دوسری سے استفسا کیا۔"

"اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈیٹ پر گئی ہو گی۔"جواب دینے والی نے بڑے آرام سے تبصرہ کیا۔

"لیکن وہ تو کہتی ہے کہ وہ اس کا کزن ہے"۔ایک کو حیرانی ہوئی۔

"کزن ہے تو کیا ہوا؟ہے تو بوائے فرینڈ ہی ناں؟ نکاح تو نہیں ہوا ناں؟"کسی اور نے قطعیت سے شانے اچکائے۔

آپس میں باتیں جاری تھیں۔سب کی نظریں پانی کی سطح پر پڑنے والی سورج کی کرنوں سے خیرہ ہو رہی تھیں۔اشتیاق سے مسکراتی آنکھیں اور ہاتھوں کی حرکات اندرونی خوشی کا اظہار بن رہی تھیں۔

ایک وہ تھی جس کا دھیان بھٹکا ہوا تھا۔ایک وہی تھی جس کا دھیان ہونا چاہیے تھا۔میڈم کنیز نے اس کو غور سے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں سورج کی رقصاں کرنوں کا کوئی عکس نہیں تھا۔وہ غائب دماغی سے یہاں وہاں دیکھ رہی تھی۔اپنے دانتوں میں منہ کی اندرونی جانب سے تھوڑا سا ماس دبائے ہوئے وہ اپنی مسکراہٹ قابو کر رہی تھی۔

آنکھوں میں کوئی عکس چھن جانے کا خوف تھا۔لبوں پر کوئی راز افشاء ہو جانے کا ڈر تھا۔ہر تھوڑی دیر بعد وہ موبائل کو دیکھتی پھر یہاں وہاں دیکھتی۔۔یہ لڑکی وہ نہیں تھی جس کو کچھ عرصے سے وہ جانتی تھیں۔واردات ہو چکی تھی ا

"کیا ہوا ہے پاکیزہ؟"انہوں نے پاکیزہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

پاکیزہ چونک کر ان کی طرف مڑی کچی نیند سے جاگتے ہی خواب سامنے کے منظر پر حاوی ہو جاتے ہیں۔پاکیزہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا اسے لگا تھا شاید آفتاب کہیں سے آ جائے۔

نہیں میڈم کچھ نہیں وہ واقعی وہاں نہیں تھی ورنہ ہمیشہ میم کہنے والی آج میڈم کیوں کہتی۔

میرے ساتھ آؤ وہ پاکیزہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے قریبی ٹیلے پر لے آئی۔

کالج کی طرف سے چھوٹا سا تفریحی دورہ اپنے اوجِ کمال پر پہنچ چکا تھا۔لڑکیاں ٹولیوں کی صورت میں اساتذہ کی نگرانی میں یہاں وہاں گھوم رہی تھیں۔میم کنیز نے اپنے گروپ کو نظروں میں لے کر پاکیزہ کو اپنے پاس بٹھا لیا اور وہ بیٹھ گئی۔

"کون ہے وہ؟" انہوں نے کوئی پہیلی نہیں پوچھی تھی۔ سیدھا سادھا سا سوال تھا جو انہوں نے ایک بھی لمحے کی تاخیر کے بغیر پوچھ لیا
۔

"جی؟" پاکیزہ کے لیے جواب دینا مشکل ہو گیا۔

"کون ہے وہ؟ تم ایک دوست سمجھ کر بتا سکتی ہو مجھے۔" انہوں نے اپنی آواز میں شیرینی کو نمایاں رکھا۔ یہ سچ تھا کہ وہ کبھی بھی ڈانٹ کر سچ نہ جان پاتی۔

"آفتاب نام ہے اُن کا۔" اس ایک اُن میں ساری کہانی چھپی تھی۔

میم کنیز کے ہاتھوں میں لرزش اتر آئی بمشکل خود پہ قابو پایا۔ اب جو دام میں آئی تھی وہ عام سی چڑیا نہیں تھی۔

" کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟"

میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ میرے سکول سے ہی میٹرک کیا تھا۔ اب سیکنڈ ائیر کے پیپر دینے ہیں۔ وہ اسلامیات کی سپلی کی بات چھپا گئی، اپنے اُن کی خود بے عزتی کیسے کرواتی۔

میڈم کنیز کو تھوڑی سی تسلی ہوئی۔

آج کل کی لڑکیاں بغیر دیکھے موبائل فون پر بات کر کے بھی مسحور ہو جاتی ہیں اور کسی ٹرک ڈرائیور، ریڑھی بان، نان فروش سے ملنے چلی جاتی ہیں۔

یہ دونوں تو کم عمر ہیں، بس بے وقوفی کر رہے ہیں۔ اتنا کم عمر لڑکا ضرر رساں ثابت نہیں ہو سکتا۔ انہیں یہی لگا۔

کیا کہتا ہے؟ وہ اس سے زیادہ مناسب سوال اس سے پوچھ نہیں سکتی تھی۔

"میم ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ہڑبڑا کر وضاحت دی۔"

"تو کر کیوں نہیں لیتا'؟'" میم کنیز کا سوال بجا تھا۔

" اتنی جلدی میم۔۔۔ اتنی جلدی کیسے ممکن ہے؟" پاکیزہ بوکھلا گئی۔

"جب اتنی جلدی ممکن نہیں ہے تو اتنی جلدی رابطہ کیوں کر ممکن کر لیا؟" میم کنیز دلائل دے رہی تھیں۔

"میم وہ فیئر ہے۔ وہ واقعی مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جیسے ہی ممکن ہوا وہ کر لے گا۔" وہ ٹوٹی ہوئی وضاحتیں دینے لگی جس میں یقین کے بیش قیمت نگینے جڑے ہوئے تھے۔

"بیٹا کل کس نے دیکھی ہے؟ تم اس سے کہو وہ کر لے۔ جو ممکن ہے وہ کر لے۔ خاموشی سے صحیح وقت کا انتظار کرے یا پھر رشتہ بھیج دے۔" میم کنیز جانتی تھیں کہ وہ کتنا مانے گی۔

"میم اس کے گھریلو حالات کا کچھ مسئلہ ہے۔اس کی گھر میں کوئی پوزیشن نہیں ہے۔میرا نہیں خیال اس کے بھائی بھابیاں مانیں گے ۔بعد میں شاید مان بھی جائیں لیکن ابھی جب اس کی پڑھائی بھی مکمل نہیں ہوئی وہ کیسے مان سکتے ہیں؟" پاکیزہ بمشکل وکالت کر رہی تھی۔

" جو آج رشتے کے لیے راضی نہیں کر سکتا، وہ کل شادی کے لیئے کیسے راضی کرے گا؟سوچنے کی بات ہے "

میم کنیز نے فیصلہ اس پہ چھوڑ دیا۔ذہانت کے در پہ اتنی دستک کافی تھی۔

میم کنیز آہستگی سے اٹھی اور باقی لڑکیوں کی طرف چل پڑی۔وہ ٹیلے پہ تنہا بیٹھی رہ گئی تھی۔

"کیا میں اکیلی رہ جاؤں گی؟کیا وہ کوئی اسٹیپ لے گا؟کیا اس کے گھر والے مان جائیں گے؟میم کنیز میرے بارے میں کیا سوچتی ہوں گی؟وہ خود سے سوال پوچھ رہی تھی۔"

وہ ڈرتی دوڑتی ہوئی میم کنیز کے پاس گئی۔

" میم۔۔۔میم!"

جی بیٹا ان کے مشفق انداز پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"آپ پتا نہیں میرے بارے میں کیا سوچتی ہوں گی؟اس کے لیے میم کنیز کی سوچ اہمیت رکھتی تھی۔"

" میرے سوچنے یا نہ سوچنے سے فرق نہیں پڑتا۔اس کے سوچنے سے فرق پڑتا ہے۔میم نے انگلی اٹھا کر آسمان کی طرف اشارہ کیا سوچو اللہ تمہارے بارے میں کیا سوچتا ہے؟"

وہ کہہ کر چلی گئی اور پاکیزہ سُن کھڑی رہ گئی۔

ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے اس کو تیخ کر رہے تھے!

☆☆☆☆☆☆

" تمہیں مجھ پر یقین ہے؟" سارے سوالوں کے جواب میں وہ بس یہی پوچھ سکتا تھا۔

پاکیزہ نے تاروں بھرے آسمان کو ایک نظر دیکھا۔اس کی زندگی میں اس روشن تھالی کی طرح بہت لوگ تھے۔بادلوں سے چاند نکل کر آیا اور پاکیزہ کی ساری توجہ چاندنی پر مرکوز ہوگئی جس نے رات کا پورا سماں ہی بدل دیا تھا۔آفتاب کے آنے سے کیا ہوا تھا ۔۔۔یہی تو ہوا تھا۔

"تمہیں مجھ پر یقین ہے؟" وہ دوبارہ سوال پوچھ رہا تھا۔

پاکیزہ گڑبڑا گئی۔

"کیا اس نے آفتاب سے محبت کی تھی؟ نہیں! اس نے آفتاب سے محبت نہیں کی تھی۔۔۔ اگر اس نے آفتاب سے محبت کرنا ہوتی تو تب کرتی جب وہ اس کے سامنے کھڑا رو رہا تھا۔ اگر اس نے آفتاب سے محبت کرنا ہوتی تو تب کرتی جب وہ خود محبت کا اظہار کرتا پاگل ہو رہا تھا۔ مسئلہ سارا یہی تھا اس نے آفتاب سے محبت نہیں کی تھی۔ اسے محبت ہو گئی تھی۔۔۔ بغیر سوچے سمجھے محبت ہوئی تھی ۔۔۔ ویسے ہی جیسے محبت حقیقت میں ہوتی ہے۔ نہ موقع دیکھتی ہے نہ محل۔ نہ ذات نظر آتی ہے نہ پات۔ بس ایک لمحہ لگتا ہے اور الہام کی طرح محبت کا نزول بھی ہو جاتا ہے۔ جب وہ اس کی کھڑکی کے نیچے کھڑا تھا، اس کی نظریں جھکی ہوئیں تھیں۔ اسے شاید ان جھکی نظروں سے ہی محبت ہوئی تھی۔ شاید سرخ سفید رنگت من کو بھائی تھی۔ نجانے کیوپڈ کا تیر کہاں سے چلا۔ اس لمحے پاکیزہ نے جو بھی کہا تھا سوچ کر نہیں کہا تھا، ارادتاً نہیں کہا تھا۔ اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔۔۔ نہیں! منہ سے بھی نہیں نکلا تھا۔ منہ سے نکلا ہوتا تو وہ لڑکی ہونے کا پاس رکھتی۔۔۔ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی آواز دبا دیتی۔۔۔ وہ لفظ تو دل سے نکلے تھے اور انہوں نے یونہی نکلنا تھا۔"

اب وہ اس محبت کا کیا کرتی؟ اسے کہاں لے جاتی؟ اس کا دل کسی آری سے کٹ رہا تھا۔

میری خوشیوں کی عمر اتنی چھوٹی کیوں ہوتی ہے۔۔۔!

"پاکیزہ اس کا مطلب ہے تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے۔" آفتاب اس کی مسلسل خاموشی سے نتیجہ اخذ کر چکا تھا۔

"نہیں! ایسی بات نہیں۔" پاکیزہ نے ایک دفعہ پھر بادلوں کی اوٹ میں جا چھپے چاند کو دیکھ کر کمزور سا احتجاج کیا۔

"ایسی بات نہیں ہے تو کیسی بات ہے؟ میں تین چار سال سے مسلسل تمہیں اپنی محبت کا یقین دلا رہا ہوں۔ میری محبت کچی عمر کی محبت ہے کچی عمر کی محبت کچی نہیں ہوتی، بہت پکی ہوتی ہے۔ جس طرح وقت نین نقش پہ اپنے اثرات چھوڑتا ہے لیکن نین نقش نہیں بدل سکتا بالکل اسی طرح تمہاری محبت شدید تو ہو سکتی ہے لیکن میرے دل پر کندہ تمہارا نام نہیں بدل سکتا۔ وہ وضاحتیں دیتا اب تھک رہا تھا۔"

"آفتاب بات محبت کی نہیں ہے عزت کی ہے۔ اگر ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہو گا تو میں دنیا کو کیسے بتاؤں گی کہ آپ میرے کیا لگتے ہیں۔ دنیا آپ کو میرا بوائے فرینڈ کہے گی اور میں نے یہ لفظ کسی کے منہ سے سنا تو میں مر جاؤں گی۔ وہ رو رہی تھی۔"

چھت کا ٹھنڈا فرش اسے بالکل بھی ٹھنڈا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ فرش پہ اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس کے آنسو گردن تک پھسلتے جا رہے تھے۔

"کوئی کیوں بوائے فرینڈ کہے گا؟ تم کہنا میں تمہارا دوست ہوں۔ پلیز ایسے مت رو۔ لوگ ہمیشہ باتیں بناتے ہیں۔ تم تو بہت سٹرانگ تھی تم نے کب سے لوگوں کی پرواہ کرنا شروع کر دی۔ وہ ناریل کا چھلکا اترنے پہ حیران تھا۔ پاکیزہ کبھی نہیں روئی تھی۔ آج رو رہی تھی۔"

"لوگ میرے بارے میں غلط باتیں کہیں گے حالانکہ میں غلط لڑکی نہیں ہوں۔ لڑکا اور لڑکی کبھی دوست نہیں ہوتے یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتی ہوں۔ جب تک میرے دل میں نرمی نہیں تھی تب تک میں نے تمہاری دوستی بھی قبول نہیں کی تھی ۔ جہاں تک لوگوں کی بات ہے تو ان کی پرواہ کرنا میں چھوڑ سکتی ہوں۔ اگر لوگوں کی پرواہ کرنا چھوڑ بھی دوں تو اللہ کی پرواہ کرنا کیسے چھوڑوں؟ اس کے سامنے کس طرح کھڑی ہوں؟ اللہ جی پتا نہیں میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے؟" اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر ہتھیلی کو چھت کے فرش پر پھیلا کر اپنے ڈولتے وجود کو سہارا دیا۔

"وہ سسکیاں لے رہی تھی۔ محبت نے اس کو گھٹنوں پر لایا تھا۔ محبت ایسے ہی کرتی ہے۔۔۔ گردن تڑوا بھی سکتی ہے، جھکا بھی سکتی ہے! جھکنے کی تکلیف ٹوٹنے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔"

"کیا چاہتی ہو تم؟ وہ پوچھ رہا تھا وہ یہ بھی سن رہا تھا کے وہ واپس آپ سے تم ہو گیا ہے۔ "

"میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھ سے شادی کر لیں۔" تم کا صیغہ استعمال کر کے وہ بھی اپنی جگہ سے ہلی تھی۔ صاف لفظوں پر اتر کر اسے خود بھی حیرت ہو رہی تھی۔

"اپنے آپ کو پلیٹ میں رکھ کر پیش کرنا اُٹھے سر کو کچل دیتا ہے!"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ میرا بس چلے تو تمہارا ایک بال بھی کسی کو دیکھنے نہ دوں، تمہیں چھپا کر رکھ لوں لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ میرے بس میں کیا ہے۔ اگر تم میرے حالات نہیں جانتی تو کوئی نہیں جانتا۔ اگر تم سب جانتے ہوئے بھی مجھ سے یہ فرمائش کر رہی ہو تو میں صرف حیران ہی ہو سکتا ہوں۔ میرے پیرنٹس پہلے ہی بھابیاں گھر لا کر اکتائے ہوئے ہیں۔ میں ابھی پڑھ رہا ہوں۔ ساتھ کوئی کام کاج کر رہا ہوتا تو ضرور کوئی اسٹیپ اٹھا لیتا۔ میں ایسی کوئی بات جیسے ہی گھر میں کروں گا، سب میرے خلاف ہو جائیں گے۔ بھائی تو اس حد تک بھابھی کی بات سنتے ہیں کہ مجھے گھر سے نکالنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اگر میرے ہاتھ ہوتا تو میں سیدھا راستہ کیوں نہ اپناتا۔ میں نے شادی تم سے ہی کرنی ہے۔ بس تھوڑا سا انتظار کر لو۔ وہ درخواست کر رہا تھا۔"

"اگر انتظار ہی کرنا ہے تو پھر آفتاب تم خود کر لو۔ جب تک ہمارے رشتے کو جائز نام نہیں ملتا۔ مجھ سے رابطہ نہ کرو۔ میرا حال چال دریافت نہ کرو اگر میں واقعی تمہارے نصیب میں لکھی ہوئی تو اللہ خود سبب بنا دے گا۔" اس نے رات کی سیاہی کا کڑوا گھونٹ بھرا۔

"تم مجھ سے وہ کیوں نہیں مانگتی؟ جو میرے بس میں ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ گھٹنے ٹیک رہا تھا۔

"میں اللہ جی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس کے سامنے کیسے کھڑی ہوں؟ میں جب یہ سوچتی ہوں کہ اللہ جی میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے تو مجھے خود سے گھن آتی ہے۔"

وہ سسک اٹھی۔

" ہمارے درمیان میں کچھ بھی ناجائز نہیں ہے۔" ایک بودی سی دلیل آئی۔

" ہمارے درمیان کچھ جائز بھی تو نہیں ہے۔" ایک ذہین ذہن نے جواب دیا۔

"تم مجھے چھوڑ رہی ہو"۔ وہ سسکا۔

"میں ذلت کو چھوڑ رہی ہوں"۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن بات اچک لی گئی۔

"میں ذلت لگتا ہوں تمہیں؟" تین چار سال کی ریاضت بے کار گئی تھی۔

"نہیں میں یہ نہیں کہنا چاہتی تھی"۔ اس نے سرا پکڑنا چاہا۔

" تم یہ کہہ چکی ہو۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

"اگر تم یہی سمجھنا چاہتے ہو تو یہی سہی۔" اس کی نظریں اب روشن تھالی سے پرے جانے کی سعی کرنے لگیں۔

وہ فون بند کر چکی تھی۔ نمبر ایک دفعہ پھر بلاک ہو چکا تھا۔ آسمان روشن تھا۔

! زمین پر کچھ بھی ہو جائے آسمان کو فرق نہیں پڑتا

☆☆☆☆☆☆

حُسن کے سمجھنے کو عمر چاہیے جاناں!

دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں

کوئی موجہء شیریں چوم کر جگائے گی!

سورجوں کے نیزوں سے سیپیاں نہیں کھلتیں

ماں سے کیا کہیں گی دُکھ ہجر کا، کہ خود پر بھی

اتنی چھوٹی عمروں کی بچیاں نہیں کھلتی

سرما میں جتنے پتے درختوں سے گرے تھے وہ بہار میں پھر سے نکلنے لگے۔ مٹی کے تلے چھپے ہوئے حشرات کے رینگنے کی آوازیں بڑھنے لگیں۔ نئے پھول اپنی چھب دکھلانے لگے۔ کوئل کی کوک میں سریلا پن اتر آیا۔ زندگی ویسے ہی رواں دواں تھی۔ ایک موسم جارہا تھا اور دوسرا آرہا تھا۔

"پاکیزہ یہ کپڑے کیوں نہیں پہنتی؟ اتنے شوق سے لیے تھے'۔" تسکین نے بھوری دھاریوں والے فراک کے متعلق پوچھا۔

"اس کے گلے پہ جو کام ہوا ہے وہ چبھتا ہے۔ چبھتا تو واقعی تھا لیکن جو چبھتا ہے وہ کام نہیں تھا بلکہ خالی پن تھا۔"

"آگے کا کیا سوچا ہے؟ کون سے سبجیکٹس رکھنے ہیں؟ تسکین نے کھوجتی نظروں سے اس کی مصروفیت کو پرکھا۔"

میں سوچ چکی ہوں انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہو گیا تو ٹھیک ورنہ بی اے کر لوں گی۔" پاکیزہ نے ترتیب سے رکھی ہوئی ساری کتابوں کو از سرِ نو ترتیب دیتے ہوئے کہا۔

"انجینئرنگ یونیورسٹی کیوں نہیں ہو گا؟ فرسٹ ائیر کے اتنے اچھے مارکس ہیں مجھے پوری امید ہے تمہارا داخلہ ہو جائے گا۔ تسکین نے سابقہ کارکردگی کو دماغ میں رکھتے ہوئے فیصلہ سنایا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ پاکیزہ کی پڑھائی میں دلچسپی ویسی نہیں رہی۔"

وہ بیٹھی اسکیچنگ کرتی رہتی، کمرے کی ترتیب بدلتی رہتی، کتابوں کو وقت کم دیتی۔ تسکین کو تنبیہہ کرنے کا موقع نہ ملتا کیونکہ کسی اور کام میں بھی پاکیزہ مگن نہ رہتی۔ وہ جو موبائل میں مگن رہنے کا دُور تھا وہ بہت اچانک آیا اور بہت جلدی گزر گیا۔

"ہو گیا تو ٹھیک نہیں تو نہ سہی" وہ پہلے والی پر عزم پاکیزہ گم ہو گئی۔ اِس پاکیزہ کو فرق ہی نہیں پڑتا تھا۔

تسکین الجھ گئی لیکن کوئی سرا ہاتھ میں ہوتا تو ڈور کھینچتی۔۔۔ بے مطلب کی باتیں کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

منڈیر پر شام اتر آئی۔ کوکتی کوئل اپنے آشیانے میں لوٹ گئی تھیں۔ بے تاثر چہرے کے ساتھ پاکیزہ نے سر تکیے پر رکھا تو ایک نا معلوم سی کسک آنکھوں میں نمی کی صورت در آئی۔ خود پر قابو پانا خواہشوں کا گلہ گھونٹ دیتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری خواہشیں حسرتیں ہیں۔ اس کے باوجود خواہشوں کا گلہ گھونٹنے پر ہم بین کرنے لگ جاتے ہیں۔

تکیے کے نیچے رکھا موبائل نکالا گزشتہ تین ماہ کی طرح آج کی رات بھی اس نے صبح سے آئے ہوئے پیغامات کو بلا کڈ کے فولڈر میں پڑھنا شروع کیا۔

صبح کے پہلے خیال کو میرا اسلام!

فون تم اٹھاتی نہیں ہو۔۔۔ کتنے ہی نمبروں سے کال کر چکا ہوں لیکن نجانے کیوں مجھے یقین ہے کہ میرا نمبر بلیک لسٹ میں ڈالنے کے باوجود بلا کڈ میسجز کے فولڈر میں جا کر میرے میسج پڑھتی ہو گی۔ میرے جذبات اتنے ارزاں تو نہیں کہ انہیں یوں ٹھکرا دیا جائے

" تمہاری فکر ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں تمہارا کیا حال ہو گا؟"

" کیا تمہیں سارے دن میں ایک بار بھی میرا خیال نہیں آتا؟"

"تم بے شک مجھے اگنور کر و لیکن اب بھی تم میری جیکٹ کی اندرونی جیب ہو، میرے دل کے بہت قریب!"

میسجز پڑھ کر وہ ہلکی پھلکی ہو گئی۔ دنیا میں کوئی تو تھا جس کے لیئے وہ اہم تھی۔ جو اسے پیغام بھیجنا ضروری سمجھتا تھا۔"

"اس بندے کی کتنی قدر دل میں پیدا ہو جاتی ہے جس کو آپ چھوڑ دیں لیکن تب بھی وہ آپ کو نہ چھوڑے، ایلفی کی طرح آپ سے چمٹ جائے، آپ دامن چھڑوائیں تب بھی آپ کی پرواہ کرے، بے لوث بے غرض فکر کرے۔ مسئلہ یہ ہے کہ قدر جب اپنا آپ منواتی ہے تب تک ایلفی ایکسپائر ہو جاتی ہے۔ وہ بندہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ نہ آزمانے والا پچھتاوے سے خالی رہتا ہے اور نہ ہی آزمایا جانے والا مکمل ہوتا ہے۔

"جب میں اسے آواز دوں گی وہ میرا جواب دینے کے لیے اسی طرح تیار ہو گا۔۔۔ جتنا اب بے قرار ہے؟" یہی سوال وہ روز خود سے پوچھتی تھی۔

بے یقینی کمرے کی چار دیواری پر اندھیرا بن کر رینگنے لگی۔ اسے گھٹن کا احساس ہوا پھر ساری گھٹن نمی بن کر آنکھوں میں اتر آئی۔

جو وہ چاہتی تھی وہ ہو نہیں سکتا تھا اور جو ہو سکتا تھا وہ اس کو چاہ نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆

میں کیوں اس کو فون کروں!

اُس کے بھی تو علم میں ہو گا!

کل شب

موسم کی پہلی بارش تھی

موذن نے اذان دی اور رحمتیں رونق بن کر گلیوں میں اتر آئیں۔ دکانداروں نے اپنا اپنا کاروبار بند کیا۔ عورتیں گھر کے مردوں کے کپڑے تیار کر کے غسل خانے میں لٹکانے لگ گئیں۔ لڑکیاں بالیاں بیری کے پتوں کی تلاش میں بھائیوں کو دوڑائے بیٹھی تھیں !۔ جس گھر میں بیری کا درخت تھا وہاں الگ ہی سماں تھا۔ عید ہو جیسے عید کی رات ہو۔۔۔

لڑکوں کے سفید کڑ کڑ کرتے کپڑے، کھیڑیاں پاؤں میں سجی ہوئی اور سر پر سلامتی کی پیامبر بنی ٹوپیاں نورانی رات کا حصہ لگ رہی تھیں۔ آسمان پہ دھیمی سی روشنی کا ایسا اندھیر مچا ہوا تھا کہ رات ہو کر بھی نہ تھی۔ برقی قمقموں نے شہر کا شہر روشن کر رکھا تھا ۔ مسجدوں میں اپنے اپنے والد صاحب کے ساتھ آئے نعت خواں اپنی آواز پر فرحاں وشاداں تھے۔ تھوڑا وقت اور بیتا۔ گھروں میں بھی نوافل کی محافل سج گئیں۔ لڑکیاں اپنی سکھیوں کے سنگ زور و شور سے عبادت میں مشغول ہو گئیں۔ جو نماز نہیں پڑھ سکتی تھیں انہوں نے ہاتھ میں تسبیح اٹھا رکھی تھی۔ پاک زبان سے پاک رب کا نام بابرکت لیا جا رہا تھا۔ برکتوں والی شب برات سے ہر کوئی اپنے حصے کی خوشیاں سمیٹنے کا متمنی تھا۔

سفید رنگ کی قمیض جس پر جامنی رنگ کے بٹن لگے تھے۔ جامنی ٹراؤزر اور جامنی دوپٹے کے ہمراہ پاکیزہ پر جچ رہی تھی۔

جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی لڑکیوں کو ہار سنگھار کی حاجت نہیں ہوتی۔ ان کے لبوں پر حیا کی لالی گالوں پر امید کا غمازہ اور آنکھوں میں اترے خوابوں کی دھنک انہیں منفرد اور پر کشش بناتی ہے۔

اپنی باطنی و ظاہری خوبصورتی سے بے نیاز وہ جائے نماز پہ بیٹھی شکوہ کناں تھی۔

انسان کو ہمیشہ وہ یاد رہتا ہے جو اسے نہیں ملتا اور وہ ہمیشہ بھول جاتا ہے جو مل جاتا ہے۔

دل کے اندر کہیں کھوٹ تھا اور وہ اس کھوٹ سے شرمندہ تھی۔

گھڑیاں بیتتی گئیں۔ رات کو تقریباً گیارہ بجے محلے کے منتخب گھر سے واپسی ہوئی۔ تسکین پھوپھو بھی ساتھ ہی تھی۔ گھر والوں کا حوصلہ تھا۔ اجتماعی عبادت کے لیے نہ صرف اہل محلہ کی خواتین کو مدعو کیا بلکہ خاطر تواضع کا بھی سامان فراہم کیا۔ کچھ درس کے بعد فطری طور پر آجانے والی شرمندگی تھی کہ وہ گھر آکر بھی سو نہ سکی۔ اللہ سے راز و نیاز کرتے ہوئے رات کے دو بج گئے۔

فون گھڑی کی ٹک ٹک کو چیرتے ہوئے شور کے ساتھ تھرتھرایا۔ رات کے اندھیرے اور پراسرار خاموشی میں جیسے کسی نے صور پھونکا ہو۔ وہ جی جان سے کانپی اور لپک کر فون کو جالیا۔ اگر فون کچھ ہی سیکنڈز اور اپنا شور رابا جاری رکھتا تو غالباً گمان تھا کہ تسکین پھوپھو کی آنکھ کھل جاتی۔ فون ہاتھ میں لیتے ہی اس نے کال ریسیو کی اور فون کان سے لگا لیا۔

رات کے اندھیرے اپنے جوبن پر تھے۔ آسمان کی سیاہی پر ایک تارا ٹوٹا اور اندھیر نگری میں گم ہو گیا۔ تمام فلک اس کی گمشدگی کا رونا روتا رہا۔

☆☆☆☆☆☆

بارش نے زمیں پر پاؤں دھرا
خوشبو کھنکی، گھنگرو چھنکا
لہرائی ہوا، بہکی برکھا
کیا جانیے کیا مٹی سے کہا
در آئی شریر میں ایک ندیا
کس اور چلی، دیّا دیّا!
کس گھاٹ لگوں رے پرُویا
سارا جگ جل اور میں نیّا!

"پاکیزہ مجھ سے بات کرو تمہیں اللہ کا واسطہ ہے یہ آواز پچھلے پانچ ماہ سے اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔۔۔ وہ اس آواز کو کیسے بھول سکتی تھی! بس آواز سننے کی دیر تھی۔۔۔ کانوں میں جیسے امرت رس گھل گیا، ساعتیں فرحت کے احساس سے آشنا ہو گئیں، "اس نے منت کو مان لیا۔

پلیز اللہ کا واسطہ ہے تمہیں اللہ کے رسول ﷺ کا واسطہ فون نہیں رکھنا۔ کرب آواز میں گھلا ہوا تھا۔ ابھی تو رب سے وہ ہزاروں باتیں کر رہی تھی۔

"کیا وہ کسی کو ٹھکرائے گی تو رب اس کو اپنا لے گا؟ "

"عجیب و غریب سوچیں دماغ پر دستک دینے لگیں۔ اس کا دل رو رو کر نرم ہو چکا تھا۔ پہلے سے مختص ہوا گوشہ بڑی آسانی سے واضح ہوا۔"

"بولو میں سن رہی ہوں۔" اس نے امید و یاس کے درمیان ڈولتے ہوئے کہا۔

"تم جو چاہتی ہو میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔ میں اس وقت مسجد کی دہلیز پر بیٹھا ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں تمہیں پر سنلی گلٹ نہیں ہو گا۔ تمہیں نماز کے لیئے کھڑے ہوتے ہوئے شرمندگی بھی نہیں ہو گی۔ جو تم چاہتی ہو اب وہی ہو گا۔"

"وہ بول رہا تھا یا اذنِ سحر دے رہا تھا!۔۔۔"

اس نے پیغام دیا تھا یا رب کا انعام۔۔۔

پاکیزہ بے یقین ہوئی۔ اس نے کان سے ریسیو اٹھایا اور موبائل کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

دُور فلک میں ٹوٹ کر ڈوبتا تارا لمحے بھر کو روشن ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ہتھیلیوں کی دعا پھول لے کے آئی ہو
کبھی تو رنگ میرے ہاتھوں کا حنائی ہو!
کوئی تو ہو جو میرے تن کو روشنی بھیجے
کسی کا پیار ہوا میرے نام لائی ہو!

"کیا واقعی جو میں چاہتی ہوں وہی ہو گا؟ آپ واقعی مجھے اپنا نام دیں گے؟" وہ بے یقینی سے نوید صبح محسوس کرنے لگی۔

"تم نے مجھے سڑک چھاپ سمجھ لیا تھا؟ میں لوفر ہوں؟ تمہارے پیچھے یونہی آ رہا ہوں؟ تمہاری زندگی برباد کر دوں گا اور تمہیں چھوڑ دوں گا؟ اگر میں نے یہ ہی کرنا ہوتا تو سکول ختم ہونے کے بعد بھی تم سے کیوں چپکا رہتا۔ تم نے مجھے کوئی رسپانس نہیں دیا پھر بھی میں تمہارے پیچھے ہی آتا رہا۔ میں نے اگر فلرٹ کرنا ہوتا تو جو پکے ہوئے پھلوں کی طرح جھولی میں گر رہی تھیں ان سے ہی کرتا۔ تمہاری ہزار دفعہ کی بے رخی جھیلنے کے بعد بھی تمہارے در پہ کشکول پھیلائے کیوں کھڑا ہوتا؟ کسی سڑک چھاپ عاشق میں اتنے گٹس نہیں ہوتے کہ وہ اپنے قیمتی سال یوں ضائع کر دے جس طرح میں کر رہا ہوں۔ میری شکل پر مرمٹنے والی ہزاروں لڑکیاں ہیں جو میرے ساتھ چلنا چاہتی ہیں ان میں سے کئی کو میرے گھر کی چمک دمک بھی متاثر کرتی ہے مگر مجھے تمہارے علاوہ دنیا میں کوئی ایک بھی لڑکی 'لڑکی' نہیں لگتی۔ میں تمہیں تمہارے لیے نہیں اپنا رہا، اپنے لیے اپنا رہا ہوں۔ اللہ نے اگر جوڑوں کی شکل میں ہمیں آسمان سے زمین پر اتارا ہے تو میرا جوڑا تمہارے علاوہ کسی کے ساتھ جڑ ہی نہیں سکتا۔" گزرے مہینوں کا غبار اسکے لہجے کی آنچ میں جھلسنے لگا۔ نجانے کتنی راتیں اس ماہ جبین کو سوچتے گزاری تھی۔ اب بھی نہ کہتا تو ضبط کی انتہا اپنے اندر ہی پار کر دیتا۔

پاکیزہ نے کھڑکی کے پاس جاکر کھڑکی کھول دی۔ ٹھنڈی ہوا نے اس کے گالوں پر نرمی سے گدگدی کی اور وہ خوشی سے جامد ہوتے دماغ کو بڑی مشکل سے مرتکز کر کے دوبارہ گویا ہوئی۔

"آپ کیا واقعی مجھے اپنا نام دیں گے؟" سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"ہاں نام تو تمہیں اپنا ہر صورت دینا ہے لیکن اس سے پہلے ہمیں سب چیزیں کلئیر کر لینی چاہیے۔ میں کسی قسم کا شک یا گنجائش نہیں چھوڑنا چاہتا۔ مجھے میرے ایک سوال اک جواب دو؟"

ہاں جی پوچھیں۔" خوشی کے مارے پاکیزہ کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ عجیب سی بے چینی نے اس کے دل میں اتھل پتھل مچار کھی تھی۔ چاند نیچ ھک کر دیکھا، زمین پر کوئی چہرہ چاند سے بھی زیادہ روشن تھا!"

"تمہیں اللہ کی فکر زیادہ ہے یا دنیا کی؟" اس کے سوال میں تجسس ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"اچھا سوال ہے آفتاب میں بھی عام سی لڑکی ہوتی تو شاید مجھے فرق نہیں پڑتا۔ کبھی نماز پڑھتی کبھی چھوڑ دیتی تو میرے دل سے یوں آوازیں نہ آتی۔ مسئلہ یہ ہے کہ میرے اللہ جی نے مجھے عام سی لڑکی رہنے ہی نہیں دیا۔ میرے اللہ جی نے مجھے عام سی لڑکی بنایا ہی نہیں! اللہ جی نے اگر مجھے یتیم بنایا، حساس پیدا کیا تو ساتھ اعتماد اور صلاحیتیں بھی عطا کیں۔ مجھے ہمیشہ میری اوقات سے بڑھ کر نوازا۔ مجھے نماز کے لیے چن کر رکھا۔ مجھے اپنے آپ سے جوڑ کر رکھا۔ میں کیسے اس اللہ جی کو چھوڑ کر کسی اور طرف متوجہ ہو جاؤں؟ میں جب جب اللہ جی کو صدا دیتی ہوں وہ میری پکار سنتے ہیں۔ ابھی بھی تو دیکھیں میں دل ہی دل میں آپ کے نہ ہونے کا رونا رو رہی تھی۔ اللہ جی نے مجھے آسانی دکھا دی۔" چاند سے روشن لڑکی کو سارا آسمان روشن لگ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ روشنی نے قوسِ قزح کے سارے رنگ اوڑھ لیے ہیں اور اس کی زندگی کو ہمیشہ کے لیے رنگین کر دیا ہے۔

محبت کا اظہار لڑکی کو کبھی متاثر نہیں کرتا، وہ محبت کا سہارا لے کر جتنی مرضی سیڑھیاں چڑھے۔ اس کے نصیب میں تھکاوٹ لکھ دی جاتی ہے۔ یہ جو کسی لڑکے کی طرف سے شادی کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے، وہ متاثر کرتا ہے۔ وہ تھکاوٹ کو آرام میں بدلتا ہے۔ اسکے بعد کسی سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔۔۔ دنیا روشن لگنے لگتی ہے۔

وہ بھی اس وقت اوپر سے اوپر سفر کر رہی تھی۔ اس کی ساری باتیں سن کر وہ کسی ٹرانس میں بندھتا گیا۔ اسے ایسی ہی لڑکی چاہیے تھی جو غلط کرتی تو اس کے اندر سے آوازیں آتی۔ اس نے گھر میں عام سی لڑکیاں دیکھی تھیں۔ اپنی بھابھیاں بغور دیکھی تھیں جن کے لیے انسان صرف وہ خود تھیں اور باقی سب قابل تحقیر۔۔۔ وہ ان قابل تحقیر کیڑے مکوڑوں کی صف سے اپنی ماں کو نکالنا چاہتا تھا۔ اس سمے اسے یقین ہوا کہ یہ بالکل درست انتخاب ثابت ہونے والا ہے۔

"پاکیزہ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تمہارا ہاتھ تھام کر زندگی کو سکون سے گزار سکوں۔ تمہارے خواب دیکھ کر اس زندگی کے بعد کی زندگی کو روشن کر سکوں۔ فجر کے لیے تمہارے اٹھانے پر اٹھوں اور عشاء ہم ساتھ پڑھ کر سوئیں۔ یہ زندگی کیا زندگی ہے۔۔۔ اس

میں کیا رکھا ہے؟ میں تم سے اس رنگارنگ زندگی کی کوئی بات نہیں کرتا۔ میں صرف ہمیشہ تک کے لیے تمہارا ساتھ چاہتا ہوں۔ میں تمہیں لندن، تھائی لینڈ گھمانے لے جانے کا وعدہ نہیں کرتا۔ میں تم سے تمہارے محرم کی حیثیت سے تمہارے ساتھ حج کرنے کی اجازت مانگنا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارا نکاح ہو جائے۔" گھمبیر لہجے میں سیدھے سبھاؤ بولتا وہ پاکیزہ کے دل میں اتر گیا۔

پاکیزہ کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو چکی تھیں۔ سر دوپٹے کی قید سے آزاد تھا اور بالوں کی آوارہ لٹیں فضا میں رچی موسیقی کے ساتھ تھرک رہی تھیں۔ وہ رب کی مہربانی پر حیران تھی۔ وہ اس طلسم ہوش ربا کا مرکزی کردار نبھانے پر پریشان تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کس سلطنت کا شہزادہ ہے۔ ایک عام سی لڑکی سے عام ہونے کی آخری زنگ آلود سوئی کو الگ کرنے آیا ہے۔ اسے فرینڈ اور گرل فرینڈ کی کیٹگری سے نکال کر وہ بیوی بنانے کی بات کر رہا تھا۔

اگر آفتاب سامنے ہوتا تو شاید وہ اس کے چوڑے شانے میں سمٹنے کی کوشش کرتی۔ اپنی سوچ کی بلوغت پر وہ حیا سے گلنار ہو گئی اور دل ناداں کو سختی سے ڈپٹا۔

"میں بھی آپ سے نکاح ہی کرنا چاہتی ہوں۔" نچلے لب کا کونا دانتوں تلے داب کر بڑی ہی مشکل سے بولی۔ خاموشی نے بولنا فرض کر دیا تھا۔

"پاکیزہ اب میری بات غور سے سنو۔" وہ الرٹ ہوا تھا۔

"ایک منٹ۔۔۔ ایک منٹ۔۔۔ پہلے یہ بتائیں کے آپ گھر والوں کو کب بھیجیں گے؟" تیز ہوا سے پاکیزہ کا دوپٹہ کھڑکی کی سلاخوں میں اٹکا تھا تو اسے جاگ آئی تھی۔

"ہاں وہی بتا رہا ہوں بابا میں نے امی سے ساری بات کر لی ہیں۔ وہ راضی ہیں۔ ان کے خیال میں اس گھر کو فوراً ایسی لڑکی کی ضرورت ہے جو خود کو اس گھر کی مالکن نہ سمجھے بلکہ بیٹی سمجھے۔"

پاکیزہ کا دل اتنی اچھی خبر سن کر دھڑکنا بھول گیا تھا۔ کیا دنیا اتنی اچھی ہوتی ہے؟ دنیا کا اچھا ہونا منظر نامے کو اتنی جلدی اتنا اچھا کر دیتا ہے؟ وہ حیران ہو رہی تھی اس دن پھوپھو نے مجھ پر کیسے کیسے الزام لگائے۔ جب ان کو پتا چلے گا تو ان کا ری ایکشن کیسا ہو گا؟ وہ سوچ سوچ کر محظوظ ہو رہی تھی۔ آفتاب اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔

"لیکن امی نے کہا ہے رشتہ ابھی نہیں لے جا سکتے۔ ابھی بڑی بھابی نے گھر میں گھڑاک ڈالا ہوا ہے۔ امی نے مجھے یقین دلوایا ہوا ہے کہ جہاں چاہوں گا شادی وہی ہو گی۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی آفتاب۔۔۔ پھر ابھی بات کرنے کا کیا مقصد ہے؟ میں کیسے یقین کر لوں کہ آپ کی امی نے یہی کہا ہے۔"

دوپٹہ ابھی تک کھڑکی میں الجھا ہوا تھا۔ وہ موبائل کو کندھے کے ذریعے سہارا دے کر دوپٹہ چھڑوانے میں جت گئی۔ اسے آفتاب کی اس بات سے الجھن دوپٹہ اٹکنے سے کہیں زیادہ ہو رہی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے میری امی ایسے ہی مان گئی ہوں گی؟ تم نے اتنا آسان سمجھ رکھا ہے ان کا مان جانا؟ وہ آفتاب نور کی ماں ہیں جس طرح آفتاب نور کو کوئی عام سی چیز نہیں بھاتی۔ اس طرح ان کو بھی محبت کے زبانی دعوے متاثر نہیں کرتے۔ انہوں نے میری بات تو مان لی ہے لیکن ساتھ ایک شرط بھی رکھی ہے۔"

"کیسی شرط؟"

☆☆☆☆☆☆

دسترس سے اپنی، باہر ہو گئے
جب سے ہم ان کو میسر ہو گئے
ہم جو کہلائے طلوعِ ماہتاب
ڈوبتے سورج کا منظر ہو گئے
شہر خوباں کا یہی دستور ہے
مڑ کے دیکھا اور پتھر ہو گئے

وہ بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر دوپٹہ موجود تھا لیکن وہ اپنا مقصد پورا کرنے میں قطعا کامیاب نہیں تھا۔ ٹخنوں سے خون رس رہا تھا۔ ابھی تک زخم ہرے تھے۔ آنکھ کی پتلیاں ساکت ہوئیں شاید زخموں کی شدت کا ہی اندازہ لگا رہی تھی۔

ہاتھ بے جان تھے یوں جیسے مر گئی ہو۔

وہ سانس لینا چاہتی تھی لیکن اسے سانس نہیں آ رہی تھی۔

اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ سیلن زدہ کمرے کی بو لگتا تھا۔۔۔ شریانوں میں گھس گئی ہے۔

اس نے کچھ سوچنے کی خواہش کی لیکن سوچ نہ سکی۔

اس کا دل چاہا کہ اپنے اوپر گزرنے والی قیامت پر ایک آنسو ہی بہا لے لیکن اسکی پلکیں خشک رہی۔

"آپا کچھ تو بولو؟" چھوٹا اس کی ہتھیلی کو سہلا رہا تھا۔

"آپا تم نے تو وکیل بننا ہے اور وکیل تو بہت بولتے ہیں۔ تم ایسے چپ نہیں کر سکتی۔" چھوٹے سے آپا کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ آنسو ٹوٹ کر بے جان ہتھیلیوں پر گرے۔ وہ ذرا سا کسمسائی۔

"تم ادھر نہ جانا، ادھر وہ رہتے ہیں۔" وہ بولی بھی تو کیا بولی۔

"آپا میں نہیں جاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔" چھوٹا خود آپا کی باتوں سے ہراساں ہوا۔

"وہ مجھے سکول نہیں جانے دیتے، میرا راستہ روک لیتے ہیں جیسے ہی میں سکول کی گلی کی طرف قدم بڑھاتی ہوں۔ وہ مجھے نظر آنے لگتے ہیں۔ میرے قدم آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ یہ دیکھو انہوں نے میرے سارے پیر ہی زخمی کر دیئے۔" اب آپا بول رہی تھی۔ زخم ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئے تھے۔

چھوٹے نے ایک نظر ان کے زخموں پر ڈالی اور دوسری نظر زنگ آلود پنکھے کی طرف جس کے چلنے سے کمرے میں بین کی سی آوازیں آرہی تھی۔ ایک ماتم تھا جو ڈر کی وجہ سے جاری تھا۔ ڈر نے چھوٹے کی ریڑھ کی ہڈی شل کر دی۔

"آپا اب وہ نہیں آئیں گے۔" چھوٹے نے مری ہوئی آواز میں تسلی دی۔

"وہ آئیں گے۔ اب وہ ہر وقت آئیں گے۔ دیکھ دیکھ وہ ابھی بھی آرہے ہیں۔ وہ حاضر ہونے والے ہیں۔ وہ مجھے نوچ کھائیں گے۔" آپا جنونی ہو گئی تھی۔ اکڑوں بیٹھ کر اپنے دائیں ہاتھ کے ناخن سے بائیں ہاتھ کی پشت پر خراشیں ڈالنے لگی۔

"آپا نہ کرو نا۔ آپا نہ کرو۔" وہ آپا کے ہاتھوں کو تھامنے کی ناکام سعی کرنے لگا۔

اب وہ رو رہا تھا آواز کے ساتھ رو رہا تھا لیکن آپا کا بین جاری تھا۔ وہ مسلسل اپنے ہاتھوں کو نوچ رہی تھی۔ اب اس کے ہاتھوں کی پشت سے خون نکلنے لگ گیا۔

دو دن سے یہ دکھ اس چھوٹے سے گھر میں ایک مستقل کرب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ چھوٹے کی بے بسی اور کوشش عروج پر تھی۔ آنسو بھی رواں تھے۔ آپا اب ہاتھ سے نکلنے والی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے آپا کے ہاتھ پاؤں مڑ گئے تھے اور وہ سیدھی بستر پر چت گر گئی۔ آنکھیں کھلی ہوئی ساکت تھی اور ہاتھ پاؤں مڑے ہوئے تھے۔ تکیے نے ڈھلکے ہوئے سر کو سہارا دے رکھا تھا تب ہی اس میں ایک نمکین قطرہ آکر جذب ہوا۔

چھوٹے نے بے بسی سے دروازے کی طرف دیکھا۔ ماں ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ سولہ سالہ آپا کے سکول میں بیماری کی درخواست جمع کروانے گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

چاند اُتر آیا ہے گہرے پانی میں
ذہن کے آئینے میں جیسے عکس ترا
کیسے ان لمحوں میں ترے پاس آؤں
ساگر گہرا، رات اندھیری، میں تنہا

"وہ چاہتی ہیں کہ میں کوئی کاروبار کر کے فوراً اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں۔ اس کاروبار کے لیے وہ مجھے چالیس ہزار ایڈوانس رقم بھی دے چکی ہیں۔ انہوں نے مجھے فی الفور موبائل شاپ کھولنے کا کہا ہے۔ مزے کی بات انہیں مرغبانی پر بھی اعتراض نہیں۔"

"سیریسلی آفتاب۔۔۔؟ آپ مرغبانی کریں گے یا دکان پر بیٹھیں گے؟"

"تمہارے لیے تو میں گٹر بھی صاف کر سکتا ہوں۔ گلا چاک کر کے گلیوں کی خاک بھی اپنے سر میں ڈال سکتا ہوں۔ دکان پر بیٹھنا تو بہت عزت دار کام ہے۔ اپنے ہاتھ کی کمائی میں برائی کیسی؟ محنت میں کیا شرم کرنا؟"

آفتاب کے کہنے پر پاکیزہ خاصی شرمندہ ہو گئی۔ وہ شاید نام کی ہی اچھی تھی۔ اس سے کہیں اچھی سوچ تو آفتاب کی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ کی کمائی کھانا چاہتا تھا۔ اس میں برائی ہی کیا تھی؟

ہم اپنے ملک میں ریڑھی لگانے دکان پر بیٹھنے کو برا سمجھتے ہیں لیکن باہر کے ملکوں میں گٹر صاف کرتے ہوئے دانت نکوستے ہیں۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن نکاح کی بات تو وہیں رہ گئی۔" اس نے جو خواب دیکھے تھے لگتا تھا ان کی مدت پوری ہو چکی ہے۔ سو دفعہ امید جڑ رہی تھی اور سو دفعہ ٹوٹ رہی تھی۔ ہر دفعہ امید کے ساتھ دل بھی کچھ ٹوٹ سا جاتا۔

"تمہیں لگتا ہے میں نکاح کی بات رہنے دوں گا؟ میں نکاح کی بات کو جانے دوں گا؟ تم ابھی تک بے یقینی کے سمندر میں غوطہ زن ہو۔ جس طرح پرانے زمانے میں لوگ رسول کو رسول اور نبی کو نبی نہیں مانتے تھے، تمہارے اندر سے بھی میرے متعلق شک کا کیڑا نہیں نکل رہا۔ ایک دفعہ آنکھیں بند کر کے میرا یقین کرو۔ میں تمہاری آنکھوں کے سامنے کا منظر بدل دوں گا، آنسو چرا کر مسکراہٹ لا دوں گا، تمہاری آنکھوں میں خوابوں کی اتنی تتلیاں بھر دوں گا کہ زندگی چمن زار لگنے لگے گی۔"

"بس بس اتنی گاڑھی اردو۔۔۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" پاکیزہ کی ہنسی میں سراہے جانے کی کھنک تھی۔ آفتاب جو باتیں کر رہا تھا وہ واقعی سننا چاہتی تھی اور ساری زندگی ہنستے رہنا چاہتی تھی لیکن پہلے اسے جواز چاہیے تھا۔ حجاب بے حجاب چاہیے تھا۔ اتنے ماہ خود پر قید اس لئے نہیں

لگائی تھی کہ وہ آئے، لفظوں کی مالا پہنائے اور یہ لبیک کہتی ہوئی اس کے پیچھے چل پڑے۔

"یار تمہارے فراق میں اردو فارسی سب رٹ لی ہے۔ اتنے ماہ کا جو غبار اکٹھا ہوا ہے۔ اسے آج کی رات ہی نکل جانے دو۔ ایسا کرو ابھی مجھ سے نکاح کر لو۔" وہ یوں بولا جیسے اتنا ہی آسان تھا نکاح کرنا۔

پاکیزہ نے گڑبڑا کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ گرمیوں کی بارش بھی ہواؤں میں خنکی بڑھا دیتی ہے۔ پاکیزہ کو صحیح معنوں میں احساس ہو رہا تھا جون کی رات اس کے لیئے یخ بستہ ثابت ہو رہی تھی۔ اسے اندر باہر سے ٹھنڈا کر رہی تھی۔

"اس وقت؟ وہ کیسے؟ پاگل تو نہیں ہو گئے آپ؟" وہ بڑبڑائی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں میں نے شادی تم سے ہی کرنی ہے یہ تو طے ہے۔ ابھی اپنے رشتے کو جائز بنانے کے لیے ہم کم از کم نکاح تو کر ہی سکتے ہیں۔"

"لیکن ابھی نکاح کیسے ممکن ہے؟"

"نکاح کیا ہوتا ہے تمہارے خیال میں؟" وہ اس سے ایسے پوچھ رہا تھا جیسے نکاح کوئی نئی دریافت ہو۔

"جب دو لوگ اپنے بڑوں کی موجودگی میں ایک دوسرے کو اپنے بڑوں کی رضا سے قبول کر لیتے ہیں تو وہ نکاح کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔" اس نے اپنے خیال کو الفاظ کا پیرہن پہنایا۔

"تمہارا بڑا کون ہے؟" وہ جواباً سوال پوچھ رہا تھا

"مجھے سمجھ نہیں آ رہی آپ بات کو کہاں سے کہاں لے کر جا رہے ہیں؟"

"افوہ پاکیزہ اگر تم باتیں کرتی رہو گی اپنے سوالات جاری رکھو گی تو میں کبھی اپنی بات سمجھا نہیں سکوں گا۔ تم فی الوقت صرف میرے سوالوں کا جواب دو۔ جو سوال تمہارے دماغ میں کلبلا رہے ہیں ان کا جواب تمہارے میرے سوالات کے جوابات میں پوشیدہ ہیں۔"

"ایک منٹ آفتاب پہلے ایک وعدہ کریں آپ نے پہلے مجھ سے جتنے بھی وعدے کیے ہیں آپ ان پر پورا اتریں گے، مجھے واقعی اپنائیں گے۔"

"اگر تم مجھے بولنے دو تو میں تمہیں ابھی پنا لوں گا۔" وہ دوبدو گویا ہوا۔

"اور اس اپنانے میں کوئی کھوٹ ہوئی تو؟" شک نے پھر سر اٹھایا۔

"تو میں اپنی ماں کا مرا ہوا منہ دیکھوں۔" وہ ایک لمحے کے وقفے کے بغیر بولا۔

"آفتاب! کیسی فضول بات کر رہے ہیں؟" وہ ہل کر رہ گئی۔

" اب تمہیں میرے خیال سے یقین آ گیا ہے۔ اگر آ گیا ہے تو بات آگے بڑھائیں۔

"پہلے آپ وعدہ کریں کہ آپ ایسی بات دوبارہ نہیں کریں گے،"

"ارے بابا میں خود کون سا کرنا چاہتا ہوں ایسی بات؟ میری زندگی میں امی ابو اور تمہارے علاوہ ہے ہی کون؟ لیکن تمہاری بے اختیاری کو قرار دینا بھی تو ضروری ہے ورنہ بات آگے کیسے بڑھے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ یہ بات نہیں دہراؤں گا۔ اب بتاؤ تمہارا بڑا کون ہے؟"

"میری بڑی تسکین پھوپھو"

"ان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟"

☆☆☆☆☆

زمین ہے

یا کچے رنگوں کی ساری پہنے

گھنے درختوں کے نیچے کوئی شریر لڑکی

شریر تر پانیوں سے اپنا بدن چرائے۔۔ چرا نہ پائے!

"کس چیز کی درخواست ہے یہ؟" کرسی پر بیٹھی ہوئی میڈم نے اٹھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے آنکھ اٹھا کر ہاتھ میں تھامے کاغذ کو دیکھے بغیر پوچھا۔

"میری بچی بیمار ہے۔ براہ مہربانی اسے دس دن کی چھٹی دے دیں۔"

"کیا بیماری ہے اسے؟ میڈیکل ساتھ لگائیں۔ ساتھ تو کوئی پرچی بھی نہیں لگی۔"

"وہ جی۔۔ میری بیٹی کو جن پڑتے ہیں"۔

عینک اب آنکھوں سے اتر چکی تھی۔ میڈم حیرت سے منہ کھولے اکیسویں صدی کی معصوم ماں کو دیکھ رہی تھی۔

''آپ کو کیسے پتا کہ آپ کی بیٹی کو جن پڑتے ہیں؟''

"میں ایک سیانے بابا جی کے پاس لے کر گئی تھی۔ انہوں نے بتایا جن نے خود بتایا ہے کہ شاہ نور نے اس پر تھوکا ہے اس لیے وہ پیچھے پڑا ہے۔" ضعیف الاعتقادی کی آخری حد کوئی تھی تو یہی تھی۔

"اور شاہ نور نے جن پر کہاں تھوکا؟" بڑی میڈم کی حیرت ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

"یہیں آپ کے سکول کی کینٹین میں۔۔۔ میری شاہ نور تو گھر میں بھی بار بار سب کو یہی کہتی ہے ادھر نہ جاؤ ادھر جن رہتے ہیں۔" عورت نے اس سادگی سے کہا کہ میڈم کو واقعی خوف آ گیا۔

"آپ نے کلاس ٹیچر سے بات کی ہے؟" وہ اب اس کیس کو فوری ختم کرنا چاہ رہی تھی۔ کم از کم یہ کیس اب اس کمرے سے باہر چلا جانا چاہیے تھا۔

"چوکیدار نے دس دن کی چھٹی دیکھ کر سیدھا آپ کے پاس بھیج دیا۔" عورت بے چارگی سے بولی اسے وہ ڈر یاد آ گیا جو اس دفتر میں داخل ہونے سے پہلے اسے لگ رہا تھا۔

"آپ جا کر شاہ نور کی ٹیچر سے مل لیں۔ وہ مناسب سمجھیں گی تو چھٹیاں دے دیں گی۔ ویسے مشکل ہے کیوں کہ آج کل امتحانات سر پر ہیں۔"

میڈم نے اس بے چاری سے فوراً جان چھڑوائی۔ دفتر کے بہت سے معاملات ان کے منتظر تھے۔ وہ اس طرح کے چھوٹے موٹے کیس اگر دیکھنے لگ جاتی تو رات شاید ادھر ہی ہو جاتی۔

شاہ نور کی ماں اب کلاس کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی وہ سیدھی کرسی پر بیٹھی میڈم کے پاس پہنچی۔

"میڈم میڈم! شاہ نور کی امی آئی ہیں۔" بچیوں نے غالباً شاہ نور کی والدہ کو دیکھ رکھا تھا، فوراً اپنی استانی کو مطلع کیا۔

استانی صاحبہ فوراً چونک گئی۔

"یہ شاہ نور کی چھٹی کی درخواست۔۔۔" ابھی بات منہ میں ہی تھی کہ میڈم نے کہنی سے پکڑ کر انہیں کلاس سے باہر جا کر کھڑا کیا۔

"آپ کی بیٹی خیریت سے گھر پہنچ گئی ہے؟" میڈم سوال پوچھ رہی تھی اور عورت کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"جی پہنچ گئی ہے۔ دو دن سے کچھ کھا نہیں رہی۔ میں بڑی پریشان ہوں۔ سکول میں آیا کی نوکری کرتی ہوں۔ باپ میرے بچوں کا ہے نہیں۔ بڑا بیٹا حادثے میں مر گیا۔ اب میری ساری امیدیں اسی بیٹی سے وابستہ ہیں۔ اس نمانی کو بھی اب جن پڑنے لگ گئے ہیں۔"

عورت نے میلے دوپٹے کی کناری سے آنکھ سے آئے آنسو کو صاف کیا۔

"جن؟ کیا مطلب؟" میڈم جی بھر کر حیران ہوئی۔

"آپ کو نہیں پتا آپ کی بیٹی ایبٹ آباد گئی تھی؟" انہوں نے اچنبھے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی مجھے پتا ہے۔ مجھے سب پتا ہے۔ اس کو جو چیزیں نظر آتی ہیں وہ اسے سکول نہیں آنے دیتی۔ وہ اس بے چاری کو جانے کہاں کہاں گھماتی رہتی ہیں۔ میری بچی اپنے بس میں نہیں ہوتی۔ میرا شوہر عظیم کہتا تھا بانو یہ میری گڑیا ہے۔ باپ نہ رہا تو گڑیا رل گئی۔ میرے عظیم کی گڑیا رل گئی۔" بانو کا رونا تھمنے میں نہیں آ رہا تھا۔

میڈم کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے۔ خطرناک حد تک غصے کی وجہ سے ناک کی پھنگ پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

"جھوٹ بول رہی ہے وہ۔ میں آپ کو بتاتی ہوں۔ اس کو کون سے جن نظر آتے ہیں۔"

بانو نے بے چارگی سے میڈم کو دیکھا۔ اس کا دل پتے کی طرح لرزنے لگا جو بس شاخ سے گرا ہی چاہتا تھا۔ گھر کی عزت چوک میں تار تار ہونے والی تھی۔

میڈم نے بانو کو ساتھ لیا اور اپنے کیبن میں لے آئی۔

"آپ کی بیٹی ڈیٹ پر گئی تھی۔" انہوں نے انکشاف کیا۔

"دیکھیں جی میری بیٹی پر الزام نہ لگائیں۔" بانو نے بہت کمزور سا احتجاج کیا۔ اتنا کمزور کہ حقیقت سے واقف لگتا تھا۔

"آپ کچھ نہیں بولیں۔اب صرف سنیں! آپ کی بیٹی ہفتے میں تین چھٹیاں لازمی کرتی ہے۔میں نے بہت سمجھایا اور بہت پوچھا۔ سمجھانے کا اثر نہیں ہوا پوچھنے پر جواب ملا کہ امی بیمار ہیں۔گھر کے سارے کام میں نے کرنے ہوتے ہیں۔امی کی دیکھ بھال بھی کرنی ہوتی ہے۔میں نے اسے کہا پڑھائی زیادہ ضروری ہے۔" میڈم ایک مخصوص سپیڈ سے شروع ہو چکی تھی۔

بانو نے بڑی مشکل سے میڈم کے سانس لینے کا انتظار کیا۔

"لیکن میڈم میں تو نوکری پر جاتی ہوں تین چھٹیاں کروں میری تو نوکری ہی چھوٹ جائے۔۔۔وہ چھٹیاں کس کے لیے کرتی رہی؟" بند دروازے کی طرف تکتے ہوئے بانو کے لیے اب اپنا سانس لینا مشکل ہو گیا۔

"میں سب جانتی ہوں آپ خاموشی سے فقط میری بات سنیں۔بیچ میں برائے مہربانی کچھ نہ بولیں۔" میڈم نے نرمی سے بانو کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا اور دوبارہ گویا ہوئی۔

"شاہ بانو نے میری باتوں پر زیادہ توجہ نہ کی۔میں اس وجہ سے لحاظ کرتی رہی کہ چلو بچی کی والدہ بیمار ہیں۔خیر ایک دن دوسرے سیکشن کی بچی نے مجھے آکر بتایا کہ شاہ نور سکول کے پاس پہنچتے ہی کہنے لگی میں نے آج میم سے چھٹی لی تھی اب اگر سکول گئی تو وہ ناراض ہوں گی۔یہ کہہ کر وہ واپس مڑ گئی اور سکول نہیں آئی۔"

اگلے دن میں نے شاہ نور سے پوچھا تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگ گئی۔میں نے آپ کے پی ٹی سی ایل نمبر پر کال کی ہمیشہ کی طرح گھنٹی بجتی رہی۔کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ایک دو دفعہ ایسا ہوا کہ سکول آتے آتے وہ کسی گلی میں مڑ گئی۔میں نے سکول کے چوکیدار کو آپ کے گھر بھیجا آپ کے گھر پر تالہ لگا ہوا تھا۔

کل مجھے شاہ نور کی سہیلیوں نے بتایا کے شاہ نور ڈیٹ پر گئی تھی کسی لڑکے سے ملنے۔۔۔اور وہاں جانے کیا ہوا کہ واپس آئی تو بیمار ہو گئی ہے۔ہاتھ پاؤں مڑنے والی کہانی بھی بچی بتا چکی ہے۔شاید وہ کل آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے گھر بھی گئی تھی۔اسے میں نے اسی لیے بھیجا تھا کہ وہ آپ کو بلا لائے لیکن شاہ نور نے اسے بھگا دیا۔جو بچی کل آپ کے گھر گئی تھی اس نے یہ بھی بتایا کہ شاہ نور ایک لڑکے سے ملنے گئی تھی اور آگے پانچ نکلے ٹخنوں پر آنے والے زخم سوزوکی میں بار بار گھسیٹے جانے کی وجہ سے ہیں۔شکر کریں کہ آپ کو آپ کی بچی زندہ مل گئی ورنہ آج کل تو صرف لاشیں ملتی ہیں''۔

بانو سسکیاں لے کر رونے لگی۔اسے رہ رہ کر پی ٹی سی ایل کی اتری ہوئی تار یاد آرہی تھی جو ہر دفعہ صفائی پر اس کا منہ چڑاتی تھی اور بانو حیران ہوتی تھی کہ یہ اتر کیسے جاتی ہے۔آج اسے سب سمجھ آرہا تھا۔

"میڈم جی میں نے اسے لاکھ منع کیا تھا کہ دوستوں سے موبائل لے کر نہ آ لیکن مجھے کہتی تھی موبائل پر پڑھتی ہوں۔اب میں غریب کیا کرتی۔صبح سویرے اس کا ناشتہ تیار کر کے سکول کے لیے نکل جاتی تھی۔میرا سکول پہلے لگتا ہے ورنہ خود اسے چھوڑنے

آتی۔ تھوڑا شک تو مجھے بھی پڑا تھا لیکن مجھے لگتا ہے اس دفعہ واقعی کسی جن نے واردات کی ہے۔ میری بچی بے چاری کل سے کچھ کھا نہیں رہی۔" ماں کا دل ابھی بھی رو رہا تھا۔

"بے چاری وہ نہیں بے چاری آپ ہیں۔ چھوڑ دیں اسے اس کے حال پر۔ دو تین دن میں خود ٹھیک ہو جائے گی۔ اپنی غلطی سے گری ہے اٹھ بھی جائے گی۔ اب میں اسے اور گرنے نہیں دوں گی۔ اس کی فکر چھوڑ دیں۔ اپنا خیال رکھیں۔ اولاد ہے ہی بے وفا۔ اس کے پیچھے اپنی ہڈیاں گلانا چھوڑ دیں۔ آپ بس یہ مہربانی اس پر کریں کہ صبح جاتے وقت سکول چھوڑ جائیں اور واپسی پر خود لے لیں۔" میڈم نے بانو کی دھنسی ہوئی آنکھوں پر رحم کی نظر کی۔

"میرا اسکول سات بجے لگتا ہے۔ اس کا ساڑھے سات آدھ گھنٹہ پہلے کیسے چھوڑ دوں۔" بانو کی پریشانی اپنی جگہ قائم تھی۔

"میں کل سے سات بجے آجایا کروں گی۔ آپ سکول جانے سے پہلے اسے میرے حوالے کر کے جائیں جب تک آپ چھٹی ٹائم نہیں آئیں گی۔ میں اس کے ساتھ ہی رہوں گی۔" میڈم نے تسلی دی۔

"حق ہاہ! چھوٹا کہتا ہے آپا وکیل بنے گی۔ اماں آپا سے کام نہ کروا۔ دیکھ آپا کیسے وکیل بن گئی ہے۔۔۔ خود ہی مریض بنی خود ہی چارپائی پر پڑی۔" بانو ابھی بھی رو رہی تھی۔

"اس کی دو سال بعد شادی کروا دیں۔"

" شادی کیا خاک کرواؤں؟ اس کو کام کرنا نہیں آتا۔"

"جو اس کو آگیا ہے اس کے بعد صرف شادی ہی ہو سکتی ہے۔ آپ بات کو سمجھیں۔۔۔ جب بچیوں کے دماغ بالغ ہو جائیں تو انہیں گھر بیٹھا کر چاند چڑھنے کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ غلطی آپ کی بچی کی بھی نہیں ہے۔ آپ ایک دفعہ اس سے موبائل لے کر پوچھتی تو سہی کہ وہ کیا پڑھ رہی ہے۔ اسے وکیل بنانا تھا تو اس کے سکول آکر اس کی پڑھائی کی خیر خبر لیتی لیکن تب آپ سوئی رہی۔ خیر دو دن میں بچی کو سکول لے کر آئیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ جو سبق اسے زندگی سے ملا ہے۔ اسی سبق کا استعمال کر کے اس کی زندگی کو پازیٹیو سمت میں ڈھال دوں۔ اگر نہ ڈھال سکی تو بس اتنی سی درخواست ہے کہ گھر میں جو پہلا رشتہ آئے اور بچی کی مرضی شامل ہو بچی کو رخصت کر دیجئیے گا"۔

"دل تو کرتا ہے گھر جا کر چار چوٹ لگاؤں۔" آنسوؤں کی جگہ اب غصے نے لے لی۔

"چار چوٹ کھا کر آئی ہے آپ نے مزید چار چوٹ لگائی تو اسے چار چوٹ کا نشہ پڑ جائے گا۔ چار چوٹ کھانے پھر باہر نکل جائے گی" اس زہر کا تریاق کرنا ہے تو چوٹ پر مرہم رکھیں"۔

اچھا بہت شکریہ میڈم جی! آپ پلیز اس بات کو اپنے تک رکھئیے گا۔" آنکھوں میں درخواست جوش مار رہی تھی۔

"وہ میری اپنی بچی ہے۔ میری بیٹیوں کی جگہ۔۔۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔" میڈم نے اٹھ کر بانو کو گلے لگا لیا تھا۔

"ہم نے تو اولاد کو سب کچھ دیا۔ اپنے منہ کا نوالہ دیا۔ اپنے اوڑھنے پہننے کی فکر نہیں کی۔ ان کی سب چیزیں پوری کی اور آج یہی اولاد ہمیں کیا دے رہی ہے۔۔۔ صرف اور صرف تکلیف اور اذیت! میں میٹرک پاس تھی تو مجھے سکول میں ملازمت مل گئی۔ آنے والے دور میں تو کوئی میٹرک پاس سے جوتے بھی صاف نہ کروائے۔ اسی اولاد کی بہتری کے لیئے چاہتی ہوں کہ یہ پڑھ جائیں۔ کمی ہماری طرف سے نہیں ہے۔ ان کا اپنا ہی دل نہیں ہے پڑھنے کا۔" بانو روتے ہوئے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔

"بانو معاف کیجیئے گا۔ اولاد کو صرف رہنے کی جگہ، کھانے کی خوراک اور پہننے کو لباس نہیں چاہئیے ہوتا۔ اسے توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم بچوں کی جسمانی ضروریات پوری کر دیتے ہیں لیکن ان کی جسمانی ضروریات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ آپ کے گھر میں ٹی وی ہے۔ ٹی وی بذات خود کیا ہے ایک خالی ڈبہ۔۔ اس بے جان ڈبے کو جب بجلی فراہم کرتے ہیں تو رنگارنگ دنیا کی عجیب وغریب چیزیں ہمارے سامنے آجاتی ہے اسی طرح ہماری اولاد ہے۔ ہماری اولاد تو بے جان بھی نہیں ہے۔ ہم جب اپنی اولاد کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں تو وہ بھی بہت سی چیزوں کو جذب کرتی ہے۔ سب باتوں کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ اپنے تیئں وہ جو محسوس کرتے ہیں ہمیں بتانا چاہتے ہیں تو ہم کہتے ہیں رہنے دو، تمہاری تو فضول ہی باتیں ہیں۔ ایسے وقت میں اگر ان بڑھتے ہوئے بچوں کی فضول سی باتوں کو کوئی سامع مل جائے چاہے وہ ان کو صحیح سمجھے یا غلط سمجھے لیکن کم از کم ان کو سن لے تو وہ سامع اولاد کو والدین سے زیادہ عزیز ہو جاتا ہے۔ یہ گھر کا، گھر کے ماحول کا، گھر والوں کا دیا گیا خلا ہوتا ہے جسے باہر کی دنیا پُر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ابھی بھی آپ کے پاس وقت ہے۔ گھر جائیں۔ اپنی بچی کی بات سننے کی کوشش کریں۔ اگر آپ نہیں سنیں گی وہ دوسروں کو سنائے گی۔ آپ اس غلطی کو اس کی آخری غلطی بھی بنا سکتی ہیں اگر اس کو اپنے پیٹ سے کاٹ کر دیئے گئے نوالوں کے ساتھ شیر سی نظر میں رکھیں۔" بانو کے کندھے کو تھپتھپاتی ہوئی وہ بہت نرم لہجے میں اسے سمجھا رہی تھی۔

بانو کی نظروں میں وہ تمام مناظر سما گئے تھے جب جب اس نے اپنی مصروفیات کی وجہ سے ماہ روش کو جھڑکا تھا۔ وہ بھوکی نظروں سے ماں کی توجہ کی متلاشی رہتی اور ماں کہیں سب جھجک نہ مٹ جائے کا ڈر لیے اسے جھڑکتی رہتی۔

"کاش میں بھی خوب پڑھی لکھی ہوتی۔" بانو کے منہ سے بس یہی نکل سکتا تھا۔

"سمجھدار ہونے کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اب آپ فکر نہ کریں۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ کل کی سوچیں۔" میڈم نے بانو کو تسلی دی۔

بانو سسک پڑی اور آنسو پونچھتی کمرے سے نکل گئی۔ میڈم نے بانو کی نظروں سے نظریں چرائی تھی۔

اگر محبت دھوکے کا نام ہے تو توبہ ایسی محبت سے۔۔۔

اگر محبت رشتے کھونے کا نام ہے تو میں تائب ایسی محبت سے۔۔۔

محبت کب تک دھوکہ بن کر سچے رشتے نگلتی رہے گی؟

محبت کب تک آہ بن کر ماضی کی صورت یاد آتی رہے گی؟

محبت کب تک زنجیر بن کر گھروں میں باندیاں بڑھاتی رہے گی؟

آخر اس دھوکے باز محبت کا پیٹ بھر کیوں نہیں جاتا؟

اس پتھر محبت سے کانچ سی لڑکیوں کا دل اوب کیوں نہیں جاتا؟

وہ کیوں نہیں کہتی۔۔

نہیں!

محبت اب اور نہیں!

☆☆☆☆☆

اک پری ہے گھاس پر لیٹی ہوئی

اور دھند میں سوئی ہوئی

اور میں اس کی سمندر جیسی گہری گہری آنکھوں کے

کسی سپنے میں ہونا چاہتا ہوں

رات بھر شبنم میں رونا

گھاس کی نرمی بونا چاہتا ہوں

سانس اپنی

اس کی پلکیں اپنی آنکھوں میں ڈبونا چاہتا ہوں

میں بھی سونا چہتا ہوں

نیند اس کی

خواب اس کا

میں بھی ہونا چاہتا ہوں

"شرعی حیثیت۔۔شرعی حیثیت تو کوئی نہیں۔۔" بہت سوچ کر پاکیزہ کے پاس دینے کو یہی جواب تھا۔

"کہیں تم نے سنا کہ لڑکوں کے لیے بھی ولی کی شرط ہوتی ہے یا سم تھنگ ایلس لائک دز؟" وہ بڑی سنجیدگی سے اگلا سوال کر رہا تھا۔

"لڑکے تو جب چاہتے ہیں اپنی مرضی سے شادی کر سکتے ہیں۔لڑکیوں کے لیے ہی ولی کا سین سنا ہے۔لڑکے تو اہل کتاب سے بھی نکاح کر سکتے ہیں۔" پاکیزہ کو ان سوالات کی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی لیکن وہ جواب دے رہی تھی۔

"یعنی میں تم سے ابھی نکاح کر سکتا ہوں۔" وہ حتمی لہجے میں بولا۔

"ابھی۔۔۔ نکاح۔۔ یہ کیسے ممکن ہے آفتاب اور میں ایسے نکاح کیسے کر سکتی ہوں۔ نکاح کے لیے گھر والوں کا ماننا ضروری ہے۔ گواہ ضروری ہیں۔ کل کو اگر آپ کے گھر والوں نے مجھے تسلیم ہی نہ کیا تو میں کہاں اسٹینڈ کروں گی؟" پاکیزہ کے سر پر افتاد پڑی تو وہ بغیر سوچے سمجھے بلبلا اٹھی۔

"اگر ہمارے پاس نکاح نہیں ہو گا تو ہمارے پاس جواب باقی رہے گا۔ تم بار بار مجھ سے روٹھو گی مجھ سے دور جاؤ گی اور میں تمہیں روٹھا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہیں خود سے دور نہیں دیکھ سکتا۔ پاکیزہ گواہ میرے پاس ہیں۔ نکاح ایجاب و قبول ہی تو ہے۔ مولوی کا نکاح پڑھانا لازم و ملزوم نہیں ہے۔ ایجاب و قبول بس ضروری ہے۔" آفتاب نور کے انداز میں قطعی پن کا گہرا رنگ تھا۔

"آفتاب یہ سچ ہے کہ میں آپ سے بار بار روٹھتی ہوں لیکن جو حل آپ لے کر آئے ہیں وہ ناقابل عمل ہے۔ میری سمجھ میں آپ کی جنونیت نہیں آ رہی۔" پاکیزہ سر ہاتھوں میں گرا کر وہیں بیٹھ گئی جہاں کھڑی تھی۔

"تم مجھ سے پیار کرتی ہو یا نہیں؟" سوال ہٹ دھرمی سے پوچھا گیا۔

"میں آپ سے۔۔۔ محبت کرتی ہوں لیکن" بہت مشکل سے شرم سے لاج سے اقرار نکلا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں اصل میں تم محبت ہی نہیں کرتی۔ محبت میں کرتا ہوں۔ میری محبت میں تو کبھی لیکن ویکن نہیں آتا۔ تمہاری محبت میں کیوں آتا ہے؟ آج فیصلہ ہو گا۔ میں اس وقت مسجد کے باہر بیٹھا ہوں۔ میرے پاس کانچ کی تین بوتلیں پڑی ہیں۔ تم مجھے ہاں کہو گی۔ اگر ہاں نہیں کہو گی تو میں بوتل اپنی بازو پر توڑ کر اپنی شہہ رگ کاٹ لوں گا۔ جب تک یہاں کوئی آئے گا تب تک مجھے اس زندگی سے نجات مل چکی ہو گی جس میں تم میرے ساتھ نہیں ہو۔" وہ انتہائی دو ٹوک لہجے میں باور کرا رہا تھا کہ جو وہ کہہ رہا ہے وہ کر بھی سکتا ہے۔

وہ ڈر گئی۔ جو شخص ماں کا مرا ہوا منہ دیکھنے کی بات کر سکتا تھا وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔

"آپ خود کو کچھ نہیں کریں گے۔ بالکل کچھ نہیں کریں گے۔ جو آپ چاہیں گے بالکل وہی ہو گا۔ اگر میری محبت کا ثبوت یہی ہے تو یہی سہی۔ میں نے بھی زندگی آپ کے ساتھ گزارنی ہے۔ آج ہی فیصلہ کر لیتے ہیں۔" پاکیزہ آنسو پرے دھکیلتے ہوئے بولی۔

ایک یہ الزام کہ میں محبت نہیں کرتی۔ دوسرا یہ جرم کے مجھے ان کی زندگی سے فرق نہیں پڑتا حالانکہ میں نے صرف اسی ایک شخص سے محبت کی ہے آج انہیں بھی پتا چل جائے کہ مجھے ان سے واقعی محبت ہے۔

پاکیزہ خود کو کہہ رہی تھی۔

کتوں کے بھونکنے کی آواز بتا رہی تھی کہ آفتاب نور واقعی گھر سے باہر ہے۔

"یعنی تم نکاح کے لیئے راضی ہو؟" سوال پھر دہرایا گیا

"ہاں راضی ہوں لیکن گواہ کہاں ہیں؟"پاکیزہ نے کڑوا گھونٹ بھرا۔

"اب تمہیں یہ بھی سمجھانا پڑے گا۔ یہ بتاؤ عورت کی گواہی کیسے کنسیڈر ہوتی ہے اور مرد کی کیسے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"مرد کی ایک اور عورت کی آدھی۔"پاکیزہ کو اب آفتاب کی ذہنی حالت پر شک ہوا۔

اللہ کی گواہی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"وہ بہت میٹھے لہجے میں بولا تھا۔

"کیا مطلب؟"حیرت نے لب وا کر دیئے۔

"دیکھو مرد کی ایک گواہی ارو عورت کی آدھی تو سب سے اچھا نکاح وہ جس کا گواہ اللہ ہو۔"وہ رسان سے سمجھانے لگا۔

"کیا اس طرح نکاح ہوتا ہے؟"وہ شبے میں پڑی تھی۔

"تمہیں لگتا ہے میں ہوائی باتیں کر رہا ہوں؟ میں پاگل لگتا ہوں؟ اگر تمہیں میرے خلوص پر شک ہے تو ہاں نہ کہو۔ میں نے اپنے اسلامیات کے ٹیچر سے تفصیل سے پوچھا ہے تب ہی اتنی بڑی بات کر رہا ہوں۔"وہ تھوڑا سا تلخ ہوا۔

"میرا مطلب ہے نکاح کے لیے بالغ ہونا بھی ضروری ہے میرا تو آئی ڈی کارڈ ہی نہیں بنا اور پھر حق مہر بھی تو ہوتا ہے وہ موجل اور غیر موجل شاید؟"دل میں کچھ کھٹک رہا تھا۔

"پاگل ہم حکومت پاکستان کے لیے نکاح نہیں کر رہے۔ ہم اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کے قابل بنا رہے ہیں ایک دوسرے کو۔ اسلامی لحاظ سے تو ہم بالغ ہی ہیں۔ حق مہر کا مسئلہ بھی حل کر لیتے ہیں۔"وہ بڑے تحمل سے بول رہا تھا۔ سارا ہوم ورک کر کے آیا تھا۔

اب آپ پلیز کاروبار والے پیسے مجھے دینے کا مت سوچ لینا۔"پاکیزہ زچ ہوئی۔

"تمہیں وہ پیسے دینے کا نہیں سوچا لیکن اگر تم لینا چاہو تو وہ بھی میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ جو تم چاہو گی وہی ہو گا۔ جو میرے دماغ میں حق مہر کو compensate کرنے کا طریقہ ہے وہ یہ ہے کہ ہم ایک ہینڈ سم اماونٹ سوچ لیتے ہیں۔ فرض کیا بیس ہزار۔۔۔ ایک نکاح ہمارا شادی کے وقت سب کے سامنے بھی ہو۔ گا بیس ہزار میں سے دس میں اس وقت دے دوں گا اور دس تم مجھے معاف کر دو اگر چاہو تو بیس کے بیس لے لینا۔ وہ دس جو تم معاف کرو گی وہ ابھی کا حق مہر سمجھ لو"وہ بڑے آرام سے سب طے کر کے بیٹھا تھا۔"

"آپ صبر نہیں کر سکتے؟ میں جواز نہیں ڈھونڈوں گی۔ یہ سب بہت جلدی ہو رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کے کچھ غلط نہ ہو جائے۔"ایک کمزور سا احتجاج بلند ہوا۔

دوسری طرف مکمل خاموشی چھا گئی۔ ساتھ ہی چھناکے کی آواز ابھری۔ کانچ کی بوتل ٹوٹ چکی تھی۔

☆☆☆☆☆

دعا تو جانے کون سی تھی

ذہن میں نہیں

بس اتنا یاد ہے

کہ دو ہتھیلیاں ملی ہوئی تھیں

جن میں ایک میری تھی

اور اک تمہاری!

پاکیزہ کی چیخ نکل آئی۔اس شخص کو وہ ایک دفعہ انکار کر چکی تھی جب اس نے کہا تھا وہ غلط کام کرے گا کیوں کہ تب تک پاکیزہ کے دل میں کچھ بھی نہیں تھا۔تب اسے فرق نہیں پڑا تھا۔آج اسے اس شخص سے فرق پڑتا تھا۔بہت فرق پڑتا تھا۔اس کی ساری زندگی میں وہی تھا۔بس وہی تھا جو سارا جہاں تھا، سامع تھا، دوست تھا، غمخوار تھا۔وہ اس کو ہاتھ سے جانے دیتی پھر کیا کرتی؟ پھر اس کی زندگی میں کیا رہ جاتا اور اگر جو یہ شخص زندہ ہی نہ رہتا تو پھر کیا ہوتا؟

کیا وہ یہ غم برداشت کر سکتی تھی کہ یہ شخص صرف اس کی اپنی وجہ سے ہی دنیا سے چلا جائے؟

دل نے چلا کر کہا نہیں۔۔۔!

نہیں۔۔۔ !

"پلیز نہیں، پلیز آفتاب نہیں اپنے آپ کو کچھ نہیں کرنا۔آپ جو کہیں گے میں اس کے لیے تیار ہوں۔"سسکتے ہوئے اس نے اپنے دماغ کو سلایا تھا۔

دل دھڑکنے لگا۔آفتاب نے بہت نرمی سے اس کی آنکھوں کی نمی کو پیا اور پو پھٹنے سے پہلے ہی نسیمِ سحر نے "قبول ہے" کہا اور "قبول ہے" سنا۔

"اب تم مجھ سے دور نہیں جا سکو گی۔" آفتاب اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

"میں پہلے بھی دور نہیں جانا چاہتی تھی۔"اس نے پیار بھرا اعتراف کیا۔

"نہیں جانا چاہتی تھی پھر بھی گئی تھی۔تمہیں اندازہ نہیں میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔"

"اتنا پیار کرتا ہوں کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔اتنا پیار کرتا ہوں کہ مر تو سکتا ہوں لیکن تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔اتنا پیار کرتا ہوں کہ تم چاہو بھی تو تو بھی تم سے دور نہیں رہ سکتا۔"اسے جیسے کسی نے چھیڑ دیا تھا۔

پاکیزہ نے شکر کے کلمات ادا کیئے۔

دنیا میں اللہ نے اس کے لیے کتنا اچھا ساتھی چنا تھا جسے وہ آخرت کے لیے بھی مانگ سکتی تھی۔ایسا ساتھی جو اس کے شکوک کو نظر انداز نہ کرتا بلکہ ختم کرتا تھا۔جس کے لیے پاکیزہ کی اہمیت تھی۔

یہ اہمیت انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔۔۔اہمیت حاصل کرنے کے چکر میں لوگ دولت کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ محبت کے گھٹنے پکڑتے ہیں۔ علم کی چوکھٹ پر دھرنا دیتے ہیں۔ آخر میں یہ اہمیت اہمیت نہیں رہتی۔ روزمرہ زندگی کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس بات کا ادراک ہوتے ہی جب انسان مزید اہمیت کی کوشش کرتا ہے تو وہ ملیامیٹ ہو جاتا ہے پھر کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ جو باقی رہتا ہے اسے کتبہ کہتے ہیں!

آفتاب کے سریلے سر سنتے سنتے پاکیزہ نے نیند کی وادی میں قدم رکھ دیئے۔

ساری رات حسین خواب اس کی آنکھوں کے لیے امید لاتے رہے۔

خوش گمانیوں کے پھول اس پر خوشبو نچھاور کرتے رہے۔

پیار کے موسم اس کی بلائیں لیتے رہے

اور

جو از اپنا سر پٹختارہ گیا!

☆☆☆☆☆

دشتِ غربت میں جس پیڑ نے

میرے تنہا مسافر کی خاطر گھنی چھاؤں پھیلائی ہے

اس کی شادابیوں کے لئے

میری سب انگلیاں۔۔۔

ہوا میں دعا لکھ رہی ہیں۔

آپ تیز چل رہے ہیں یا آہستہ زندگی آپ کو دیکھنے کے لیے نہیں رکتی۔ آپ کے چلنے رکنے یا گرنے سے زندگی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زندگی نے دو سال ایک ہی جست میں طے کر لیے لیکن پاکیزہ پیچھے مڑ کر دیکھ سکتی تھی کہ زندگی نے اسے کیا دیا ہے۔ کتنے ہی قیمتی لمحات تھے جو اس کی گود میں نگینے کی طرح دمک رہے تھے۔

وہ ابھی بی ایس کیمسٹری کر رہی تھی۔ اسے یہی کرنا تھا میڈیکل میں داخلہ نہ ہو سکا تو اس نے ایک سال مزید محنت کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ محنت کر کے وقت کو کیوں ضائع کرتی۔ اس نے پوری ایک نسل کی تربیت کرنی تھی۔ بی ایس کیمسٹری کے تیسرے سال میں پہنچ کر وہ آفتاب نور کو ایسے ہی دیکھتی تھی جیسے اس نے کھڑکی سے نیچے جھانکتے ہوئے دیکھا تھا۔ حسین مجسمے کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا وہ اور بھی خوبصورت ہو گیا تھا۔ یہ اور بات کے پاکیزہ آج بھی اسکے لیے مقدس صحیفہ تھی۔

کبھی کبھی وہ پاکیزہ کو بنگالی حسینہ کہہ کر بلاتا وہ چھڑ جاتی تو اسے بتاتا کہ حسن کا جو سوز بنگال میں پایا جاتا ہے وہ اندھی محبت جیسا ہے۔

جب سر چڑھتا ہے تو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

خود آفتاب نور بی کام کر رہا تھا۔ تین چار سپلیاں تھیں لیکن وہ تو آنی تھیں۔ وہ صرف پڑھتا تو نہیں تھا اپنے خواب سینچتا تھا۔ چھوٹا سا پولٹری فارم کھول کر سارا دن مرغیوں کے حساب کتاب میں مصروف رہتا۔ جلد سے جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا تا کہ جس لڑکی کے اتنے سالوں سے خواب دیکھ رہا ہے اسے حقیقت میں ساتھ دیکھ سکے۔

پاکیزہ نے پینٹنگ چھوڑ دی تھی۔ ہر مقابلہ ہی ایسا تھا جس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی ہوتے تھے۔ وہ اپنا شوق پروان چڑھاتی یا اپنا رشتہ۔۔۔ رشتہ بہر کیف ہر شے سے زیادہ ضروری تھا۔ شوق اکثر دل کے راستے انگلیوں میں آتا اور پوریں کھجانی پڑ جاتیں۔ ایسے میں وہ بڑی خاموشی سے اپنے کمرے میں آنکھیں تصویر کرنے لگتی۔ اسے صرف آنکھیں تصویر کرنا اچھا لگتا۔ وہی دو آنکھیں ۔۔۔ شرافت سے جھکی ہوئی، کبھی تقدس سے بھری ہوئی، محبت کا اظہار کرتی ہوئی، کبھی شرارت سے اصرار کرتی ہوئی۔۔۔!

وہ ان دو آنکھوں کو اتنی دفعہ تصویر کر چکی تھی کہ اسے کچھ بھی اور بنانا بھول گیا تھا۔ وہ اسی میں خوش تھی کیوں کہ وہ بھی اسی میں خوش تھا۔

کوئی غلط مطالبہ نہیں تھا صرف محبت تھی۔۔۔ ایسی محبت جو آج کل نہیں ہوتی جو شاید کرہ ارض پر اس سے پہلے بھی کسی نے نہیں کی ہو گی۔

پاکیزہ آنکھیں موند کر دیکھتی تو دو سالوں کے دامن سے لپٹی وہ واحد خوبصورت ملاقات گلاب کی کلی جیسی لگتی عید آئی تھی۔

وہ پاکیزہ کے سر ہوا تھا۔

"میرے نام کی مہندی لگاؤ تم۔"

"مرغیوں کے ساتھ مہندی کا بھی کاروبار کر لیا؟" محبت کی ایک ادا شوخی بھی تو ہے۔

"تم چاہو تو عین ممکن ہے یہ بھی کر لوں۔" اس نے سر خم کیا۔

"جی پہلے تین سپلیاں ہیں پھر تین اور آجائیں گی۔"

"تم مجھے طعنہ دے رہی ہو؟"

"ارے نہیں بابا۔"

"تم طعنہ دے چکی ہو۔ پاکیزہ تمہارے سامنے ہے اکثر گھر لیٹ جاتا ہوں۔ جتنا وقت ہوتا ہے پڑھتا رہتا ہوں۔" وہ سچ کہہ رہا تھا۔

"ان دو سالوں میں سے کوئی ایسی رات بتائیں جب آپ کے گھر پہنچنے سے پہلے میں سو گئی ہوں؟ جب میں نے آپ کے گرد آیت الکرسی کا حصار کھینچ کر آپ کو گھر نہیں بھیجا۔ مجھے آپ کے خلوص اور آپ کی نیت پر شک ہوتا تو آج تک ہم ساتھ نہ ہوتے۔"

جھوٹ وہ بھی نہیں بول رہی تھی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ آج تک کوئی صبح تمہارے میسج کے بغیر نہیں ہوئی۔ کسی رات میں تم سے بات کیے بغیر نہیں سویا۔ تم کنارا ہو میرا۔ زندگی کی بے رحم موجوں سے تمہارے ہی سہارے لڑ رہا ہوں۔ بھائی گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ دادی کی ڈیتھ ہوئی لیکن تمہارے ساتھ ہونے سے کوئی غم غم نہ رہا۔ ہمارا رشتہ جتنا نازک ہے اتنا ہی مضبوط بھی ہے۔ ایک بات تمہیں بھی ماننی چاہیے کہ میں تمہاری وجہ سے ساتھ نہیں ہوں۔ تم میری وجہ سے ساتھ ہو۔ تمہارے بس میں ہوتا تو بھاگ جاتی۔"

" آپ پھر خود کریڈٹ لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

" چلو کریڈٹ تم رکھ لو۔ اپنا آپ مجھے سونپ دو۔"

"آفتاب!" آواز میں تنبیہہ تھی۔"

"مہندی لگا رہی ہو نا پھر؟" وہ فوراً سنجیدہ ہوا تھا۔ احتیاط وہ بھی کرتا تھا صرف وہ نہیں کرتی تھی۔

"جی لگانے لگی ہوں۔"

فون رکھ کر بڑی مشکل سے اس نے مہندی کے بیل بوٹوں میں آفتاب کا نام چھپایا تھا۔

"تصویر ایم ایم ایس کروں؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"میں خود دیکھوں گا" اس نے مختصر جواب دیا۔

پاکیزہ نے آگے سے ضد نہیں کی وہ یہی چاہتی تھی۔ آفتاب کا تو یہ حق بھی تھا۔

☆☆☆☆☆

چہرہ میرا تھا، نگاہیں اس کی
خامشی میں بھی وہ باتیں اس کی
میرے چہرے پہ غزل لکھتی گئیں
شعر کہتی ہوئی آنکھیں اس کی
شوخ لمحوں کا پتہ دینے لگیں
تیز ہوتی ہوئی سانسیں اس کی

آرٹس کونسل میں حسب تقریب گہما گہمی تھی۔ لوہے کی باڑ کے کٹاؤ میں سے دھوپ چھن کر گھاس پر سنہری نقش و نگار بنا رہی تھی۔ کچھ لوگ ذوق بڑھانے کو کچھ لوگ شوق کی دکان چمکانے کو اس ایگزبیشن میں آئے تھے۔ کچھ چہروں پر یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ زبردستی لائے گئے ہیں۔ وہ آہنی دروازے سے داخل ہو کر ایک طرف کھڑی ہو چکی تھی۔

کالے گھٹنوں تک آتے فراک میں وہ اپسرا الگ رہی تھی۔ بنگالی حسینہ کے نمکین بازو عیاں ہوتے دل آویز محسوس ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے پر پہلا قدم اٹھانے کی تکلیف رقم تھی۔ جھجک سے اس کی ہتھیلیاں پسینے میں تر ہونے لگی۔ سر پہ ہلکا سا اوڑھا دوپٹہ اچانک پھسلا۔ دوپٹہ ٹھیک کرنے کو نظریں اٹھائیں تو دشمنِ جاں سامنے تھا۔ وقت نے اس کے نقوش کو حسین تر بنایا تھا۔ آنے والے کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے خیال میں حسن نے اپنی فیاضی پری پیکر پر زیادہ ہی کی ہے۔ بنگالی حسینہ کے گال کچھ زیادہ ہی لال ہو گئے۔

"السلام علیکم!" سلام میں پہلا آفتاب نے کی۔

"وعلیکم السلام۔" پاکیزہ نے جواب دینے سے زیادہ تھوک نگلا۔

"آؤ چلیں۔" وہ بڑی نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر گیلری میں لے گیا تھا بالکل ایک معمول کی طرح۔

پاکیزہ کا دل چاہا کہ وہ لڑکھڑا کر گر جائیں اور اس کو تھامنے والا ہاتھ اپنی ساری مضبوطی سے اسے سمیٹ لے وہ ایسا نہ کر سکی۔ اسے چلتے ہی رہنا تھا۔

بہت خاموشی سے مکمل آرٹ گیلری گھوم کر وہ باہر بینچ پر بیٹھ گئے۔ کسی تصویر کے بارے میں انہوں نے یک لفظی تبصرہ بھی پیش" کیا تھا۔ بڑے سکون سے وہ دونوں ایک دوسرے کے لمس کو محسوس کرتے رہے، پیتے رہے۔ جب مدہوشی اتنی غالب آ گئی کہ لڑکھڑانے پر یقین آ گیا تو وہ گھبرا کر بیٹھ گئے۔ عید کا تیسرا دن تھا۔ مہندی کا رنگ پھیکا نہیں پڑا تھا۔ کچھ اور ہی گہرا ہوا تھا۔

آفتاب کی امی پہلی بہوؤں سے اتنی بدگمان تھیں کہ پاکیزہ کے سچے جذبوں کے سامنے بڑی جلدی ہار جاتیں پھر وہ اپنی ساس کی بیٹی جیسی بہو کیوں نہ بنتی۔ اگر بیٹی جیسی بہو بنتی تو پھر رنگ کیسے گہرا نہ آتا۔

خوبصورت ہاتھوں والی لڑکی نے یہی سوچ سوچ کر اپنی ہتھیلیوں کی مہک کو سانسوں سے اندر کھینچا تھا۔

مہندی دکھاؤ'' فرمائش کی گئی۔

پاکیزہ نے اپنی ہتھیلیاں پھیلا دیں۔

"اتنا پسینہ کیوں آیا ہوا ہے تمہیں؟" وہ ہاتھوں کی نمی دیکھ کر محظوظ ہوا۔

"مجھے کوئی پسینہ نہیں آیا۔" آفتاب کی شوخی سے تھوڑی سی ہمت اسکے اندر سرایت کرنے لگی۔

ہتھلیاں کھلیں تو نمی خود ہی خشک ہونے لگی۔

"میں اپنانام ڈھونڈوں؟" آفتاب نے اس سے پوچھا۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

"جواب کا انتظار کرنے سے پہلے ہی وہ اس کی ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کی پور رکھ چکا تھا۔ اب وہ انگلی کی پور کو انگلیوں سے مس کرتا ہوا اپنانام ڈھونڈ رہا تھا۔"

پاکیزہ کے اندر طوفان چل رہے تھے۔ اس کی سانسوں میں اتھل پتھل اتنی زیادہ ہو گئی کہ ہوا نے اس کی سانسوں کی آواز محفوظ کر لی۔ ہتھیلی کے عین درمیان میں آخر اسے اپنانام مل گیا۔

"یہ رہا میرا نام۔" اس کی انگلی ٹھہری تو پاکیزہ کی منتشر دھڑکنیں بھی سنبھل گئی۔ اس نے صحیح معنوں میں سکھ کا سانس لیا۔

"چلو مجھے انعام دو؟" وہ اپنی ہتھیلی پھیلا کر اب اس سے کہہ رہا تھا۔

"نام بھی میں لکھوں اور انعام بھی میں دوں؟" پاکیزہ نے آنکھیں حیرت سے پھیلا کر پوچھا۔

ساتھ ہی آنکھیں جھکالی۔ جھکانا ضروری تھا۔

"دوبارہ دیکھونا؟ ادھر دیکھو میری طرف۔ ایک دفعہ تو دیکھو پلیز۔" وہ اب تنگ کر رہا تھا۔

"آفتاب" اس کا نام لے کر دوبارہ تنبیہ کی گئی۔'

"اچھا میں دیتا ہوں عیدی۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوا اور اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

اسی لمحے پاکیزہ کو معلوم ہوا کہ آفتاب نے گرے پینٹ اور گرے کوٹ کے ساتھ سفید ٹی شرٹ پہن کر آیا ہے۔ نظریں پہلے اس کے لباس پر گئی ہی کہاں تھیں؟ نظریں تو بس اس کے چہرے پر جاتی تھیں۔ اس کے نین نقش چومتی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے محبت کے موتی چراتی تھیں اور دل کے سیپ میں چھپالیتی تھیں۔ وہ وجیہہ تھا۔ خوبصورت تھا۔ پاکیزہ نے ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر تسلیم کیا۔

کوٹ سے ہاتھ نکالا تو کھلے پیسے تھے دس بیس کے نوٹ بھی اور پچاس سو کے بھی۔۔

"یہ لو۔" وہ اسکی ہتھیلی پہ رکھ چکا تھا۔

پاکیزہ نے پیسے لیے اور حیرت سے دیکھا۔

"مجھے کھلے پیسے دے رہے ہو؟ واپسی کا کرایہ ہے میرے پاس!" اب وہ شریر ہوئی۔

"میں تمہیں کھلے پیسے نہیں دے رہا۔ اپنی محنت دے رہا ہوں۔ خون پسینہ دے رہا ہوں۔ یہ پولٹری فارم سے ہونے والی پہلی کمائی ہے۔ اس پر مجھ سے بھی کہیں زیادہ تمہارا حق ہے۔ اتنے عرصے سے اس لیے سنبھال کر رکھی تھی کہ موقع ملتے ہی تمہیں دے سکوں۔"

اس کی بات پر پاکیزہ کی آنکھوں میں متشکر نمی آگئی۔

"میں ان پیسوں کو سنبھال کر رکھوں گی۔" وہ جذب سے بولی تھی۔

"نہیں نہیں یہ تمہیں خرچ کرنے کے لیئے دیئے ہیں۔ تم انہیں خرچ کرو گی تو میری محنت وصول ہو جائے گی۔" اس نے اصرار کیا۔ پاکیزہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پاکیزہ اسے بتا نہ سکی کہ جس رات وہ موتیے کے پودے کی جڑوں سے پیسے نکال کرلے کر گیا تھا۔ اس سے اگلی صبح پاکیزہ نے پودے کے عین اسی جگہ سے تھوڑی مٹی نکال کر اپنے پاس محفوظ کر لی تھی۔ وہ اس مٹی کو بھی اگنور نہیں کر سکتی تھی، خرچ نہیں ہونے دے سکتی تھی۔ جسے وہ چھوتا تھا۔ یہ تو پھر اس کی محنت کی کمائی تھی۔

"میرا دل کرتا ہے میں تمہارے لیے گھڑی خریدوں۔" وہ قفے قفے سے زندگی کا ذائقہ چکھنے کو اس کے چہرے کی چاشنی چرا رہا تھا۔

حیا کے لبادے میں لپٹی ہوئی وہ تھوڑا سا چونکی۔

" آفتاب گھڑی نہیں لینا۔"

"کیوں؟" وہ اتنے صاف انکار پر حیران ہوا۔

"میں گھڑی پہننا پسند نہیں کرتی۔" وہ قطعیت سے بولی۔

اس کے ناک کی پھننگ ٹھیک ویسے چمک اٹھی جیسے سکول پر اپنے موقف پر ڈٹ جانے پر چمکتی تھی۔

"کوئی خاص وجہ؟" وہ اس کی چمک میں ڈوبنے لگا تھا۔

"میں وقت کو کلائی پر نہیں باندھنا چاہتی۔ میں اس کو مٹھی میں رکھتی ہوں۔" وہ مسکرا کر چمکتی آنکھوں سے اس کے دل کا چین لوٹتی ہوئی بولی۔ آفتاب نے رشک سے اس کے ہاتھ کو مٹھی بناتے ہوئے دیکھا تھا۔

"میں گھڑی خرید کر دوں گا پھر تو پہنو گی نا؟" آفتاب نے بند مٹھی اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مضبوط ہاتھ میں مٹھی یوں آگئی جیسے موتی سیپی میں سماتا ہے۔

انکار کی گنجائش ہی نہیں بچی تھی۔ جو موتی سیپ میں چھپا تھا اس کی چمک دمک آنکھوں میں اتر آئی۔ گالوں پر اترے حیا کے رنگ جھلملانے لگے۔ محبت نے زمین سے آسمان تک حصار طاری کر رکھا تھا، وہ دونوں محصور تھے!

☆☆☆☆☆

سانس جیسے موم بتی کانچ پر رکھی ہوئی
زندگی ہے ہلکی ہلکی آنچ پر رکھی ہوئی
میرا سرمایہ ہے تھوڑی روشنی تھوڑا دھواں

"میں گھر بیٹھ بیٹھ کر تھک گئی ہوں۔" وہ اس کی سب کچھ جان چکی تھی اور سب کچھ مان چکی تھی۔ اب سب کچھ اسی سے کہتی تھی۔

کالج کے دو سال پر لگا کر اُڑ گئے۔ زندگی نے ان دو سالوں میں بہت سے سبق دیئے۔ ان سارے اسباق کو سبھی یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر واقعی یاد رکھ سکتے ہوتے تو زندگی جہدِ مسلسل نہ ہوتی۔

گھر سے باہر مجھ سے مل لو۔" اس نے شرارت سے کہا۔

"پاگل ہیں آپ۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے واضح انداز میں بات شروع کی۔ اس سے اجازت لینا ضروری تھا۔

وہ اسے بیوی کہتا تھا اور وہ اسے شوہر سمجھتی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے مجھے لڑکیاں صرف گھر کے کام کرتی اچھی لگتی ہیں۔ ان کا تحفظ مرد کی ذمہ داری ہے۔ ان کی ضروریات پوری کرنا مرد کی ذمہ داری ہے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تمہیں گھر سے نکل کر جھک مارنی پڑے۔" وہ کہہ رہا تھا اور وہ اس کے لہجے میں جھلکتی فکر کو محسوس کر رہی تھی۔

اس نے باپ نہیں دیکھا تھا لیکن اب وہ باپ بن گیا تھا۔ اسے پال رہا تھا۔ تحفظ دے رہا تھا۔

اس نے بھائی بھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ اس کا بھائی بن گیا تھا۔ نوک جھونک رکھتا اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا تھا۔

مرد ذات سے جتنے رشتے تھے سب اس شخص سے منسوب ہوئے تھے۔ وہی اول تھا، وہی آخر تھا۔

کوئی عام سی لڑکی ہوتی تو فوراً ڈھیر ہو جاتی۔ اپنے ارادوں سے دستبردار ہو کر اس کی مرضی کے دھارے پر بہہ جاتی لیکن وہ عام سی لڑکی نہیں تھی۔ اس کے ارادے مضبوط تھے۔ وہ بہہ نہیں سکتی تھی۔ وہ ڈھے نہیں سکتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ اس بات کو ایسے ہی نہیں جانے دے گی۔ اگر زندگی میں کچھ کرنا چاہتی ہے تو اس کا کچھ نہ کچھ حصہ تو ضرور منوائے گی۔

"میں جھک مارنے نہیں جانا چاہتی۔ میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ ایکچوئلی ہمارے سکول کے سر کی کال آئی تھی۔ سر کہہ رہے تھے کہ انہیں ڈرائنگ ٹیچر کی ضرورت ہے۔ میں نے انہیں منع کرنے کی کوشش کی بتانا چاہا کہ آگے یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا تو صبح میں پڑھانا تقریباً ناممکن ہی ہو جائے گا۔ انہوں نے پھر مجھے ایک اور آفر کی ہے آپ کہیں تو بتاؤں۔" پاکیزہ کی بات کے دوران آفتاب چپ رہا تھا۔ پاکیزہ کو اس کی ناراضگی کا ڈر لاحق ہوا۔

"بتاؤ؟" یک لفظی جواب ملا لیکن اس ایک آواز سے سکون نے پاکیزہ کے اندر قلقاریاں ماریں۔

"سر چاہتے ہیں کہ میں شام میں اکیڈمی آکر بچوں کو ڈرائنگ سکھا دوں۔ جو آرٹس کی اسٹوڈنٹ ہیں ان کو ٹرین کر دوں اور اس کے علاوہ جو اچھے سائنس سبجیکٹس کے اسٹوڈنٹس ہیں ان کی ڈرائنگ بھی اچھی ہو جائے تاکہ پریکٹیکل نوٹ بک بنانے اور پیپر دینے میں وہ مار نہ کھائیں۔" وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" وہ سمجھ چکا تھا پاکیزہ اپنی آئی پر آ گئی ہے۔

"میں جانا چاہتی ہوں۔ خود پر انحصار کرنا آجائے گا۔ چار پیسے کمانے کا خرچ کرنے کا سلیقہ آجائے گا۔" اس نے بڑی آسانی سے بات بنائی۔

"ٹھیک ہے جاؤ لیکن یاد رکھنا جتنے دن تم اکیڈمی جاؤ گی۔ اتنے دن میں تم سے رات کو بات نہیں کروں گا۔" آفتاب نے پاکیزہ سے کہیں زیادہ آسانی سے بات بنالی۔

وہ اس کا نشہ توڑ رہا تھا! اسے بری طرح اس شخص کی آواز کی عادت ہو گئی تھی۔ جب تک وہ اسے خواب نہ دکھاتا وہ خوابوں کی دنیا میں نہ جاتی۔ وہ حیران رہ گئی۔ اتنا شدید ردِ عمل تو متوقع ہی نہ تھا۔ دل کے اندر کہیں یقین تھا کہ سو باتیں ہو جائیں۔ آفتاب تو اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ اس یقین کے سہارے اس نے اپنی حیرت کو کنڈلی مارنے پر مجبور کیا۔

"وہ بڑے آرام سے بولی "ٹھیک ہے نہیں کریں گے بات !

"اوکے اللہ حافظ !" وہ فون رکھ چکا تھا۔

بے یقینی سے پاکیزہ نے موبائل دیکھا۔ اس کے گھٹنوں کے عین نیچے سے ساری جان نکل گئی تھی۔ وہ اپنا وجود سنبھال نہیں پا رہی تھی۔ بڑی ہی دقت سے اس نے مسکرا کر گلاب کے پودے میں کھلی نوخیز کلی کو دیکھا۔

خزاں تو جانے کے لیے آتی ہے اور بہار ہمیشہ ٹھہر جاتی ہے۔ وہ بہار ثابت ہو گا! اسے واثق یقین تھا اور اس یقین میں کوئی دورائے نہیں تھی۔

☆☆☆☆☆

تمہارا کہنا ہے

تم مجھے بے پناہ شدت سے چاہتے ہو

تمہاری چاہت

وصال کی آخری حدوں تک

مرے۔۔۔ فقط مرے نام ہو گی

مجھے یقیں ہے۔۔۔ مجھے یقیں ہے،

! مگر قسم کھانے والے لڑکے

تمہاری آنکھوں میں ایک تِل ہے!

اسے لگتا تھا کہ آفتاب نے بس یونہی بات کر دی وہ ایک دو روز میں بھول جائے گا لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ وہ نہیں بھولا تھا۔ میسجز پر سلام دعا ہوں ہاں تک جوابات محدود ہو گئے اور رات کو فون پر بات کرنا تو گویا قصہ پارینہ ٹھہرا۔ پاکیزہ کی ضد کے باوجود رونے

کے باوجود وہ اس ایک بات پر نہیں آیا تھا کہ رات کو فون پر بات کر لے۔ مہینہ ہو چلا تھا۔ سب آنسو ضائع ہو گئے تھے۔ پاکیزہ نے سوچا وہ ضدی ہے تو میں ضد کیوں دکھاؤں۔ وہ نہیں جانتا مانتا تو میں ہی ہار مان جاؤں۔ اس نے اکیڈمی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بس تین چار دن رہ گئے تھے۔ اپنے فیصلے سے آفتاب کو آگاہ کرنے کے لیئے وہ بہت پر جوش تھی۔ فورا بتانا چاہتی تھی۔ آفتاب کو بتانے سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ راتوں کو سرور لوٹ آئے گا۔

اس نے گھر آتے ہی اسکارف اتارا اور آفتاب کو بتانے کے لیئے موبائل کی جانب لپکی۔ سائلنٹ ہوا موبائل پہلے سے ہی کسی کال کی اطلاع دے رہا تھا۔ آنے والی کال دشمنِ جاں ہی کی تھی۔

"ہیلو آ گیا سکون؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔ بہت سکون آ گیا۔ آپ کی آواز سن کر پتا نہیں کیوں اتنا سکون آ جاتا ہے۔" وہ تسلیم کر رہی تھی۔

"باہر دس لوگوں کو دیدار کروا کر تو ویسے ہی سکون آ جانا چاہیے"۔ لہجہ مختلف تھا۔ پاکیزہ ٹھٹک گئی۔

"کیا ہوا آفتاب؟" وہ پریشان ہوئی۔

"مجھے کیا ہوا سکون تو تمہیں ملا ہو گا۔ تمہارا گھر سے نکلنے کا مقصد جو پورا ہو گیا ہے۔" لہجہ زہریلا تھا۔

"کیسا سکون؟ آپ کیا بول رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔" اس کی سماعتوں میں واقعی سوئیاں چبھنے لگیں۔

"حمزہ کی فون آئی تھی مجھے۔ بہت چسکے لے کر بتا رہا تھا کہ اس نے آج تمہیں دیکھا ہے۔ تمہارا حلیہ، کپڑوں کا رنگ، ہاتھ میں تھامے بیگ کی وضع قطع، چوڑیوں کی کھنک سب بتا رہا تھا۔ تمہیں پتا ہے میں تمہیں شیئر نہیں کر سکتا۔ میرا دماغ خراب ہوتا پھر بھی تم باہر جاتی ہو تاکہ لوگ تمہیں دیکھیں، تمہیں سراہیں۔ تمہارے لیے ایک میں کافی نہیں ہوں۔" وہ ضرورت سے زیادہ تلخ ہوا۔

پاکیزہ کی سماعتوں پر بھاری بھر کم بوجھ پڑ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ سب اس کے بارے میں بول رہا تھا۔ اپنی جان اپنی پاکیزہ کے بارے میں کہہ رہا ہے۔ وہ چپ ہو گئی۔ مکمل چپ آفتاب کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"تمہیں معلوم ہے پاکیزہ۔ تمہیں میں نے بتایا ہے۔ میں کچھ نہیں ہوں۔ میں خالی ہاتھ ہوں۔ میرا متاعِ حیات تم ہو۔ میری زندگی کا سرمایہ تم ہو۔ مجھے تم میری لگتی ہو صرف میری۔ تمہارے اوپر میرے علاوہ کسی کا کوئی حق نہیں ہے۔ کوئی تمہیں دیکھ نہیں سکتا۔ کوئی تمہیں چھو نہیں سکتا۔ تم صرف میری ہو۔ میرے اندر باہر آگ لگ جاتی ہے جب مجھے پتا چلتا ہے تمہیں کسی نے دیکھا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے اس شخص کو بھسم کر دوں جس کی آنکھیں تمہاری طرف اٹھیں۔ میں تمہارا بال بھی کسی کو دیکھنے نہیں دینا چاہتا۔" وہ بول رہا تھا۔ پاکیزہ ابھی بھی خاموش تھی۔ وہ سن رہی تھی۔

اس کے دماغ پر واپسی کا منظر جگمگا رہا تھا۔ جب اسے لگا تھا بائیک پر پاس سے گزرنے والا حمزہ ہے لیکن یہی بات اس کے لیے کتنی عام سی تھی اور کسی اور کے لیے کتنی خاص بن گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اپنی سوچوں کے تانے بانے سلجھاتے اس نے سر اٹھا تھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ وہ خاموشی کو تھام کر کھڑی تھی۔

آفتاب کو اپنے الفاظ کی سنگینی کا خیال ہو گیا تھا۔ آواز رندھ گئی تھی۔ آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ متاع حیات کو کھو نہیں سکتا ہے۔ وہ زندگی کے سرمائے کو ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا تھا۔ وہ التجاؤں پر اتر آیا۔

"پاکیزہ پلیز کچھ تو بولو۔ تم میری بیوی ہو۔ میری بیسٹی ہو نا؟ مجھے سمجھتی ہو نا؟ تمہیں معلوم ہے نا میرا۔ پلیز پاکیزہ میری حالت کو سمجھو۔ مجھ سے ناراض نہ ہو۔ میں نکاح کے باوجود تمہیں دیکھنے پر اصرار نہیں کرتا لیکن کوئی اور اگر تمہیں یوں ہی دیکھ لے اتنی آسانی سے دیکھ لے تو مجھے تکلیف تو ہو گی نا؟ پلیز پاکیزہ مجھے معاف کر دو۔ میری دیوانگی معاف کر دو۔ ایسے خاموش نہ ہو۔" وہ طالب تھا، سر اٹھا ہی نہیں سکتا تھا۔

"آئی ایم سوری آفتاب! غلطی آپ کی نہیں میری ہے۔ مجھے خود کو ڈھانپ کر رکھنا چاہیے۔ چہرہ نہیں ڈھانپ سکتی تو زینت کی چیز چوڑیاں تو سمیٹ لوں۔ آپ کو پورا حق ہے کہ آپ مجھ سے خفا ہوں میں۔ آپ سے ناراض نہیں۔" وہ واقعی دل سے کہہ رہی تھی۔ لڑکیاں جس کو دل میں جگہ دیتی ہیں وہ زبان کے معیار سے نیچے گر جائے یا سوچ سے۔۔۔ اس کے گرنے سے فرق نہیں پڑتا۔ وہ روزِ اول کی طرح دل کی مسند پر براجمان رہتا ہے۔۔۔ پوری تمکنت کے ساتھ۔۔۔ اس کی ناک اُٹھی ہی رہتی ہے۔

آفتاب کی ناک تو ویسے بھی ستواں تھی۔

"شکریہ پاکیزہ۔ تم بہت اچھی ہو۔ جب سے حمزہ نے مجھے بتایا میرا دل چاہ رہا ہے تمہیں دیکھ لوں۔"

"دیکھ لیں۔" فراخدالی سے اجازت دی گئی۔ وہ چیز ہی اس کی تھی۔

" کل سے تمہیں اکیڈمی سے گھر میں چھوڑا کروں گا۔"

"میں پیدل آتی ہوں۔"

"میں بھی پیدل ہی چلوں گا۔ ہم سفر تم جیسا ہو تو سفر طویل ہونا چاہیے۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"ابھی نہیں مل سکتی؟"

"ابھی کیسے ملوں؟"

"کھانا وانا کھا لو۔ فری ہو کر میسج کرنا پھر بتاؤں گا۔" وہ انتہائی شوخی سے گویا ہوا۔ بے باکی عروج پر تھی۔

"شرم کریں۔" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔ حیا سے گلنار ہو چکی تھی۔

"کون سا سچ میں ملوں گا۔۔۔ خوابوں میں تو اجازت دو۔ آخر تمہارا شوہر ہوں۔" آٹھ مہینے بعد اسے جتانا یاد آیا تھا۔ وہ جتا رہا تھا۔

"اچھا میں آرہی ہوں۔" وہ فوری رضامند ہوئی۔

خوابوں کی دنیا اتنی ہی حسین لگتی ہے۔ سمجھ بھی نہیں آتی اور چاروں شانے چت ہو جاتے ہیں۔ جو کبھی نہیں کیا اور کبھی نہیں ہوا کو جان لینے کی جستجو باؤلا کر دیتی ہے۔ طلب پوری ہو جاتی ہے لیکن تشنگی بڑھ جاتی ہے۔ وہ پیاس ہی کیا جو بجھ جائے!

☆☆☆☆☆

بعد مُدت اسے دیکھا، لوگو

وہ ذرا بھی نہیں بدلا، لوگو

وہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں تھاما تھا لیکن ساتھ ہونے کا احساس پاکیزہ کی پلکیں بھاری کر چکا تھا۔ اس کا محبوب اس کا عاشق اس کا محرم اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ بلاشبہ حسین تھا۔ بہت حسین تھا۔ حسن سے کہیں زیادہ شرافت تھی جو اس شخص کا دیوانہ بناتی تھی۔ وہ نکاح کو وجہ بنا کر جو چاہے اس سے کروا سکتا تھا لیکن وہ نہیں کرواتا تھا۔ کیونکہ اس نے محبت کی تھی۔

سچی محبت بے غرض ہوتی ہے، بے لوث ہوتی ہے۔ دنیا کی ہر شے جھوٹی ہو سکتی ہے لیکن ان جھکی نظروں والے شخص کی محبت سے سچا کچھ نہیں ہو سکتا۔

پاکیزہ فخر سے سر اٹھا کر چل رہی تھی۔ دو گلیاں ختم ہوئی تو سامنے سڑک آگئی۔ اب سڑک پار کرنی تھی۔ آفتاب نے جس سمت سے گاڑیاں آرہی تھیں اس سمت اپنے آپ کو کر لیا اور پاکیزہ کی طرف دیکھے بغیر اس کا نازک سا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ پاکیزہ کے دل پر کیا گزر رہی تھی یہ وہی جانتی تھی۔ یہ لمس اسے دیوانہ کرتا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ کوہ قاف کی پری ہے اور اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کا ہاتھ تھامے ہمیشہ قائم رہنے والی جنت میں لے جا رہا ہے۔ سڑک پار ہوئی تو آفتاب نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس کا دل بھی جیسے طوفان کی کھڑکی کے شیشے بجنے سا برداشت کر رہا تھا۔

اکیڈمی بس سامنے ہی تھی۔ پاکیزہ نے نظر اٹھا کر آفتاب کو دیکھا۔

یہ شخص اب دیکھتا بھی نہیں ہے اس وجہ سے کم از کم میں تو سکون سے اس کو دیکھ سکتی ہوں ناں۔ وہ آفتاب کو دیکھ رہی تھی اور آفتاب سڑک پار کر چکا تھا۔ یہ سڑک پاکیزہ روز پار کرتی تھی۔ اسے سڑک پار کرنے سے ڈر لگتا تھا۔

یہ مشینی گاڑیاں انسان تو ہیں نہیں۔ ان کے سینے میں دل بھی نہیں دھڑکتا۔ کوئی آہ و فغاں ان پر اثر نہیں کرتی۔ یہ آرام سے کچل کر چلی جاتی ہیں۔ مرنے والی روحوں کی باقی خواہشیں زمین و آسمان کے درمیان بین کرتی رہ جاتی ہیں۔

اسی سڑک کو آفتاب نے پاکیزہ کے لیے گلزار بنا دیا تھا۔ وہ ہاتھ تھام کر چلا تھا۔ زندگی کو تبدیل کر چکا تھا۔ اس کے لمس کی خوشبو دھڑکنوں میں اتر آئی تھی۔ پاکیزہ نے اپنے ہاتھ کو چہرے کے قریب کیا اور اکیڈمی کے اندر داخل ہوتے ہی بہت مشکل سے ہتھیلی کو چوما۔

یہ ہاتھ جب پہلی دفعہ پکڑا گیا تھا۔ کتنا برا لگا تھا یہی ہاتھ اب ایک رشتے کے بعد پکڑا گیا تو لگتا ہے احساسات ہی بدل گئے ہیں۔

محبت زندگی کو بدلے یا نہ بدلے انسانوں کو ضرور بدل دیتی ہے !

☆☆☆☆☆

شُکر سمجھو اسے، یا کوئی شکایت سمجھو

اپنی ہستی سے ہوں بیزار، کہوں یا نہ کہوں ؟

دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمنِ جانی میرا

ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں ؟

آفتاب نے ایک تھپڑ کھینچ کر اس کے منہ پر مارا تھا۔ تھپڑ مار کر بھی دل نہیں بھرا۔ اتنا حوصلہ تو تھا نہیں کہ اس پر پل پڑتا۔ سو کرو۔۔۔جی دار نہیں تھا۔ دس دوستوں کے گھیرے میں ایک شخص کو تھپڑ مارنا کوئی بہادری کی بات نہیں بلکہ دیکھا جائے تو سراسر بزدلی ہے۔ اس نے اپنے دوستوں کو اشارہ کیا۔ وہ بھی اپنے خون کی گرمی نکالنے لگے۔ تھوڑی تھوڑی گرمی سے ہی شکار کا حشر ہو چکا تھا۔

شکار کی غلطی کیا تھی؟ صرف یہ کہ روز کی طرح آفتاب پاکیزہ کو اکیڈمی چھوڑنے آ رہا تھا۔ موصوف نے آگے بڑھ کر پاکیزہ سے پوچھ لیا۔

"میم ہم آج سٹل پینٹنگ کریں گے ؟" آفتاب نے اس وقت کینہ توز نظروں سے گھورا۔

باقی پروگرام بعد کے لیئے ملتوی کر دیا۔ پاکیزہ بھی گڑبڑا گئی جی کہہ کر جان چھڑوالی۔

آفتاب نے اکیڈمی کے باہر رک کر بس اتنا پوچھا۔

"یہ کون تھا؟"

"ہفتم کلاس کا ارسلان تھا۔ میرا اسٹوڈنٹ ہے۔" جواب دے کر وہ غڑاپ سے اندر گھس گئی۔

آفتاب معصوم شکل لیکن مردانہ ڈیل ڈول والے ارسلان کو ذہن سے محو نہ کر سکا۔ وہ حمزہ حماد وغیرہ کو فون کر کے بلا چکا تھا۔ ارسلان کے اکیڈمی کے قریب پہنچتے ہی آفتاب اور اس کے دوستوں نے بے چارے کی وہ حجامت کی کہ معصوم چہرہ داغدار ہو گیا۔ شور شرابے کی وجہ سے اکیڈمی سے سربراہان بھی باہر آ چکے تھے۔ سربراہان کے باہر آتے آتے قصہ تمام ہو چکا تھا۔

شکاری چلے گئے تھے۔ شکار باقی تھا۔ مظلوم کے ساتھیوں نے پاکیزہ کا روز ساتھ آنا بھی گوش گزار کر دیا۔ سربرہان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

وہ سکول کی ہونہار طالبہ تھی خیر وہ ایک طرف کی سن کر مکمل ڈھے نہیں گئے۔ حواس باقی تھے۔ ارسلان کو بمشکل فرسٹ ایڈ دی دو گلاس جوس کے پلائے اور ایکسیڈنٹ کی خبر گھر پہنچانے پر راضی کیا۔ اچھا بچہ تھا مان گیا۔

کمرے میں بیٹھی پاکیزہ کو خبر بھی نہ تھی کہ باہر اس کا نام چوراہے پر لیا جا رہا ہے۔ وہ ارسلان کے راستے میں نظر آنے اور سکول نہ آنے پر معمولی سی متفکر تھی۔ صرف اتنی سی پریشانی تھی جس کا کوئی روزن اس کی اپنی ہستی میں نہ کھلتا تھا اور اگر پریشانی کا روزن اپنی ہستی میں نہ کھلتا ہو تو سانس لینے میں گھٹن محسوس نہیں ہوتی۔

☆☆☆☆☆

کیوں نہ ہو چشمِ بُتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟

یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی

وائے ناکامی! کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے

گھر واپس آکر اس نے ہمیشہ کی طرح آفتاب سے بات کی۔ وہ اس کا معمول بن چکا تھا۔ کچھ کھویا کھویا آفتاب بھی اسے اچھا لگا۔ بے تحاشا روشنی وہ دیکھ چکی تھی۔ اب بادلوں کی اوٹ سے ہوا دیدار بھی نظروں کو سیراب کر دیتا تھا۔ اسے معلوم تھا آفتاب کے کھونے کی وجہ رسلان ہی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے آفتاب پاکیزہ کے پاکیزہ کردار پر شک نہیں کر سکتا اس لیے اگر کچھ روٹھا روٹھا بھی ہے تو ٹھیک ہو جائے گا۔ پچھلی ناراضگی کے بعد جب ملا تو یوں ملا تھا جیسے کبھی بچھڑا نہ ہو۔

اس شخص کا محبت کے بغیر گزارا نہیں۔ مسکراتے ہوئے پاکیزہ نے سوچا اور اپنے آپ کو اگلے دن کے حوالے کر دیا۔

وہ جو بھی کر رہی تھی زندگی میں سب بے معنی تھا۔ وہ کس رنگ کے کپڑے پہنتی ہے، کس سے ملتی جلتی ہے، کتنا پڑھتی ہے، کیا کھاتی پیتی ہے، کیا سوچتی ہے، یہ سب سوال اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اب صرف یہ اہمیت رکھتا تھا کہ آفتاب سے کتنی دیر بات ہوئی ہے۔ کتنی باتوں پر جھرنے سی ہنسی پھوٹ بہتی ہے اور کتنی باتوں پر وہ اپنے لب دانتوں میں دبا کر سانس کو روک لیتی ہے۔

اگلے دن اکیڈمی جانے کے لیے آفتاب پھر راستے میں حاضر تھا۔ آج اس نے پاکیزہ سے اس کا اسکارف مانگا تھا۔ وہی اسکارف جو وہ اکثر استعمال کیا کرتی تھی۔

پاکیزہ نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا بس تمہیں محسوس کرنا چاہتا ہوں۔

پاکیزہ نے اصرار کیا کے دھو کر دوں گی لیکن پھر اسکارف میں نمکین سی لڑکی کی خوشبو کیسے باقی رہتی۔۔۔وہ ضد تھام کر بیٹھ گیا۔ جس نے دل جھکا دیا تھا، سر بھی جھکا دیا۔ اسکارف کو سلیقے سے لپیٹ کر شاپر میں ڈال کر لے آئی اور چلتے ہوئے آفتاب کو تھما دیا۔

سر برہان نے اپنی آنکھوں سے منظر دیکھا اور یقین نہ کر پائے۔ فوراََ دو گلاس پانی پیا اور کمرے میں آدھے گھنٹے سے آئی پاکیزہ کو بلاوا بھیجا۔ کوآرڈینیٹر کو ہدایت کی جا چکی تھی کہ دفتر میں کوئی نہیں آئے۔

"پاکیزہ بیٹا" وہ گہری سوچ میں کھوئے ہوئے تھے۔

"جی سر!" وہ مطمئن تھی کوئی پریشانی نہیں تھی۔

" کل سکول کے باہر ایک جھگڑا ہو گیا آپ کے اسٹوڈنٹ ارسلان کا" انہوں نے صرف ایک پتا پھینکا۔

"سر کل وہ مجھے بھی راستے میں نظر آیا تھا لیکن سکول میں نہیں آیا۔" اطمینان ہنوز قائم تھا۔

"آپ جانتی ہیں کہ اس کا جھگڑا کس سے ہوا؟" دوبارہ پاکیزہ کو جانچا گیا۔

"نہیں سر!" طمانیت نے کوئی کروٹ نہ لی تھی۔

"وہ آپ کا ایک ایورج سا کلاس فیلو تھا کیا نام تھا اس کا۔۔۔نور۔۔۔ آفتاب نور۔ ہاں آفتاب نور۔ اس کے کچھ دوستوں نے پکڑ کر مارا ہے۔ ساتھ وہ خود بھی تھا۔" وہ ٹیبل پر پڑے گلوب کو انگلی سے گھماتے ہوئے پُرسوچ انداز میں بولے۔

رنگ بدلے جا چکے تھے۔ اطمینان رخصت ہو چکا تھا اور پریشانی ہویدا تھی۔

کیوں کہنا بے معنی تھا۔ وہ وجہ خود بھی جانتی تھی۔

"پاکیزہ میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔" وہ اس کے لیے فکر مند تھے۔

"سر ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے اللہ کو اپنے تئیں مطمئن کر دیا تھا۔ نکاح ہو گیا تھا سر کو وہ کیسے بتاتی۔

"بات جو بھی ہے۔ انگلیاں ہمیشہ لڑکیوں کے کردار پر اٹھتی ہیں، لڑکوں کے گھر تک کوئی نہیں جاتا۔ سوال لڑکیوں کے گھر والوں سے پوچھے جاتے ہیں۔ تم یا تمہارے گھر سے کوئی لاجواب ہو میں یہ نہیں چاہتا۔"

سر کہہ رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی سر کو کیسے بتائے کہ جو آواز بدل کر فون کرنے کی جرات رکھتا ہے۔ روز ایک گھنٹہ خاموشی محسوس کر سکتا ہے وہ سب کچھ کر تا ہے لیکن لاجواب نہیں کر سکتا لاجواب ہونے نہیں دے سکتا۔

"اب ایشو یہ ہے کہ ارسلان کے گھر والے ایف آئی آر کٹوانا چاہتے ہیں۔ ارسلان کو کافی چوٹیں آئی ہیں۔" وہ پانی کی گہرائی ماپنا چاہتے تھے۔

"سر ایسے کیسے؟" وہ حواس باختہ ہو گئی۔ صحیح معنوں مین پیروں تلے کی زمین کھسکی تھی۔

"دو آپشنز ہیں۔۔۔ارسلان کے کزنز کہتے ہیں یا تو وہ اس لڑکے آفتاب کو پکڑ کر اسی طرح ماریں گے جیسے اس نے ارسلان کو پٹوایا یا پھر قانونی کاروائی ہو گی۔"

"پلیز سر کچھ کریں یہ نہیں ہونا چاہیے۔اس پاگل نے میری وجہ سے ایسا کیا ورنہ وہ ایسا لڑکا نہیں ہے۔اسے لگا ہو گا ارسلان کوئی اسٹر ینجر ہے۔اس لیے اس نے ایسا کیا۔میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔آفتاب کو کچھ بھی نہیں ہونا چاہیے۔"اس کی آنکھیں متورم تھیں۔پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور دونوں ہاتھ حقیقتاً جڑے ہوئے تھے۔

سر برہان کو اس پر رحم آیا لیکن خاموش رہے۔

"پلیز سر میں اس کو منع کر دوں گی۔وہ دوبارہ کبھی نہیں آئے گا۔وہ اس راستے میں ہی نہیں آئے گا۔اس دفعہ اسے اس مصیبت سے نکالیں۔اس کے لیے کچھ نہ کریں۔میرے لیے کر دیں۔سر میرا نام بھی بیچ میں آئے گا۔میرا نام بدنام ہو گا۔"

اسے بچانے کے لیے وہ پردے ڈال رہی تھی۔سچ جھوٹ ملا رہی تھی۔'اُن' کو اُس کہہ رہی تھی۔سر برہان سوچ رہے تھے۔نام تو چوراہے پر لیا جا چکا تھا۔پاکیزہ کا ریکارڈ انہیں اسے مزید رُلانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

"اچھا بیٹا میں کوشش کرتا ہوں۔آپ کوشش کرو ان معاملات سے دور رہو۔"سر برہان نے ہلکی سی تنبیہ کر کے اسے جانے دیا۔

وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ واپس کلاس میں نہیں گئی بلکہ مین گیٹ سے نکل کر گھر کی راہ پر قدم رکھ دیئے تھے۔رستہ طویل ہو گیا تھا۔گلے میں پھانس سی اٹک گئی۔اس نے آج پہلی مرتبہ ہاتھ جوڑے تھے اور کون جانتا ہے کہ ہاتھ سب ہی کو جوڑنے پڑتے ہیں جو اپنی خوشی سے نہیں جوڑتا اس سے تقدیر ہاتھ جڑواتی ہے۔جو اللہ کے سامنے نہیں جوڑتا اسے بندوں کے سامنے جوڑنے پڑ جاتے ہیں۔

سر برہان نے اسے گھر جاتے ہوئے تاسف سے دیکھا وہ جانتے تھے اب یہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔

☆☆☆☆☆

وہ ایک خوشبو

جو میرے وجود کے اندر

صداقتوں کی طرح زینہ زینہ اتری ہے

کرن کرن میری سوچوں میں جگمگاتی ہے

آفتاب گھر آیا مٹھی میں شاپر چھپا ہوا تھا۔وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اپنے کمرے میں جا پہنچا۔دروازے کی چٹخنی چڑھائی اور اپنی ہانپتی کانپتی سانسوں کو بمشکل قابو کرنے کی کوشش کی۔ہاتھ میں دبا کر رکھے ہوئے شاپر کو چہرے کے قریب لے کر گیا تو کسی کی خوشبو نے بمشکل قابو ہوئی سانسوں میں پھر سے طغیانی کو دعوت دے دی۔

وہ بیڈ کے آخری سرے پر بیٹھا تھا۔ اسے لکڑی بھی چبھتی ہوئی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو پاؤں والی طرف بیٹھنے کے بجائے نرم بستر پر بیٹھ جاتا لیکن اس میں تو وقت لگتا تھا صبر کہاں سے آتا۔ کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے شاپر سے اسکارف نکالا۔

پسینے کے ننھے قطرے اس کی پیشانی پر چمک رہے تھے۔ صبیح رنگت شدتِ ضبط سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس کے محسوسات بدل رہے تھے۔ اس نے شاپر سے اسکارف کو نکال کر دونوں مٹھیوں میں بھینچ رکھا تھا۔ وہ اسے اپنے چہرے کے قریب لے جانا چاہتا تھا لیکن لے جا نہیں پا رہا تھا۔ اسکارف سے ٹھیک ویسی ہی خوشبو اٹھ رہی تھی جو اس کے وجود سے آیا کرتی تھی۔

جب وہ اس کے پاس آرٹ کونسل میں بیٹھی تھی تو گہرے گہرے سانس لے کر وہ اسی خوشبو کو زائل کر رہا تھا۔

اسی خوشبو کا سحر تھا جو اس کی آنکھیں نم کر دیتا اور وہ کمرے سے نکل جاتا تھا۔

اسی خوشبو کی ڈالی ہوئی لگام تھی کہ اس کا رخ پیکرِ خوشبو کے سوا کہیں نہ جاتا۔

یہ خوشبو ہی تھی جو اسے پاگل کر دیتی تھی۔

مدہوش کرنے والی خوشبو۔۔۔ رگوں میں بہتے خون میں شامل ہوتی خوشبو۔۔۔ سر پر چڑھتی ہوئی خوشبو۔۔۔ سر چڑھ کر بولتی خوشبو!

اس نے مٹھیوں میں بھینچے اسکارف کو اپنے چہرے کے قریب کیا اور لمبے لمبے سانس بھرنے لگا۔ اب اس کی ستواں ناک اور اسکارف کے درمیان ہوا بھی حائل نہ تھی۔

کمرہ جماعت سے وہ باہر نکل سکتا تھا۔ آرٹ کونسل میں لمبے لمبے سانس بھر سکتا تھا لیکن یہاں سے کہاں جاتا۔ اپنے بند کمرے سے کہاں جاتا۔ اس نے خود کو خوشبو کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اسے احساس ہوا کے نکاح اس نے ڈھائی سال پہلے چھ جون کی رات کو کیا تھا لیکن بالغ آج ہوا ہے۔

پاکیزہ نے اس کی ساری بے چینیاں سن کر نچلے لب کو دانتوں سے اتنی زور سے کاٹا کہ وہ رسنے لگ گیا۔ اتنی دیوانگی سننے کے بعد وہ جتا کچھ نہیں سکتی تھی، صرف بتا سکتی تھی۔

ڈھکے چھپے لفظوں میں اس نے سربراہان سے ہوئی گفتگو بتا دی۔ اب ان دونوں کی زندگی سے سکول نکل گیا تھا۔

وہ جگہ جہاں وہ دونوں پہلی بار ملے تھے۔۔۔ وہ جگہ اب درمیان میں نہیں تھی۔

اب وہ دونوں تھے۔۔۔

فقط وہ دونوں۔۔۔

ہواؤں سے اوپر۔۔۔

کہیں دور۔۔۔

بادلوں کی گود میں۔۔۔

ایک ساتھ!

☆☆☆☆☆☆☆☆

اس کے کنول ہاتھوں کی خوشبو
کتنی سبز آنکھوں نے پینے کی خواہش کی تھی
کتنے چمکیلے بالوں نے
چھوئے جانے کی آس میں خود کو، کیسا کیسا بکھرایا تھا
کتنے پھول اگانے والے پاؤں
اس کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھائے پھرتے تھے
لیکن وہ ہر خواب کے ہاتھ جھٹکتی ہوئی
جنگل کی مغرور ہوا کی صورت
اپنی دھن میں اڑتی پھرتی
آج۔۔۔ مگر
سورج نے کھڑکی سے جھانکا
تو اس کی پلکیں جھپکنا بھول گئیں
وہ مغرور سی، تیکھی لڑکی
عام سی آنکھوں، عام سے بالوں والے
اک اکھڑ پردیسی کے آگے
دوزانو بیٹھی
اس کے بوٹ کے تسمے باندھ رہی تھی!

"میں تمہیں جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اور دیکھ کر اگر جی واقعی بھر گیا تو؟"

"ارے نہیں بھرتا کوئی سبیل نکالو ملاقات کی"۔

"آپ پاگل ہیں؟ ایسا کیسے ممکن ہے؟"

"ساری دنیا مل رہی ہے آپس میں اور تم تو میری منکوحہ ہو۔ مجھ سے ملنے میں بھلا کیا قباحت؟"

"! میں آپ کی منکوحہ ہوں، یہ بات صرف میں اور آپ جانتے ہیں۔ باقی کوئی نہیں جانتا"

پاکیزہ نے بڑی آسانی سے اسے خاموش کروا دیا تھا۔ وہ خاموش کہاں ہوا تھا وہ تو بس بیمار ہو گیا۔ اور ہوا نے کبوتر کے پیروں سے باندھ کر جب یہ سندیسہ بھیجا تو پاکیزہ کی ٹانگوں سے جان نکل گئی۔ وہ ضد آفتاب کے سامنے کر ہی نہیں سکتی تھی۔ محبت میں اصرار ہوتا ہے

ضد نہیں ہوتی۔ بیمار آفتاب کے سامنے تو کبھی نہیں!۔۔۔

دنیا کے سارے خدشے بالائے طاق رکھ کر وہ اس سے ملنے چلی آئی۔

اس کے خیال میں وہ پہلی اور آخری دفعہ یوں ملنے کا ارادہ لیے آئی تھی لیکن خیال حقیقت کب ہوتے ہیں!۔۔۔

"پاکیزہ باہر آؤ۔ میں باہر کھڑا ہوں۔" وہ اس کے کالج کے دروازے کے باہر کھڑا منتظر تھا۔

"آفتاب مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ اندر بیٹھے بیٹھے ہی پیغام بھیج رہی تھی۔

"پاکیزہ پلیز آ جاؤ۔ جلدی آؤ ناں۔" وہ بے تاب ہو رہا تھا۔ پیغامات کا سلسلہ مسلسل جاری تھا۔

"نہیں آفتاب رہنے دیتے ہیں۔ نہیں ملتے آج ملیں گے تو بار بار ملیں گے۔ اس سے بہتر ہے کہ رہنے ہی دیں۔" پسینہ پیروں کے تلوں سے نکل رہا تھا۔

"اب تم باہر نہ آئی تو میں اندر آ جاؤں گا۔" وہ دھمکی دے رہا تھا۔

دھمکی نے اثر نہ کیا تو اس نے ذرا اور مقدار بڑھا دی۔

"میں اب کسی گاڑی کے نیچے سر دے دوں گا۔"

وہ اتھل پتھل سانسیں لیے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ باہر آئی۔ گھٹنوں سے نیچے تک آتے فراک میں وہ کانچ کی گڑیا لگ رہی تھی۔ چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔

ایک بائیک فوراً اس کے قریب آ گیا۔ پاکیزہ ہچکچائی للچائی وہیں کھڑی رہی جب دشمنِ جاں کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔

"بیٹھو بھی۔۔۔ کیوں لوگوں کو شک میں ڈال رہی ہو؟"

اور اس نے بس ایک جست لگائی اور بائیک پر بیٹھ گئی۔ لمحوں میں بائیک ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ پہلا پہلا تجربہ تھا وہ کندھے پر ہاتھ بھی نہیں رکھنا چاہتی تھی اور ٹھیک سے بیٹھنا بھی نہیں آتا تھا۔ جب خود کو ڈگمگاتے دیکھا تو بدقت آواز نکالی۔

"آہستہ چلائیں۔"

"آہستہ چلاؤں گا تو تم میرے اور قریب کیسے آؤ گی۔" وہ شرارت سے بولا اور قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

اس کی شوخی نے غازے کا رنگ لیا اور پاکیزہ کے گالوں پر بکھر گئی۔

شہر میں بننے والی مصنوعی جھیل جو ابھی زیر تعمیر تھی وہ اسے وہیں لے آیا تھا۔ بند دروازہ منہ چڑا رہا تھا پاکیزہ کچھ حیران کچھ پریشان تھی۔

"کیا ہوا؟ اترنے کا دل نہیں کر رہا یا کندھے سے ہاتھ نہیں ہٹانا؟" شوخی بدستور قائم تھی۔

پاکیزہ گھبرا کر بائیک سے نیچے اتر گئی۔

"ہم اندر کیسے جائیں گے" وہ بائیک لاک کر رہا تھا جب اسے معصوم سی چڑیا کی چہچہاہٹ سنائی دی۔

"بتاتا ہوں۔" اس نے بائیک لاک کر کے پھر سے نقرئی ہاتھ تھام لیا۔

مصنوعی جھیل کا پراجیکٹ شاید حکومت کی تبدیلی کی وجہ سے التواء کا شکار تھا۔ اکا دکا مزدور ہی نظر آ رہے تھے اور وہ سب اپنے کام میں مصروف تھے۔ ڈر لگ رہا تھا۔۔۔ دل جیسے باہر نکلنے ہی والا تھا لیکن ایسے شخص کا ساتھ ہونا جو صرف آپ کا ہو ہر ڈر کو نگل لیتا ہے۔ محبت سے بڑا کوئی اژدھا نہیں!

نہ ہونے کے برابر لوگ۔۔۔۔ اور آفتاب کا لمس۔۔۔ پاکیزہ کا پیر پھسل گیا۔

"مانا شوہر ہوں تمہارا لیکن پبلک پلیس ہے۔ تمہیں اٹھا نہیں سکتا۔"

ایک شرمیلی سی مسکراہٹ پاکیزہ کے لبوں پر رینگ گئی۔ گیٹ کے ساتھ تھوڑے کچے راستے سے پہلے آفتاب نے قدم آگے بڑھائے اور پھر پیچھے ہی پیچھے پاکیزہ بھی چل دی۔

اس کا ہاتھ تھامے وہ خواب نگر میں لے آیا۔ وہ خواب نگر ہی تو تھا۔۔۔ تاحد نگاہ پھیلا ہوا صاف پانی۔۔۔ جس میں شورش نے ہلچل سی مچا رکھی تھی۔ گیلی نرم گھاس جس پر پڑے پانی کے قطرے حسین تر معلوم ہو رہے تھے۔ آسمان پر بادلوں کی مستانہ سی اٹکھیلیاں اور پشت پر دیکھو تو ارغوانی سے رنگ کے پہاڑ۔۔۔

کون کہتا ہے پہاڑوں کا رنگ نہیں ہوتا۔۔۔ جب محبت کا موسم آتا ہے تو پہاڑ بھی رنگین ہو جاتے ہیں۔

سب سے حسین تو وہ لمس تھا جس کی مسحور کن خوشبو میں وہ کافی دیر سے قید تھی۔ نرم گرم سا لمس آہستہ آہستہ ہاتھوں سے دل میں اترتا جا رہا تھا۔ آفتاب نے ایک قدم آگے بڑھ کر پاؤں سے بڑے پتھر کے پاس کی جگہ کو کچل سا دیا۔ اب پاکیزہ کے بیٹھنے کی جگہ بن گئی تھی یہی تو اس شخص کی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں جو اس کے علاوہ کسی اور کو سوچنے کی اجازت بھی نہ دیتی تھی۔ کتنے ہی لوگوں کی آنکھوں میں پسندیدگی ابھرتی تھی اور پاکیزہ کی سرد مہری سے خود بخود ہی ختم ہو جاتی تھی۔ کوئی پوچھتا کہ ایسا کیا ہے اس میں تو پاکیزہ فقط اتنا کہتی۔۔۔

He is not the man of words. He is the man of action.

بڑے پتھر کی اوٹ میں بیٹھے وہ اب اپنے مطابق کسی کو نظر نہیں آ رہے تھے۔ماحول کا فسوں سانسوں میں تلاطم پیدا کر رہا تھا۔

آفتاب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سے کچھ زیادہ قریب کر لیا۔وہ سمٹی سمٹائی ہوئی مزید سمٹ گئی۔وہ بہت نرمی سے اس کا ہاتھ تھامے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور وہ آنکھیں چرانے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی۔اس سے پہلے کے تلاطم خیزی جذبات سے رگوں میں لہو بن کر دوڑتی۔کسی کے چلنے کی آواز سے دونوں چوکنے ہو گئے۔

"اوئے لڑکے بات سن۔" سیاہ داڑھی اس مزدور کی کرختگی کو بالکل کم نہیں کر رہی تھی۔لہجہ ہاتھوں کی طرح سخت اور کھردرا تھا۔

آفتاب حواس باختہ ہوا اور فوراً کھڑا ہو گیا۔اس آدمی نے ایک زور کا ہاتھ آفتاب کے کندھے پر جمایا اور اسے پاکیزہ سے قدرے فاصلے پر لے گیا۔پاکیزہ کی حالت گویا یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔اس کے اندر اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھ سکے۔ماحول کا سارا فسوں اڑن چھو ہو گیا تھا۔لمس کے سارے خوشبودار پرندے گھونسلہ چھوڑ چکے تھے۔

پانی کی شفافیت سے کہیں زیادہ پانی کی سفاکی کا احساس ہو رہا تھا۔

دل چاہ رہا تھا ایک قدم آگے بڑھائے اور ان جان لیوا لہروں کے حوالے خود کو کر دے۔

بدنامی سے تو کہیں زیادہ اچھی موت ہے۔

خاموشی سے آنسو پاکیزہ کے تھرتھراتے ہوئے گالوں پر پھیل گئے۔اسی لمحے آفتاب اس کے پاس آیا۔وہ بھی سراسیمگی میں مبتلا تھا۔حالت البتہ پاکیزہ سے قدرے بہتر تھی۔اپنا ہاتھ پاکیزہ کے سامنے پھیلا کر بولا۔

" چلو اٹھو یہاں سے چلیں۔"

"وہ۔۔" پاکیزہ کا اشارہ اس آدمی کی طرف تھا۔

"اس نے مجھ سے پیسے لے لیے ہیں۔اب کچھ نہیں کہے گا۔پھر بھی تم اٹھو۔ہم یہاں سے چلتے ہیں۔" وہ پاکیزہ کو اٹھا چکا تھا۔

وہاں سے تیزی سے نکلتے ہوئے بھی پاکیزہ کا ہاتھ آفتاب کے حصار میں تھا۔پاکیزہ کی نظر آفتاب کے جوتوں پر پڑی،تسمے کھلے ہوئے تھے۔چلتے چلتے وہ بائیک کے قریب آ چکے تھے۔آفتاب بائیک پر سوار ہوا تو پاکیزہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔وہ بائیک سٹارٹ کر چکا تھا۔سمجھ ہی نہیں سکا۔۔۔محبت نے اس لڑکی کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔حوا کی بیٹی نے ایک بار پھر دل کے ساتھ ذات بھی پیروں میں رکھی تھی۔

وہ اپنے شوق سے تسمے باندھ رہی تھی۔۔۔!

پاکیزہ آفتاب نور کے تسمے باندھ رہی تھی!۔۔۔

عشق وہم و گماں میں رہتا ہے

میرے ہی جسم و جاں میں رہتا ہے

آپ کا حوصلہ جو ہیں دل میں

کون ٹوٹے مکاں میں رہتا ہے

آپ کو بھولے ایک عمر ہوئی

تذکرہ کیوں بیاں میں رہتا ہے

مہرباں لاکھ پر مرا یہ دھیان

ایک ہی مہرباں میں رہتا ہے

عقل اور میں تو متفق ہیں مگر

ایک دل درمیاں میں رہتا ہے

جانے کیا بد دعا ہے اس دل کو

ہر گھڑی امتحاں میں رہتا ہے

وہ ڈبوتا ہے لازماً اک دن

طوفاں جو باد باں میں رہتا ہے

عشق باسی ہے ایک صحرا کا

کب کسی گلستاں میں رہتا ہے

جس کو سمجھا تھا یہ جہاں ابر ک

جانے اب کس جہاں میں رہتا ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

عورت کو پہلی دفعہ چھونے والا مرد ایسا ہی ہوتا ہے کہ نہ سمجھ میں آتا ہے نہ نظر میں ٹھہرتا ہے، فقط دل میں اترتا ہے۔ ایسا اترتا ہے کہ دل بھی پھر اپنا نہیں رہتا۔ آفتاب اس کے دل میں اتر آیا تھا۔ وہ کوئی بھی بات کرتی کہیں نا کہیں سے آفتاب کا حوالہ آفتاب کا تذکرہ آہی جاتا۔ وہ زبان دانوں تلے دیتی اور ہنستی چلی جاتی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے بسیرا کر چکے تھے۔ اس کے لبوں پر ہر دم موتیے کی بند کلیاں رقصاں رہتی۔ وہ سنوری سنوری رہتی۔ اس پر شباب کے ساتھ محبت کا رنگ چڑھ رہا تھا۔ اس روپ سے وہ خود بھی کنی کترانے کی کوشش کرتی تو آہٹیں سرسراہٹیں سبھی سرگوشیاں کرنے لگ جاتی۔ وہ اپنے آپ پر خود ہی مسکراتی۔ اپنی چوری خود

پکڑنے پر خود ہی جھینپ جاتی۔ آفتاب خوابوں تک تھا تو خیال تھا۔ تصور سے نکل کر حقیقت میں آیا تو حوالہ بن گیا۔ حوالہ تو ہر جگہ دینا پڑتا ہے!

اپنے نکاح کی ٹوٹی پھوٹی کہانی کسی دوسرے کی آپ بیتی بنا کر اپنی سہیلی کو سنائی تو وہ انگشت بدنداں رہ گئی۔

"اگر ایسے نکاح ہوتا تو کیا سب نہ کر لیتے؟"

کتنا شاندار طمانچہ اس کے منہ پر پڑا تھا۔ منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔ آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں اور گلال ہوئے گال پھیکے پڑ گئے۔ ہنسی تو پہلے ہی دبے قدموں جا چکی تھی۔

"ایسے نکاح ہوتا تو کیا سب نہ کر لیتے۔۔؟" کتنا بھیانک سوال تھا۔ شاید جواب زیادہ بھیانک تھا۔ اس نے دوست کو ہزار تاویلیں دیں۔ وہ سب باتیں جو آفتاب نے سمجھائی تھیں سب کی سب من و عن دہرا دی لیکن اس اللہ کی بندی کا ایک ہی مطالبہ تھا۔

"گواہ ہونا چاہیے۔"

"اللہ سے بڑا کون گواہ؟" پاکیزہ نے بڑی بے باکی سے کہا تھا۔

"اللہ سے بڑا کیا کوئی تخلیق کار ہے لیکن پھر بھی اس نے یہ رتبہ ماں کو تفویض کیا۔ کچھ کردار انسانوں کو ہی نبھانے چاہیے۔ کچھ کردار انسانوں کو نبھانے ہی پڑتے ہیں۔" وہ لڑکی دھن کی پکی تھی۔ پتھر پر لکیر کی طرح صاف ستھری بات کر کے وہ بات گھما چکی تھی۔

پاکیزہ کے اندر کہیں دل پتھر ہو گیا تھا۔

"کیا جب تک گواہ نہیں ہوں گے تو وہ میرا شوہر نہیں ہو گا؟"

"اگر شوہر نہیں ہے تو جو اس نے مجھے چھوا؟"

"اس کی وہ سانسیں جو میں نے محسوس کی؟ "

"اف!!!!"

اس سے آگے سوچنا بھی سوہان روح تھا۔ بڑے عرصے بعد ایک بہت بڑا کانٹا پاکیزہ کے دل میں چبھا تھا۔

"محبت اگر محبت ہوتی ہے تو آزمائش کیوں بنتی ہے؟ یہ امتحان لے لے کر انسان کی روح کو چھلنی کر دیتی ہے۔ چھلنی روح میں تو پھر کوئی محبت جگہ نہیں پا سکتی۔ نہ مجازی محبت کو جگہ ملتی ہے نہ حقیقی محبت بسیرا کرنے کا سوچتی ہے۔ سچ ہی ہے محبت اگر محبت ہو تو آزمائش نہیں بنتی۔ محبت محبت ہو تو راستہ ہوتی ہے، محبت راہبر ہوتی ہے، محبت راستہ بناتی ہے، محبت محبتوں کو زندہ رہنے دیتی ہے۔ محبت کانٹے کی طرح نہیں چبھتی۔ محبت کا درد انگلی کے دروازے میں آنے جیسا نہیں ہوتا۔ محبت تو ریشمی کپڑے سے ہونے والی میٹھی میٹھی مٹھاس جیسی ہے چیخنے کا دل نہیں چاہتا ہلکا ہلکا سرور قائم رہتا ہے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خواب تعبیر بناتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہم سدا بھوک مٹاتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہاتھ سے ہاتھ ملانے میں گزاری ہے حیات

ہاتھ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے مر جاتے ہیں

صبح دم رزق کی امید میں گھر چھوڑتے ہیں

شام ڈھلتی ہے تو آتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہم تو شاعر ہیں زمانے کے سبھی درد والم

اپنے لفظوں میں سجاتے ہوئے مر جاتے ہیں

لوگ بے بس ہیں مشیت کے فسوں کے آگے

بیٹیاں گھر سے اُٹھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

اجرتِ سانس معظم ہے دُکھوں کی صورت

عمر بھر ہم یہ چکاتے ہوئے مر جاتے ہیں

اس نے ابھی اپنے قدم نئے نئے بے اعتباری سے اعتبار کی دنیا میں رکھے تھے۔وہ خود پر اعتبار کرنے لگا تھا۔اپنے ہونے کا اسے یقین ہونے لگا تھا۔خود اعتادی کسی خودرو بیل کی طرح اس کے اندر سے پھوٹ نکلی تھی اور اب اس کی شخصیت کو جاذب نظر بناتی جارہی تھی۔تب ہی اس کے اندر تک پھیلی جڑیں زور وشور سے ہل گئی۔

"مجھے وہ چاہیے آفتاب۔۔۔"

"پاکیزہ مجھے کتنا آزماؤ گی؟"

"جب تک تم میرے سامنے میرے عکس کی طرح واضح نہیں ہو جاتے،جب تک تمہارا تصور میرے ذہن میں کھٹکنا بند نہیں کر دیتا ۔میں تم سے بار بار ثبوت مانگتی رہوں گی۔"اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"محبت ثبوت نہیں مانگتی پاکیزہ۔"

"لیکن آفتاب محبت عزت تو مانگتی ہے ناں؟"

"اس شخص نے تمہیں کچھ کہا تھا؟کچھ نہیں کہا ناں؟تمہاری عزت پر کہاں حرف اٹھنے دیا میں نے؟"

"اتنا ہی مطمئن رکھنا چاہتے ہو تو گواہوں کی طرف سے بھی اطمینان کروادو۔"

"اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ اطمینان ہی حتمی ہو گا؟"

"محبت ثبوت نہیں مانگتی آفتاب۔"

پاکیزہ نے دھونس سے کہا تھا اور آفتاب نے مان لیا تھا۔

جس لڑکی نے اپنے ہاتھوں سے اس کے تسمے باندھے تھے وہ اس کا ہاتھ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

پاکیزہ کو اس نے یہی کہا تھا اور پاکیزہ اپنے ہاتھوں پہ اس کا کھویا لمس ڈھونڈنے لگی۔

خواب کی مٹھی میں بند ستارے کبھی آنکھوں میں آن بستے ہیں اور کبھی آسمان کی اونچائیوں پر جا ٹکتے ہیں۔ ایک پل کو لگتا ہے جو ہم جی رہے ہیں بس یہی زندگی ہے اور اس ایک پل کے علاوہ زندگی سے کچھ مانگنے کا بھی دل نہیں کرتا پھر ایک وہی پل پلٹا کھاتا ہے اور دل چیخ کر پوچھتا ہے

کیا یہی زندگی ہے؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اپنے حالات کو جیا میں نے

اور تری ذات کو جیا میں نے

زندگی اک طویل قصہ تھی

چند صفحات کو جیا میں نے

کیسے کب کیوں ہوئی قیامت یہ

ان سوالات کو جیا میں نے

رات جو عمر بھر نہیں کٹتی

بس اسی رات کو جیا میں نے

ہم ترے ہو چکے سدا کے لئے

تیری اس بات کو جیا میں نے

جان جب جسم سے نکلتی ہے

اس ملاقات کو جیا میں نے

جیت سمجھے تھے جس کو تم اپنی

تیری اس مات کو جیا میں نے

ہیں جو زندہ تو بس سمجھ لیجے

کچھ کمالات کو جیا میں نے

کیا بھلا عشق کی مجال ابرک

اپنی عادات کو جیا میں نے

"میں سفیان عباسی تم دونوں یعنی پاکیزہ اور آفتاب نور کے نکاح کا گواہ ہوں۔"

"میں سلمان عابد تم دونوں یعنی پاکیزہ اور آفتاب نور کے نکاح کا گواہ ہوں۔"

"میں حمدان نیازی تم دونوں یعنی پاکیزہ اور آفتاب نور کے نکاح کا گواہ ہوں۔"

"میں حارث عمر تم دونوں یعنی پاکیزہ اور آفتاب نور کے نکاح کا گواہ ہوں۔"

وہ اندر کمرے میں بیٹھی تھی اور باہر اقرار ہو رہا تھا۔ گواہی دی جا رہی تھی شہادتیں لی جا رہی تھیں۔ دروازہ ہلکا سا بجا کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔

"پاکیزہ تم نے سن لیا اب ان لوگوں کو بھیج دوں؟" اس نے اپنی گری ہوئی پلکیں اٹھا کر آفتاب کو دیکھا۔ پلکوں پر چاندی سے چمکتے ہوئے موتی ٹکے ہوئے تھے۔

"او ہوا بھی رخصتی نہیں ہو رہی۔ تم ان موتیوں کو گرنے نہ دینا۔ میں بس ابھی آیا۔" باہر جا کر دوستوں کو بھیجنے لگا۔

وہ جاتے ہوئے مذاق کر رہے تھے۔

"یار بڑوں والے نکاح میں بھی ہمیں ہی گواہ رکھنا۔"

بڑی مشکل سے جان بچا کر وہ کمرے میں واپس لوٹا۔

آج آفتاب کے گھر کوئی نہیں تھا۔ سب گھر والے کسی رشتے دار کی شادی میں گاؤں گئے ہوئے تھے۔ رات گئے تک واپسی متوقع تھی۔ آفتاب نے جب پاکیزہ کو گھر آنے کو کہا تو وہ ڈر گئی۔ اس کا دل انتہائی قدم اٹھانے کی تائید نہیں کر رہا تھا پھر اسے وہ منظر یاد آ گیا جب اس مزدور کی نظریں پاکیزہ کا مذاق اڑا رہی تھیں۔۔ کوئی تو گواہ ہو۔۔۔ یہی سوچ کر وہ آج اکیلی چلی آئی تھی۔

"آؤ باہر چلیں۔" وہ پاکیزہ کا ہاتھ تھام کر اسے ٹی وی لاؤنج میں لے آیا تھا۔ اب وہ اسے گھر کے سارے کمرے دکھا رہا تھا۔ پاکیزہ معتبر محسوس کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ آنکھوں میں آن بسنے والے ستارے ان لمحوں میں قدموں تلے آ گئے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ دنیا میں اگر کوئی جنت ہے تو وہ یہی ہے بس اسی چار دیواری میں ہے۔

"یہاں بیٹھو۔" اس نے کچن میں پڑے ڈائننگ ٹیبل پر پاکیزہ کو بیٹھا دیا تھا۔

"میری شدید خواہش تھی کہ تمہیں اپنے ہاتھ کی چائے بنا کر پلاؤں۔" وہ دیگچی ڈھونڈ رہا تھا۔

"رکیں آفتاب میں خود بناتی ہوں۔" وہ اٹھی تھی

"نہیں تم بیٹھی رہو اور خاموشی سے مجھے سنو۔" اس نے پاکیزہ کے لبوں پر انگلی رکھ کر کہا تھا۔

پاکیزہ سن سی بیٹھی رہ گئی۔

"تمہیں مری والی چائے یاد ہے پاکیزہ؟ مجھے آج تک وہ چائے نہیں بھولی۔ میں نے اس کے بعد جب جب چائے پی ہے آدھی پیالی ہی پی ہے۔ تمہارے ہاتھ کی چائے پینے کے بعد مجھے چائے مزہ ہی نہیں دیتی۔ آج تمہیں اپنے ہاتھ کی چائے بنا کر پلاؤں گا تو شاید برسوں پرانا خمار اترے۔"

وہ روٹین کے سے انداز میں چائے بنا رہا تھا اور مسلسل باتیں کرتا جا رہا تھا۔ پاکیزہ اس کی سرخ ٹی شرٹ سے نکلتے کسرتی جسم کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے خوبصورت پاؤں پاکیزہ کو متوحش کر رہے تھے۔

وہ اپنی انگلیاں مروڑنے لگی وہ بس یہی کر سکتی تھی۔

"یہ لو چائے۔" بھاپ اڑاتا کپ اس نے پاکیزہ کے سامنے رکھا تھا۔

آفتاب یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ شرم و حیا لڑکی کو اس قدر خوبصورت بنا دیتی ہے کہ اگر اسے معلوم ہو جائے تو زیور کی حاجت ہی نہ رہے۔

"ایسے نہ دیکھیں آفتاب۔" وہ شرما کر رہ گئی۔

"اب بھی نہ دیکھوں۔ اب تو مجھے تم پر حق ہے۔" وہ کہنیاں میز پر جما کر بولا۔

پاکیزہ سے نظریں اٹھانا مشکل ہو گیا۔ کتنی ہی ساعتیں گزر گئیں، آفتاب نے اس کی نظروں کے سامنے چٹکی بجائی۔

"چائے پینی ہے یا دیکھنے میں بھی پسند نہیں آئی۔" وہ استفسار کر رہا تھا۔

"اوہو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔" اس نے چائے کا کپ ہاتھ میں اٹھا لیا تھا۔

"تمہیں میرے علاوہ کچھ یاد رہنا بھی نہیں چاہیے۔" وہ بہت حق سے اسے جتا رہا تھا۔ پاکیزہ کو اچھا لگا۔۔ ہمیشہ سے کہیں زیادہ اچھا لگا

"جلدی سے چائے پیو پھر تمہیں چھوڑ کر بھی آنا ہے۔" وہ اسے حقیقی دنیا میں واپس لایا تھا۔

کوئی یقین کر سکتا ہے کہ خالی گھر میں بند کمرے میں اس نے مجھے چھوا بھی نہیں؟ اپنی نظروں سے میری پرستش کی اور سارے حقوق ہونے کے باوجود مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔۔ کسی کو چیخ کر بتاؤں تب بھی کوئی یقین نہیں کرے گا۔۔ کسی کے یقین سے مجھے اب کیوں فرق پڑے گا۔۔ وہ مجھ سے میرے نام جیسی محبت کرتا ہے پاکیزہ محبت۔۔۔ وہ میری زندگی میں اپنے نام جیسا ہے سب کچھ روشن کر دیتا ہے۔۔۔ میرا آفتاب!

واپسی کے رستے پر اپنے چہرے کو نقاب سے چھپائے وہ اپنی خوش قسمتی پر غور کر رہی تھی اور حیران ہو رہی تھی۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اشک آنکھوں میں چھپاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

بوجھ پانی کا اٹھاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

پاؤں رکھتے ہیں جو مجھ پر انہیں احساس نہیں

میں نشانات مٹاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

برف ایسی کہ پگھلتی نہیں پانی بن کر

پیاس ایسی کہ بجھاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

غمگساری بھی عجب کار محبت ہے کہ میں

رونیوالوں کو ہنساتے ہوئے تھک جاتا ہوں

اتنی قبریں نہ بناؤ میرے اندر محسن

میں چراغوں کو جلاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

لڑکیاں بری نہیں ہوتیں، محبت بھی بری نہیں ہوتی، برا تو وقت بھی نہیں ہوتا۔۔۔برے بس حالات ہو جاتے ہیں!

"حالات جن میں لڑکیاں، محبت اور وقت سب ہی برا بن جاتا ہے۔سب ہی برباد ہو جاتا ہے۔ان محبت کے شکنجوں میں نہ ہی پھنسو تو بہتر ہے ورنہ دل پر ہمیشہ ایسے ہی ہتھوڑے برستے رہیں گے جیسے سامنے کھڑا مزدور دیوار پر برسا رہا ہے۔"

پاکیزہ کالج کے کھیل کے میدان میں بیٹھی اکثر کسی نا کسی کو سمجھا رہی ہوتی تھی۔

لڑکیاں اس سے بات کرنا پسند کرتی تھی۔لڑکیاں اس کی بات غور سے سنتی تھی۔وہ جو سمجھتی تھی سب کو سمجھانے کی کوشش کرتی تھی۔لڑکیوں کے لیے وہ پسندیدہ ضرور تھی لیکن جب بات نام نہاد محبت کی آتی تھی تو انہیں نہ اپنی کرنی بری لگتی نہ اپنا وقت برا لگتا تھا اور نہ ہی اپنا آپ برا لگتا تھا۔البتہ پاکیزہ ضرور کھٹکتی تھی۔پاکیزہ کی نصیحتیں ضرور کھٹکتیں تھیں۔ایسے میں کتنی ہی زہر خند باتیں زبان سے نکل جاتیں تھی محبت کا دم بھرنے والیوں کو احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔نام نہاد محبت نفرت کرنا سکھا دیتی ہے۔ہر اس چیز، شخص سے نفرت جو محبت کے راستے میں آئے، محبت کے دنیاوی تقاضوں پر انگلی اٹھائے یا محبت پر سوالیہ نظر ڈالے۔

جب ہم نفرت کی پگڈنڈی پر چلتے ہیں تو راستے کی دشواریاں اور منزل کی دوری معنی نہیں رکھتی۔ہم تکلیف بو رہے ہوتے ہیں اور تکلیف کاٹ رہے ہوتے ہیں۔کانٹے پھیلاتے ہوئے کانٹوں پر چلتے چلتے اتنی دور نکل آتے ہیں کہ بے حس ہو جاتے ہیں۔یہ نام نہاد محبت کا ہی اعجاز تھا کہ وہ نفرت بو رہی تھی۔اب نفرت کاٹنے کا وقت تھا۔

"پاکیزہ کے لیے جو کالج کے باہر کھڑا ہوتا ہے وہ کون سا محرم ہے؟"

"پاکیزہ کا بھی تو یار ہی لگتا ہے جس سے ملنے گئی تھی؟"

"اس کے لیے محبت جائز ہے اور ہمارے لیے ناجائز؟"

"اس کا دل پر اختیار نہیں ہے لیکن ہمارا ہونا چاہیے؟"

"دوسروں کو وہ تب روکے جب خود ان کاموں میں ملوث نہ ہو؟"

اس کی باتوں سے اس کے بوائے فرینڈ کا ذکر نہیں جاتا اور ہمیں منع کرتی ہے۔

"کتنی عجیب سی لڑکی ہے چہرہ دیکھو تو معصومیت اور اندر سے پوری ہے"۔

"جو ہم سے پیار کرے وہ جھوٹا ہے اور جو پاکیزہ سے پیار کرے وہ سچا ہے۔"

"صرف اسی نے آزمایا ہے اپنے عاشق کو اور ہم تو کاٹھ کے الو ہیں۔"

"اس کا یار عاشق ہے لیکن ہماری دوستی لوفروں سے ہے۔"

سر یوں لپیٹ کر رکھتی ہے جیسے بڑی بے حیا ہے۔

"کیا بعید ہے کہ ملنے نہ جاتی ہو؟"

"ملنے جانے کے بعد کوئی کتنا پاکیزہ رہتا ہے یہ ہم سے بھلا کہاں چھپا ہے؟"

اندازے لگائے جاتے تھے۔اس کے کردار کے بارے میں باتیں ہوتی تھیں۔

جب زہر خند اور تلخ باتیں زبان سے نکلنے لگ جاتی ہیں تو آنکھوں سے حیا اور خلوص کا جنازہ نکل جاتا ہے، نظروں میں پھر بے باکی ہوتی ہے اور انداز استہزائیہ ہو جاتا ہے۔

پاکیزہ استہزائیہ انداز دیکھ کر کڑھتی۔کوئی ہلکی پھلکی بات سامنے کر دیتا تو اس کو سو سو تاویلیں دیتی۔

"فلاں کا بوائے فرینڈ بس اکیڈمی کے راستے نظر آیا تو پیچھے پڑ گیا، فلاں کا بوائے فرینڈ تو رانگ نمبر والا ہے، فلاں کا بوائے فرینڈ اس کی وین والا انکل ہے۔میرا تو ایسا کوئی حساب کتاب نہیں۔مجھے سوشل میڈیا سے تحفے میں محبت نہیں ملی۔مجھے سر راہ چلتے کوئی نہیں آ ٹکرایا۔مجھے کسی دس بیس دن کی محبت کا بخار نہیں چڑھا۔آفتاب میرے ساتھ بچپن سے ایک سکول میں پڑھے ہیں۔میں نے ان کے گھر کے نمبر پر بھی بات کی ہے۔ان کے گھر میں بھی سب کو معلوم ہے۔کچھ وجوہات کی بنا پر ہم منگنی نہیں کر سکتے ابھی لیکن میں ان کی ہوں، یہ طے ہے! ہمارا ساتھ پرانا ہے۔ان سب کی دوستیوں کا کوئی ہماری محبت سے موازنہ نہیں کر سکتا۔"

سننے والے وضاحتیں کہاں سنتے ہیں۔۔۔انہیں تاویلیں کب سمجھ آتی ہیں۔۔۔وہ بس مصالے دار جملوں کا اضافہ کر لیتے ہیں اور آنکھوں میں استہزا قائم رہتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مجھ سے شکوہ نہیں رہا گھر کو

جب سے دیوار کر دیا در کو

ناؤمیں آخری مسافر ہے

آخری کام ہے سمندر کو

رات کے تین بج رہے تھے، پیاس کا احساس جاگتے ہی تسکین کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کسلمندی سے کمرے میں نگاہیں دوڑائیں۔ کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی منظر واضح نہ ہو سکا۔۔۔ اندازے سے اپنا ہاتھ ٹیبل لیپ کے بٹن پر رکھا۔ تھوڑی سی روشنی ہوئی، وقت دیکھ کر لیٹے رہنے کو جی چاہا۔ پیاس کی طلب بھی شدید تھی۔ سماعتوں پر مدھر سی ہنسی نے ترنم چھیڑا۔ پاکیزہ ہنس رہی تھی۔۔۔ تسکین کو اپنا وقت یاد آ گیا۔

کالج کے زمانے میں وہ بھی یونہی ہنستی تھی۔ ایسی ہنسی جس میں کوئی پریشانی نہ ہوتی اور جھرنے سے بہتی چلی جاتی۔ ایسی ہی لمبی راتوں میں وہ اپنے بستر پر دبکی ریڈیو سنا کرتی۔ ایف ایم کے آرجے کا لہجہ سماعتوں میں رس گھولتا اور سر پر سوار ہوتا چلا جاتا۔ کسی بات پر اتنی بے ساختہ ہنسی آتی کہ اماں اپنے بستر میں لیٹے لیٹے آواز لگاتی۔

پاگل ہو گئی ہے؟" وہ اپنی ہنسی کو بمشکل دباتی لیکن کچھ ہی لمحوں بعد بے ساختہ مزاح پر ہنسی بھی بے ساختہ آجاتی۔ پاکیزہ بھی ریڈیو" سن رہی ہو گی، تسکین نے اندازہ لگایا۔

بیڈ سے نیچے اتری، پیروں میں چپل اڑیسی اور کھڑی ہو گئی۔ رات کمرے میں پانی رکھنے کی یاد ہی نہیں رہی تھی۔ اب پاکیزہ کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ تسکین نے اندازہ لگایا کہ ضرور آج پاکیزہ کی کال مل گئی ہو گی۔

کیسا پاگل پن ہوتا ہے ریڈیو سننے میں۔۔۔ عجیب جنونی سی کیفیت ہوتی ہے میلوں دور بیٹھے بندے کی آواز پر دل کی دھڑکن دھڑکنے لگ جاتی ہے۔ جو وہ کہہ رہا ہوتا ہے، وہ محسوس ہو رہا ہوتا ہے! گہری رات میں چھپ چھپ کر بیٹھک سے ٹیلی فون کا ڈائل گھمانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اوپر سے فون کا ڈائل بھی وہ تھا جس میں ہندسے پر انگلی رکھ کر ڈائل کو کلاک وائز گھما کر چھوڑنا پڑتا۔ قوی امید یہی ہوتی کہ شور سے کوئی جاگ جائے گا۔ ڈائل کو ڈھیلا چھوڑا ہی نہ جاتا بلکہ انگلی رکھے رکھے ہی ڈائل کو اصل جگہ پر واپس لایا جاتا۔ اس طرح شور قدرے کم ہوتا لیکن فون ملاتے ملاتے ہی وقت لگ جاتا۔ اب زندگی کتنی آسان ہو گئی ہے بس انگلی سے نام چھونا پڑتا ہے اور آوازوں کا تبادلہ ہو جاتا ہے۔ نہ فون نمبر یاد کرنے کی جھنجھٹ نہ فون ڈائری سنبھالنے کی مصیبت۔ وقت کا پہیہ بھی کیسی کیسی تبدیلیاں لا رہا ہے بالکل فون کے ڈائل کی طرح۔۔۔!

تسکین نے ماضی اور حال کو ایک ہی نگاہ سے جانچ لیا۔

"آپ سے بات نہ کروں تو مجھے نیند کہاں آتی ہے۔ دکان سے جلدی نکلا کریں۔ جب تک آپ نہیں ہوتے، میرا بستر پر لیٹنا بے معنی ہوتا ہے۔ بس کروٹیں بدلتی رہتی ہوں، آنکھ نہیں لگتی۔"

پاکیزہ کتنی آسانی سے کتنی گہری باتیں کر رہی تھی۔ اس کے کمرے کے دروازے میں کھڑی تسکین حیران رہ گئی۔

بات آر جے یاڈی جے سے نہیں ہو رہی تھی۔ یہ کوئی اور ہی تھا! تسکین کو یقین ہو گیا۔ وہ اب سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔

"اگر اندر چلی جاتی ہوں تو ایک دفعہ پہلے کی طرح غلط فہمی ہی نہ ہو جائے۔ اگر باہر رکی رہتی ہوں تو میری تربیت پر نہ حرف آئے۔"

اولاد مشکل میں ڈالتی ہے۔ چاہے اسے پیدا کرنا ہو یا پالنا ہو دونوں صورتوں میں مشکل ہے۔ اولاد کو نہیں پتا ہوتا پیدا کرنے والے اور پالنے والے ہی مشکل کاٹتے ہیں۔

"آفتاب پلیز مجھے جلدی سونے کا نہ کہیں۔ آپ کو میری فکر ہوتی ہے تو بس جلدی گھر آجایا کریں۔"

اب مزید کسی تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ پیاس اڑن چھو ہو گئی تھی۔ تسکین نے کمرے میں داخل ہو کر روشنی کر دی۔

پاکیزہ ہڑبڑا گئی۔ اس نے فورا فون بند کر کے سرہانے کے نیچے رکھنے کی سعی کی لیکن تسکین اسکے سر پر پہنچ گئی تھی۔

پھوپھوہ۔۔۔ لفظ پاکیزہ کے منہ میں تھے۔

تسکین نے بہت خاموشی سے اس کے ہاتھ سے موبائل فون لیا اور روشنی گل کر کے چلی گئی۔

"اب کیا ہو گا؟"

اندھیرے میں یہ سوال پاکیزہ کے سارے وجود میں رینگ رہا تھا۔ اسے یاد آرہا تھا بہت سے پیغامات انباکس اور سینٹ آئٹم میں موجود تھے جنہیں اگر تسکین پڑھ لیتی تو قیامت آجاتی۔ یہ تو اب طے تھا کہ قیامت آنی ہے۔ فقط انتظار تھا کہ قیامت کب آئے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ خوف دِل میں نگاہ میں اضطراب کیوں ہے؟
طلوع محشر سے پیشتر یہ عذاب کیوں ہے
کبھی تو بدلے یہ ماتمی رُت اُداسیوں کی
میری نگاہوں میں ایک ساشہر خواب کیوں ہے
کبھی کبھی تیری بے نیازی سے خوف کھا کر
میں سوچتا ہُوں کہ تُو میرا انتخاب کیوں ہے؟
فلک پہ بکھری سیاہیاں اب بھی سوچتی ہیں
زمیں کے سر پہ یہ چادر آفتاب کیوں ہے
ترس گئے میرے آئینے اُس کے خال وخد کو
وہ آدمی ہے تو اس قدر لاجواب کیوں ہے؟

اُسے گنوا کر پھر اُس کو پانے کا شوق کیسا؟

گناہ کر کے بھی انتظارِ ثواب کیوں ہے

تیرے لیے اُس کی رحمتِ بے کنار کیسی؟

میرے لیے اُس کی رنجش بے حساب کیوں ہے؟

اُسے تو "محسن" بلا کی نفرت تھی شاعروں سے

پھر اُس کے ہاتھوں میں شاعری کی کتاب کیوں ہے؟

بے باک گفتگو اور ذو معنی باتیں۔۔۔ یوں لگتا تھا کہ شباب دنیا کی پہلی بنت حوا پر آیا ہے اور دیوانگی پہلے ابن آدم کی وراثت ٹھہری ہے۔ کچھ بھی تو قابو میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ تسکین از حد پریشان ہوئی اس کی نظروں کے سامنے چار سال پرانی پاکیزہ گھوم گئی وہ جس میں کچھ کر دکھانے کا عزم تھا۔ اس نے اب کی پاکیزہ کو سوچا۔۔۔ گریڈز تو اب بھی اچھے آ رہے تھے لیکن جوش مفقود تھا۔ پہلے جیسی کچھ کر دکھانے کی بے چینی نہیں رہی تھی۔

لڑکیوں کی آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں اور خواب بڑے! ان بڑے بڑے خوابوں کی سمتیں کب بدل جاتی ہیں ان چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو معلوم بھی نہیں ہوتا۔

گفتگو میں دیوانگی اور جذباتیت اس انتہا پر تھی کہ اگر پاکیزہ سے موبائل لے لیا جاتا تو وہ کوئی نہ کوئی چور راستہ ڈھونڈ ہی لیتی۔ اس نے ہر صورت چور راستہ ڈھونڈنا تھا۔ جس شدت سے وہ کچھ کر دکھانا چاہتی تھی اسی شدت سے اب وہ آفتاب کو چاہتی تھی۔

شدت انسان کی دنیا کو دھندلا کر دیتی ہے، ہر منظر پر شدت حاوی ہو جاتی ہے۔ شدت کا جو دل چاہتا ہے انسان سے کرواتی ہے۔ جو رویہ چاہے اسکا مظہر بناتی ہے۔ مزے کی بات!۔۔۔ یہ شدت میں ڈوبے انسان کو خود پتہ نہیں ہوتا کہ وہ شدت کے شکنجے میں ہے یہ شدت کا فلسفہ تسکین سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا۔ اس نے بھی پورے دل سے پوری شدت سے کچھ چاہا تھا۔ اس کے بعد ادھورا پن ذات میں رہ گیا۔ اب برسوں بعد اس نے رنگوں سے کھیل کر اس ادھورے پن کو چاٹنے کی کوشش کی تھی لیکن ادھورا پن بھی تو پالتو کتے کی طرح ہوتا ہے آپ جتنا اسے جھڑکیں، جان چھڑوائیں، وہ اتنا ہی آپ کی ٹانگوں سے لپٹتا ہے، اتنے ہی آپ کے پیر چاٹتا ہے۔۔

تسکین کو سمجھ نہیں آ رہا تھا منہ زوری اور اور بے راہ روی سے پاکیزہ کا منہ کیسے موڑے۔ اگر وہ پاکیزہ کو روکتی تو پاکیزہ اسے اپنا دشمن سمجھتی۔ محبت میں یہی تو ہوتا ہے محبوب کے علاوہ سب ظالم لگتے ہیں۔ بہت سوچ سمجھ کر تسکین نے آفتاب سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جانا تھا۔ معلوم ہو جانا تھا کہ لڑکا واقعی سچا ہے یا وقت گزاری کر رہا ہے۔ اگر سچا ہوتا تو رشتے کو معتبر نام دیا جا سکتا تھا ورنہ اس کی بے وفائی پاکیزہ کا منہ موڑنے کے لیے خود بڑی دلیل ثابت ہوتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

فرصت ملے تو اپنا گریباں بھی دیکھ لے

اے دوست یوں نہ کھیل میری بے بسی کے ساتھ!

پاکیزہ پریشان تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ آفتاب کا نمبر موبائل میں موجود تھا۔ اگر پاکیزہ سے موبائل یوں اچانک نہ چھینا جاتا تو کم از کم وہ انتہائی ذاتی گفتگو ہی موبائل سے مٹا دیتی۔ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ تسکین کیا کر سکتی ہے اور جواب بہت بھیانک تھے۔

تسکین مار پیٹ کا راستہ اپنا سکتی تھی۔ تسکین پڑھائی چھڑوا سکتی تھی۔ اور تسکین آفتاب سے رابطہ بھی تو کر سکتی تھی۔

یہ سوال باقی سوالوں سے اس سوال کے بعد مزید کئی سوال منہ کھولے کھڑے تھے۔

پاکیزہ کو لگتا تھا وہ زندہ سلامت قبر میں اتار دی گئی ہے۔ اسے نہیں پتا کہ اندھیر نگری میں بچھو اور اژدھے کیسے اسے اپنی خوراک بنانے والے ہیں۔

ٹھیک ہے کہ آفتاب اس سے محبت کرتا تھا لیکن کیا آفتاب اس کی محبت کا دفاع کر سکتا تھا؟

ٹھیک ہے کہ آفتاب نے ہزاروں دعوے کیے تھے لیکن کیا وہ واقعی دعوؤں پر پورا اترے گا؟

پاکیزہ کے ہاتھ سے سب چیزیں ریت کے ذروں کی طرح نکل کر بکھر چکی تھیں۔ اس کی زندگی میں مشکلات آ گئی تھیں، وہ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی۔ اندھیرے میں خود کو ڈھونڈنا چاہتی تھی، کھوجنا چاہتی تھی لیکن حالات ایسے ہو گئے تھے کہ وہ تو خود کو ٹٹول بھی نہ سکتی تھی۔

یخ برف سل پر رکھے ہوئے انگارے سی حالت تھی۔ انگارہ بھی بجھ سکتا تھا اور برف بھی پگھل سکتی تھی۔۔۔ ہونا کیا ہے۔۔۔ کون جانتا ہے؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جو اُتر کے زینۂ شام سے

تیری چشمِ خوش میں سما گئے

وہی جلتے بجھتے سے مہر و ماہ

میرے بام و در کو سجا گئے

یہ عجیب کھیل ہے عشق کا

میں نے آپ دیکھا ہے یہ معجزہ

وہ جو لفظ میرے گماں میں تھے
وہ تیری زبان پر آ گئے
وہ جو گیت تم نے سنا نہیں
میری عمر بھر کا ریاض تھا
میرے درد کی تھی داستاں
جسے تم ہنسی میں اڑا گئے
وہ چراغِ جاں، کبھی جس کی لو
نہ کسی ہوا سے نگوں ہوئی
تیری بیوفائی کے وسوسے
اُسے چپکے چپکے بجھا گئے
وہ تھا چاند شامِ وصال کا
کہ تھا رُوپ تیرے جمال کا
میری رُوح سے میری آنکھ تک
کسی روشنی میں نہا گئے
یہ جو بند گانِ نیاز ہیں
یہ تمام ہیں وہ لشکری
جنہیں زندگی نے اماں نہ دی
تو تیرے حضور میں آ گئے
تیری بے رُخی کے دیار میں
میں ہَوا کے ساتھ ہَوا ہُوا
تیرے آئینے کی تلاش میں
میرے خواب چہرہ گنوا گئے
تیرے وسوسوں کے فشار میں
تیرا شرارِ رنگ اجڑ گیا

میری خواہشوں کے غبار میں

میرے ماہ و سالِ وفا گئے

وہ عجیب پھول سے لفظ تھے

تیرے ہونٹ جن سے مہک اٹھے

میرے دشتِ خواب میں دُور تک

کوئی باغ جیسے لگا گئے

میری عمر سے نہ سمٹ سکے

میرے دل میں اتنے سوال تھے

تیرے پاس جتنے جواب تھے

تیری اِک نگاہ میں آ گئے

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو جیسے کمرے میں روشنی نہ رہی۔ تسکین حسن کے رعب میں آئی تھی۔ یہ لڑکا تو اتنا پیارا تھا کہ انکار بھی کرتا تو برا نہ لگتا۔ صبیح رنگت اور غزالی آنکھیں۔۔۔ چال میں کچھ لڑکھڑاہٹ تھی۔ اعتماد ڈگمگایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کھڑا رہے یا بیٹھ جائے۔ جو اثر تسکین پر ہو چکا تھا اس نے تسکین کو بات کرنے کے قابل تو نہیں چھوڑا لیکن معاملے کی نزاکت تھی کہ سنبھلنا ضروری تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے حکم دیا۔

"اسلام علیکم۔۔" بوکھلاہٹ میں سلامتی نہ بھیجنے کا احساس ہوا تو وہ بولا۔

"وعلیکم سلام۔ کیا کرتے ہو؟

آج زندگی کا پہلا انٹرویو تھا حلق خشک ہونے لگا۔

"بی کام کے پیپرز دے رہا ہوں۔"

"یعنی اپنے پیروں پر نہیں کھڑے۔" تسکین نے نہ چاہتے ہوئے بھی سوال پوچھا حالانکہ آفتاب کے حال حلیے سے اس سوال کی نوبت نہیں آتی تھی۔

"نہیں جی کھڑا ہوں۔۔۔ مطلب ایک چھوٹا سا مرغی خانہ بھائی نے کھول کر دیا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔"

"پاکیزہ سے باتیں کرنے کا کیا مقصد ہے؟" وہ سیدھے سبھاؤ اصل بات پر آئی۔

"میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس لمحے اس کا لہجہ ذرا بھی نہیں لڑکھڑایا تھا۔

"پھر اپنے والدین کو بھیجو۔" مطالبہ کیا گیا۔

"ضرور بھیجوں گا۔ ابھی بس کچھ مسائل ہیں۔" وہ جھجکا۔

"کس قسم کے مسائل؟ کیا گارنٹی ہے کہ یہ مسائل آئندہ نہیں رہیں گے؟" تسکین نے مزید سوالات پوچھے۔

"بس کچھ گھریلو مسائل ہیں۔ گھر کا خرچہ بھائیوں کے سر ہے اور بھائیوں کی لگام بھابھیوں نے تھام رکھی ہے۔ مجھ پر ہونے والا خرچہ تو برداشت کیا جارہا ہے لیکن ایک اور نفس جو صرف میری ایماء پر اس گھر میں شامل ہو اس کا خرچہ کوئی نہیں اٹھائے گا۔"

"پھر بھی رشتے کی بات تو کی جاسکتی ہے۔"

"بات تو کوئی بھی کی جاسکتی ہے لیکن نتیجہ خاطر خواہ نہیں نکلے گا۔ میں پاکیزہ کو کسی پر مسلط نہیں کرنا چاہتا۔ عزت کے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔" لڑکے کی بات میں دم تھا۔

تسکین نے چائے آفتاب کے کپ میں انڈیلی۔ اس نے شکریہ کہہ کر پیالی اٹھالی۔

نشست کا انداز اس کے اچھے گھرانے سے تعلق کی گواہی دے رہا تھا۔ مرغی خانے کا پتہ پوچھا بتادیا گیا پھر تسکین نے گھر کا پتہ پوچھا۔ پوش علاقے سے تعلق کا سن کر مزید سوال کرنے کا دل نہ چاہا۔ دل کڑا کر کے شناختی کارڈ کی کاپی بھی مانگ لی۔ آفتاب نے وہ بھی فوری پیش کی۔ اس کی چائے ختم ہو چکی تھی۔ وہ رخصت لے کر گھر سے باہر نکل آیا۔

ٹھنڈی چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے تسکین کمرے کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے کھڑی اس کی پشت کو دیکھتی رہی۔ اس نے تنہائی کا عذاب سہا تھا۔ اسے کچھ سکون ملا کہ پاکیزہ کے نصیب میں تنہائی کے آبلے نہیں ہیں۔

لڑکا ثابت قدم نہ ہوتا تو ملنے نہ آتا۔ ملنے آ بھی گیا تھا تو یوں سب سچ نہ بتاتا۔ اپنے شناختی کارڈ کی نقل بھی تھما کر نہ جاتا۔

پچھلے دنوں آفس کی یاسمین بیگ نے اپنی بیٹی کے عاشق کا قصہ سنایا تھا۔ یاسمین نے فون کیا تو وہ فوراً مکر گیا۔ "میں کوئی عاشق واشق نہیں ہوں"۔ ذرا سختی سے بات کی تو معافی تلافی پر اتر آیا۔ اس کے بعد کال تو دور کی بات مسڈ کال دینا بھی بھول گیا۔

وہ موازنہ کر رہی تھی اور پلڑا آفتاب کا بھاری تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چل آ اِک ایسی نظم کہوں

جو لفظ کہوں وہ ہو جائے،

بس اشک کہوں تو اِک آنسو

ترے گورے گال کو دھو جائے،

مَیں آ لکھوں، تُو آ جائے،

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

میں بیٹھ لکھوں، تُو آ بیٹھے،
مرے شانے پر سر رکھے تو
مَیں نیند کہوں، تُو سو جائے۔
میں کاغذ پر ترِے ہونٹ لکھوں
ترِے ہونٹوں پر مُسکان آئے،
میں دِل لکھوں، تُو دِل تھامے،
میں گُم لکھوں، وہ کھو جائے۔
ترِے ہاتھ بناؤں پینسِل سے
پھر ہاتھ پہ تیرے ہاتھ رکھوں
کُچھ اُلٹا سِیدھا فرض کروں
کُچھ سِیدھا اُلٹا ہو جائے۔
میں آہ لِکھوں، تُو ہائے کرے
بے چین لکھوں، بے چین ہو تُو
پھر میں بے چین کا ب کاٹوں
تُجھے چین زرا سا ہو جائے۔۔
ابھی ع لکھوں، تُو سوچے مجھے
پھر ش لکھوں، تری نیند اُڑے
جب ق لکھوں، تُجھے کُچھ کُچھ ہو
مَیں عِشق لِکھوں، تُجھے ہو جائے۔۔

وہ گھڑی نہیں پہنتی تھی لیکن آفتاب اسے گھڑیاں تحفے میں دے چکا تھا۔ سو کبھی بھی گھڑی پہنے بغیر گھر سے نہ نکلتی۔ وہ کہتا تھا میرے نام میں پانچ حروف ہیں۔ پانچ چوڑیاں پہن کر رکھا کرو۔ وہ لباس سے ہم رنگ پانچ چوڑیاں ہمہ وقت پہنے رکھتی۔ اسے پاکیزہ کی آنکھوں میں کاجل پسند نہیں تھا۔ پاکیزہ نے کاجل تو دور کی بات سرمہ سلائی کو بھی آنکھوں کے قریب لے جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ کہتا تھا "چاولوں کے اوپر رائتہ ڈال کر کھانے کا مزہ نہیں آتا۔ تم چمچ بھر کر رائتہ کی ایک چمچ چاول کے بعد کھایا کرو۔" پاکیزہ کو اب اسی کی طرح کھانے میں مزہ آنے لگ گیا تھا۔ وہ خواب دیکھتا تھا اور پاکیزہ تعبیر کے لیے کوشاں ہو جاتی۔

مرغی خانے کے حاصل وصول میں جب اونچ نیچ ہوتی، پاکیزہ کے جمع کردہ پیسے کام آتے۔ شرٹ، ٹائی، جینز، والٹ، گھڑی وہ اسے تحفے میں دے چکی تھی۔ وہ بھی کہیں بھی جاتا اس کے لیے ضرور کچھ لاتا۔ کشمیر کی شال ہو، خوبصورت چائے کا کپ ہو، دونوں کے نام کی کی چین ہو، سیپیوں پر ان کا ایک ساتھ کندہ نام ہو، چوڑیاں ہوں، مالا ہو اس ہی کی طرف سے ملی تھی۔

اب بھی ڈر لگ رہا تھا۔ پھر بھی ڈر لگ رہا تھا۔ اگر تسکین پھوپھو اس سے ملی اور اس نے کوئی الٹی سیدھی بات کر دی؟ اگر اس نے کوئی بات ہی نہ کی؟ اگر وہ خاموش ہو گیا؟ اگر وہ منکر ہو گیا؟ اگر اس نے نکاح کی بھنک بھی دے دی؟ اگر وہ میرے لیے اپنے جذبات واضح نہ کر سکا؟ اگر کسی بات پر بحث ہو گئی؟ پھر کیا ہو گا؟ اب کیا ہو گا؟

سوچ سوچ کے سر پھٹنے کے قریب تھا۔ تسکین پھوپھو کے گھر آنے کا وقت ہو گیا۔ وہ ان کا سامنا کرنے سے بھی کترا رہی تھی۔ کاش کالج سے واپسی پر پی سی او سے فون ہی کر لیتی۔ آفتاب کو منع کر دیتی کہ وہ پھوپھو سے نہ ملے۔ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ کچھ دیر مزید کبوتر کی طرح پروں میں سر چھپانے میں کیا قباحت ہے؟ کچھ الٹا سیدھا نہ ہو جائے۔ روشنی روشنی سا ہاتھ مجھ سے چھوٹ ہی نہ جائے۔

دروازے کے قفل سے باہر کی طرف سے چھیڑ خانی کی آواز آئی۔ پاکیزہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چھپ گئی۔

کوئی دس منٹ گزرے ہوں گے کمرے میں آہٹ سنائی دی۔ پاکیزہ کو پکارا گیا اس نے کمبل میں چھپایا ہوا سر باہر نکالا بستر کی پائنتی پر بیٹھی پھوپھو نے اس کا موبائل ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

"آج تمہارے کالج ٹائم میں میں نے آفتاب کو گھر بلایا تھا۔"

پاکیزہ کے دل کی دھڑکن تیز تیز اور بہت تیز ہو گئی۔

"اس سے بات ہوئی ہے۔ کہتا ہے جیسے ہی ممکن ہوا گھر والوں کو بھیجے گا۔ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اچھا لڑکا ہے لیکن لڑکے سدا اچھے نہیں رہتے۔ کب ان کے دل میں بال آ جائے کچھ پتہ نہیں لگتا۔ عورت بیوی ہو یا گرل فرینڈ۔۔ خود کو تھالی میں رکھ کر بار بار پیش کرے تو دل اوب جاتا ہے۔ تم فاصلہ رکھو۔ کشش باقی رہنے دو۔ بہت قریب آ گئے تو بہت دور جانا پڑے گا۔"

تسکین نے فون اس کے قریب رکھا اور باہر چلی گئی۔

پاکیزہ اپنی خوش قسمتی پر رشک کر رہی تھی۔ رابطے کا ذریعہ اس کے پاس تھا۔ وہ اب بھی گھڑیاں پہن سکتی تھی، اس کی کلائی کی کھنک نے باقی رہنا تھا، اسے کاجل لگانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ چمچ بھر کر رائتہ پورے مان سے کھا سکتی تھی۔

اس ایک شخص کی محبت نے تو خرید لیا ہے مجھے۔ یہ شخص مجھے خود سے دور ہی نہیں جانے دیتا۔ کیسی بھی مشکل کیوں نہ آئے یہ "راستے میں کھڑا نظر آتا ہے۔ یہ سچ کہتا ہے راستے کے سارے کانٹے دور کر دے گا۔، مجھے اپنی دلہن بنائے گا۔ مجھے وہ عزت دے گا جس کا مطالبہ میں نے اس دنیا میں کسی سے نہیں کیا۔ میں اس طرح سے چاہے جانے کے قابل تو نہیں لیکن یہ شخص مجھے زیر بار کر رہا

ہے۔اس کی محبت کا احسان میری دھڑکنوں میں دھک دھک کر رہا ہے۔میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کے تسمے کیوں باندھے؟ مجھے "لبوں سے باندھنے چاہیے تھے۔

وہ شکر گزاری کی انتہا پر تھی۔ تین لفظی اظہار محبت اور پیار والی شکل بنا کر اس نے من کے دیوتا کو ہوا کے دوش پر بھیجی۔

محبت رقص میں تھی اور پاکیزہ کے دونوں پیر تھرک رہے تھے۔

محبت۔۔۔محبت۔۔۔محبت!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

چاہت میں کیا دنیاداری عشق میں کیسی مجبوری

لوگوں کا کیا سمجھانے دو ان کی اپنی مجبوری

میں نے دل کی بات رکھی اور تو نے دنیا والوں کی

میری عرض بھی مجبوری تھی، ان کا حکم بھی مجبوری

روک سکو تو پہلی بارش کی بوندوں کو تم روکو

کچی مٹی تو مہکے گی ہے مٹی کی مجبوری

وہ پور پور محبت میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ آفتاب ہر طرح سے اپنی صداقت کا یقین دلا رہا تھا۔جو اس کے اختیار میں تھا کر رہا تھا۔جو اختیار میں نہیں تھا وہ بھی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔اسے پیاس لگتی تو اپنے ہاتھ پیالہ بنا کر چشمے پر لے جاتا۔وہ ایسا ہی تھا اس کے لیے ہر رشتہ وہی تھا۔

رمضان کی آمد ہو چکی تھی۔رات دیر سے گھر آتا۔سحری کے وقت آنکھ نہ کھل پاتی اور آفتاب کی امی نے آفتاب کے دیر سے گھر آنے کی وجہ سے سحری کے وقت جگانے کی ذمہ داری بھی آفتاب کو سونپ رکھی تھی۔ آفتاب ایک بجے گھر آتا اور ڈیڑھ گھنٹہ سونے لیٹتا تو آنکھ پھر آرام سے امی کے اٹھانے پر ہی کھلتی۔اس کی امی کو جگانے کی ذمہ داری پاکیزہ نبھا رہی تھی۔ آفتاب کے گھر کا نمبر اس کے پاس تھا۔وہ لوکل نمبر پر فون کرتی کوئی اٹھاتا تو فون بند کر دیتی۔ آفتاب اوپر اپنے کمرے میں سویا ہوتا۔نچلے پورشن میں اس کی امی فون اٹھاتی اور یہی سمجھتی کہ آفتاب نے فون کیا ہے۔بعد میں سحری کے وقت آفتاب کو سحری تیار کر کے جگانے جاتی تو وہ کہتا آپ کو بیل دے کر بس ابھی ہی آنکھ لگی تھی۔وہ دونوں ایک دوسرے کے گھر میں نہیں تھے مگر ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ آفتاب کے گھر کے نمبر پر سی۔ایل۔آئی لگا ہوا تھا پاکیزہ سمجھتی تھی کہ کوئی تو کسی دن نمبر دیکھے گا شک گزرے گا۔ آفتاب کے گھر میں خبر والدہ سے سرسراتی ہوئی دوسرے لوگوں تک پہنچ جائے گی اور وہ آہستہ آہستہ اس گھر کی غائبانہ فرد بنے گی اور پھر اس گھر کا اٹوٹ حصہ بن جائے گی۔بس اتنی ذرا سی تو خواہش تھی۔

"اس کی خواہش کیا بہت بڑی خواہش ہے۔۔۔؟" وہ اکثر خود سے پوچھتی۔ "اتنی بڑی دنیا ہے، اس میں ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ بڑے عام سے انسان اس گھر میں رہتے ہیں۔ ان عام سے انسانوں کی زندگی میں اگر میں بھی شامل ہو جاتی ہوں، اس عام کا گھر کا میں حصہ بن جاتی ہوں تو اس بڑی سی دنیا میں کیا بگڑے گا؟

"کچھ بھی تو نہیں بگڑے گا۔۔۔ پھر اس دنیا کا خالق اس چھوٹی سی خواہش کو کیوں رد کرے گا؟

وہ رب سے امید لگا کر بیٹھی تھی۔ اس لیے خوش گمان تھی۔ رب نے ایک اور وسیلہ بنایا۔ آفتاب کے گھر کا فون خراب ہو چکا تھا۔ پاکیزہ کے پاس آفتاب کے گھر کے ہر فرد کا نمبر تھا۔ پہلے پہل پاکیزہ آفتاب کے نمبر پر فون کرتی رہی لیکن آفتاب نے فون نہیں اٹھایا۔ نیند میں شاید وہ موبائل کو خاموش کر کے سویا تھا۔ پاکیزہ نے سوچا امی کو کال کر لے وہ اس کے لیے آفتاب کی امی نہیں تھی صرف امی تھی۔۔۔ پھر بمشکل اپنا ارادہ ملتوی کیا۔

بالآخر کافی پس و پیش کے بعد اس نے آفتاب کے بھائی ماہتاب کو میسج کیا۔ کوئی جواب نہ ملا تو کال ملا دی۔

کال جا رہی تھی اور پاکیزہ کا دل دھڑک رہا تھا۔

پانچویں بیل کے بعد فون اٹھا لیا گیا نیند میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

"ہیلو" آواز میں آفتاب کے لہجے کی چاشنی تھی۔

پاکیزہ نے گڑبڑا کر فون رکھ دیا۔

کہیں ماہتاب بھائی کو شک ہی نہ پڑ جائے، یہ سوچ کر فوری پیغام بھیجا۔

"میں آفتاب کا دوست صفیان ہوں۔ موبائل خراب ہے آواز نہیں جا رہی تھی۔ اس لیے فون رکھ دیا۔ مقصد صرف سحری کے لیے جگانا تھا۔"

جواباً شکریہ اور آگے ہنسنے والی شکل بھیجی گئی۔

اصل بات آفتاب سے معلوم ہوئی۔ سحری کی میز پر سب نے غائبانہ پاکیزہ کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے "ہمیں پہلے ہی معلوم تھا آفتاب وقت پر جگا نہیں سکتا۔"

باقی سارا رمضان پاکیزہ ماہتاب بھائی کو جگاتی رہی اور وہ والدہ کو۔ ایک دن فون اٹھاتے دیر ہوئی ساتھ ہی میسج آ گیا۔

"گڑیا میں اٹھا ہوا تھا، دہی لینے گیا تھا۔"

پاکیزہ کو لگا اس کی ریاضتیں باثمر ہو گئی ہیں۔ وہ غائبانہ طور پر ہی سہی لیکن خواب نگر میں قدم رکھ چکی تھی۔ نیلے پردوں والے کمرے کا تصور اسے آسمان کی رعنائیوں سے روشناس کروا رہا تھا۔

ایک قدم اور۔۔۔ بس ایک قدم اور۔۔۔

پیر میں کانٹا چبھ بھی گیا تو وہ نکالنے والا ہو گا!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تم سمجھتے ہو مجھے اس کی کوئی فکر نہیں؟؟

میں تو خود دل سے یہ کہتا ہوں سدھر جا مرے دوست!

پاکیزہ کی اکلوتی پھوپھو کو معلوم ہو چکا تھا۔ آفتاب کے گھر میں بھی دھواں پہنچ گیا تھا۔ ایک دوسرے کے نکاح میں تو وہ ایک دوسرے کے لیے پہلے سے تھے۔ اصرار بڑھنے لگے تھے، انکار کم ہونے لگا تھا۔ مہینہ میں ایک دفعہ ملنا لازم وملزوم ہوا۔ بات پندرہ دن تک آ گئی بس پھر جہاں ممکن ہو تا مل لیتے، جب ممکن ہو تا مل لیتے۔

پاکیزہ اس کی مان لیتی تھی لیکن بے چین رہتی تھی۔ عوامی تفریح گاہوں پر، کیفے میں، عوامی کتب خانے میں۔۔۔ ہر جگہ صرف وہ دونوں تو نہیں ہوتے تھے، ہزاروں لوگ ہوتے تھے۔ پکڑے جانے کا خوف دیکھے جانے کا خوف دونوں کو رہتا۔ پاکیزہ تو بہت سہمی سی رہتی لیکن آفتاب کہتا میں دیکھ لوں گا اگر کسی نے دیکھ لیا تو معاملہ کیسے سنبھالنا ہے۔ یہ میری فکر ہے۔ تم میری خواہش کا احترام کرتی ہو تو کیا میں اتنا بھی نہیں کر سکتا؟ وہ متشکر سی ہو جاتی۔

کوئی جگہ، شے، بحث، شام، مرئی یا غیر مرئی مفہوم نہیں تھے جو دونوں کے درمیان نہ آئے ہوں پھیلے نہ ہوں سمٹے نہ ہوں سلجھے نہ ہوں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

آنکھ میں اشک بچا کر رکھنا

جانے کس موڑ پر گھر آ جائے۔

"وہ ایک دوسرے کے لیے "made for eachother " soulmate" ان کے آگے پیچھے رہنے والے روز دوستیاں کرتے، محبت پر اصرار کرتے اور چھوڑ دیتے لیکن وہ قائم تھے۔ ایک دوسرے کے بچپن کے دوست بھی تھے، محبت بھی اور عاشق بھی۔ انہیں اپنے تعلق پر ناز تھا۔ وہ ایک دوسرے کا مان تھے۔"

آدھی رات کو فرمائشی پیغام آتا اپنی تصویر بھیجو اور وہ بھیج دیتی۔ یقین کی انتہا تھی۔ کسی شک کی کوئی حد درمیان میں تھی ہی نہیں۔۔۔

میں نے آپ کو دیکھنا ہے۔ محبت نے آگ اس کے دل میں بھی لگائی تھی۔ آفتاب تصویر بھیجتا تو پہروں موبائل سکرین پر انگلیاں مس کرتے ہوئے وقت گزرتا جاتا۔ اب انتظار نہیں ہوتا تھا، اب صبر بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی خوشبو سے واقف تھے۔ عوامی تفریح گاہوں میں مل کر بے چینی میں اور اضافہ ہو جاتا۔ دل سنبھالے نہ سنبھلتا آخر آفتاب نے حل نکالا۔

"میرے دوست کا فلیٹ ہے وہاں کوئی نہیں ہوتا۔"

"میں نہیں مل سکتی کسی کو پتا چل گیا تو؟

"اب بھی تمہیں دوسروں کا ڈر ہے؟"

" رہنا تو دنیا میں ہے ناں؟"

" فیصلہ کرلو۔ دنیا میں رہنا ہے یا میرے ساتھ رہنا ہے۔

" آپ انتہا پر کیوں جاتے ہیں؟ فیصلہ تو ہو چکا ہے آ"

وہ سر جھکانا سیکھ چکی تھی، اب اسے سر اٹھانا بھول گیا تھا۔ وہ مان گئی۔

آفتاب کی ہر بات میں پاکیزہ تھی۔ گھر والے بھی غائبانہ وجود سے کافی شناسا ہو گئے۔ چھیڑ خانی جاری رکھتے۔ آفتاب کے کزنز سے اکثر ہی بات ہو جاتی۔ سب آفتاب کی شدتوں کی گواہیاں دیتے۔ یہ ساری چھیڑ خانیاں آفتاب پاکیزہ کو بتاتا رہتا اور وہ خوش ہوتی۔ اس خوشی میں بھی وہ نہ مانتی تو کب مانتی۔

وہ اس سے ملنے گئی تھی۔ دوست کے فلیٹ پر بھی، دوست کے بھائی کے گھر بھی، معروف ہوٹل کے کمرے میں بھی۔۔۔ ایک سلسلہ چل نکلا تھا۔ اس سے ملنے جاتی۔ نفل پڑھ کر ملنے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ اس سے مل کر آتی پھر نفل پڑھتی کہ شکر کسی نے دیکھا نہیں۔۔۔

عجیب محبت تھی جس نے دن رات بیگانہ کر رکھا تھا۔ اللہ سے رشتہ بھی بدل دیا۔ کسی کو پتا چلتا تو وہ بند کمرے کے پیچھے نجانے کون کون سے فسانے گھڑ لیتا۔ سچ جو تھا۔۔۔ اس دنیا میں وہ دونوں جانتے تھے۔۔۔ یا اللہ۔۔۔!

آفتاب فرشتہ نہیں تھا اس کے قریب آتا تھا۔ اسے چھوتا تھا۔ اس کے ہاتھ، اس کی آنکھیں، اس کے رخسار چومتا تھا لیکن ایک حد تھی۔ وہ اس حد سے آگے کبھی جا ہی نہ سکا۔ نہ کبھی پاکیزہ اس حد سے آگے نکلی نہ کبھی آفتاب۔ وہ حد کسی نے متعارف نہیں کروائی تھی۔ وہ حد خود ہی درمیان میں آگئی تھی۔

کوئی سنتا تو ہنستا۔۔۔ سینکڑوں بار ملنے والے ابھی بھی حد میں ہیں بھلا یہ بھی ممکن ہے؟ پاکیزہ کے نزدیک یہی تو محبت تھی۔ آفتاب آنکھ سے اشارہ کرتا تو وہ سمجھ جاتی لیکن اس نے کبھی اشارہ کیا ہی نہیں۔ پاکیزہ کی محبت کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ پورے شہر میں کوئی سڑک کوئی کیفے کوئی خالی گھر ایسا نہیں تھا۔ جہاں انہوں نے ایک دوسرے سے محبت کی گواہی نہ مانگی ہو، جہاں پاکیزہ نے آفتاب کے پیروں کو نہ چھوا ہو، جہاں آفتاب نے اس کی ہتھیلی کو آنکھوں سے نہ لگایا ہو، جہاں آفتاب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر محبت کی قسم نہ کھائی ہو۔

یہ محبت ہی اب ان کا جینا مرنا تھی۔ یہ محبت ہی تھی جس کے لیے وہ زندہ تھے جس نے انہیں زندہ رکھا تھا۔ وہ پاکیزہ کی عادت بھی نہیں رہا تھا، فطرت بن چکا تھا۔ عادتیں تبدیل کی جاسکتی ہیں، فطرت سے کوئی منہ نہیں موڑ سکتا۔

وہ پاکیزہ کے بہت قریب بیٹھا سیلفی بنا رہا تھا۔ پاکیزہ کی تصویر اچھی نہیں آئی تو وہ موبائل کھینچنے لگ گئی۔ پیار میں نوک جھونک کتنی اچھی لگتی ہے بچہ بن جانا، بچوں کی طرح برتاؤ کرنا بچوں کی طرح لاڈ اٹھوانا۔۔۔ سب اچھا لگتا ہے!

موبائل پاکیزہ کے ہاتھ میں تھا اور پاکیزہ کا ہاتھ آفتاب کے ہاتھ میں تھا۔

" موبائل چھوڑیں۔۔۔ مجھے ڈیلیٹ کرنے دیں تصویر "

" اتنی اچھی تو آئی ہے۔۔۔ کیوں ڈیلیٹ کر رہی ہو؟"

"ایک تو میں پہلے ہی پیاری نہیں ہوں۔ اوپر سے اتنی عجیب تصویر آئی ہے۔"

تصویر میرے ساتھ ہے یہ تمہارے لیے اہم ہونا چاہیے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں تم کتنی پیاری ہو۔ ویسے بھی انسان اپنے بارے میں کبھی اچھا منصف نہیں ہو سکتا۔

چھینا جھپٹی جاری تھی۔ جب موبائل کی ٹچ سکرین پر یہاں وہاں جاتے کیسے ایک آڈیو (سماعتی پیغام) سنائی دینے لگا۔۔۔ کسی لڑکی کی آواز تھی۔

"تم ہنس کیوں رہے ہو؟"۔

"ہنسنے کی بات ہے تو ہنسوں گا ہی ناں" یہ آفتاب کی آواز تھی۔۔۔ پاکیزہ کا آفتاب جسے وہ کروڑوں میں پہچان سکتی تھی۔

ٹھیک کہا آفتاب یار نیلم کی باتیں ہی فضول ہوتی ہیں ہنسنے والی" یہ ایک اور لڑکے کی آواز تھی۔

پاکیزہ ہکا بکا سی آفتاب کی شکل دیکھ رہی تھی۔ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ آفتاب کس کس سے رابطے میں ہے اور کیا کر رہا ہے اسے تو پتا ہی نہیں ہے۔ خود وہ سانس بھی لیتی تھی تو اطلاع دیتی تھی۔ پاکیزہ کے چہرے کے تاثرات اتنے جامد ہو چکے تھے کہ آفتاب گھبرا گیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں عزہ تم غلط سمجھ رہی ہو۔" وہ پاکیزہ کو اکثر عزہ کہہ کر ہی بلاتا تھا۔

"میں کیا سمجھ رہی ہوں؟" سُن ہوتے وجود کے ساتھ اس انداز میں پوچھا کہ آفتاب کی جان ہی نکل گئی۔ آفتاب پاکیزہ کے اوپر جھکا تھا۔

"غلط نہ سمجھو، کچھ نہ سمجھو، غصے میں کچھ نہ سوچو یہ کانفرنس کال ہے۔ وہ میرے دوست کی کزن ہے۔ صفیان کی نیلم سے شادی ہونے والی ہے۔ ایسا ویسا کچھ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔"

ایک آنسو آفتاب کی آنکھ سے نکل کر پاکیزہ کی آنکھ میں جذب ہوا تھا۔ وہ ایک دفعہ پہلے اس کے آنسو کی بے قدری کر چکی تھی پھر شاید اسی آنسو کے ہاتھ خوار ہوئی۔

دوبارہ بے قدری نہیں کرنا چاہتی تھی بڑے حوصلے کے ساتھ اس نے دل پر جبر کیا اور آفتاب کی آنکھیں پونچھ دیں۔

کھڑکی پر لگا پردہ مسلسل ہوا سے ہل رہا تھا۔ ہوائیں تیز تیز چلتی آنے والے طوفان کا پتا دے رہی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لوگ کچھ بھی کہیں اور میں چُپ رہوں

یہ سلیقہ مجھے جانے کب آئے گا

"آپ عزہ بات کر رہی ہیں؟ مطلب پاکیزہ" فون کرنے والے نے وہ نام استعمال کیا تھا جو صرف آفتاب لیتا تھا۔

"جی پاکیزہ بات کر رہی ہوں۔ کون بول رہا ہے؟" اللہ خیر کرے پاکیزہ آفتاب کی خیریت کی دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگ گئی کہیں آفتاب کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ آفتاب کے موبائل سے اس لڑکے نے میرا نمبر نکال کر فون کیا ہو گا ان کے موبائل میں ہی میرا نمبر عزہ کے نام سے محفوظ ہے۔ وہ سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگ گئی۔

"میں صفیان بات کر رہا ہوں۔ آفتاب کا دوست۔۔۔ میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

دوسری طرف سفیان تھا پاکیزہ کے نکاح کا گواہ۔۔۔ پاکیزہ تھوڑی پر سکون ہوئی۔

"جی کہیں!"

"آپ ایک بہت اچھی لڑکی ہیں لیکن۔۔۔۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ آپ کو کیسے بتاؤں؟"

"آفتاب اکثر ذکر کرتا ہے آپ باقاعدگی سے نماز پڑھتی ہیں۔ میں یہ سوچتا ہوں تو مجھ سے رہا نہیں جاتا۔"

" جی الحمدللہ! آپ جب تک بتائیں گے نہیں تو مجھے سمجھ کیسے آئے گی؟"

دیکھیں آفتاب میرا بہت اچھا دوست ہے، وہ اچھا لڑکا ہے۔" پاکیزہ کو اپنی تعریف سن کر اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی جتنی خوشی آفتاب کی تعریف سن کر ہوئی تھی۔"

محبت میں محبوب آئینہ لگتا ہے۔ آئینہ حسین نظر آئے تو اپنا وجود خوبصورت لگنے لگتا ہے۔ خود حسین لگ رہے ہو تو آئینہ دیکھنے کا جی چاہتا ہے۔ آئینے سے خوبصورتی کی سند لینے کا دل کرتا ہے۔

"میں نہیں چاہتا میری اور آفتاب کی دوستی میں دراڑ پڑے۔ آپ اگر اتنی اچھی نہ ہوتی تو شاید میں آپ سے رابطہ نہ کرتا۔ آفتاب آپ کے لیے اتنا سیریس نہیں ہے جتنی آپ ہیں۔" سفیان نے اپنے تئیں پاکیزہ پر بم گرایا تھا۔

پاکیزہ کو خاص فرق نہیں پڑا۔ وہ آفتاب کو نو سال سے اپنے لیے سلگتا دیکھ رہی تھی۔ آج کل سچا دوست کون ہے۔۔ ضرور حسد کا وار سفیان پر بھی چل گیا ہے اس نے یہی سوچا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے آفتاب مجھے آزما رہا ہو۔

"آپ کو لگتا ہے کہ میں آپ کی بات پر یقین کر لوں گی؟" بڑے ٹھنڈے لہجے میں سوال پوچھا۔

"آپ یقین نہ بھی کریں تو مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میرے دل کو اطمینان ہو جائے گا میرا ضمیر پرسکون ہو جائے گا۔ ویسے بھی میں کوئی بات ثبوت کے بغیر نہیں کرتا۔"

"ثبوت؟ کیسا ثبوت؟" ایک بار اس کا وجود بھی ڈگمگایا۔

"آپ پہلے وعدہ کریں کہ ہماری گفتگو کا آفتاب کو پتہ نہیں چلے گا۔"

"میں کیسے مان لوں کہ آفتاب اس وقت آپ کے ساتھ نہیں ہے۔ آپ کو میرے اور آفتاب کے تعلقات کی نوعیت کا نہیں پتہ۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ایک سے جذبات رکھتے ہیں۔"

"کاش آپ سچ کہہ رہی ہوتیں۔"

"لیکن آفتاب کے گھر میں سب کو میرا پتا ہے۔ وہ مجھ سے دھوکہ نہیں کر سکتا۔"

"اس کے باوجود بھی وہ آپ سے شادی نہیں کرے گا۔ اس وقت وہ میرے ساتھ ہوتا تو میں کبھی آپ کو فون نہ کرتا۔ آپ کو بہن سمجھا ہے بہن کہا ہے۔"

سفیان کے لہجے میں یقین تھا اور پاکیزہ کا دل ہول رہا تھا۔

"شاید آپ نہیں جانتے۔ میں آفتاب کے ساتھ اتنا دور آچکی ہوں کہ اگر وہ خود بھی اپنے منہ سے یہ سب کہے جو آپ کہہ رہے ہیں تو میں شاید اس کا یقین نہیں کر سکوں گی۔"

محبت اندھی ہو چلی تھی۔

"شاید کا مطلب یہ ہے کہ شاید آپ یقین کر بھی سکتی ہیں۔ ویسے میں آپ کو اس کے منہ سے یہ سب سنوا سکتا ہوں۔"

"یعنی وہ ابھی آپ کے پاس ہی ہے اور مجھے آزما رہا ہے۔" پاکیزہ یکدم خوش ہوئی۔

"اپنی خوش گمانیوں سے باہر نکلیں۔ یہ دنیا آپ جیسے سادہ دلوں کے لیے نہیں ہے۔ میں آپ کو اس کے منہ سے یہ سب سنوا سکتا ہوں لیکن آپ کو ایک کام کرنا ہو گا؟"

"کیا کام؟"

"آپ سب سننے کے بعد بھی آفتاب سے دور ہونے کے بعد بھی ہماری گفتگو کے بارے میں اسے کبھی کچھ نہیں بتائیں گی۔"

"اول تو وہ کبھی ایسا کچھ نہیں کہے گا جیسا آپ کہہ رہے ہیں اور وہ کچھ بھی کہہ دے میں اس سے دور نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی یہ ایڈونچر ہی سہی"

"ایسے نہیں آپ اپنی نمازوں کی قسم اٹھائیں کہ آپ اسے کچھ نہیں بتائیں گی۔۔"

" مجھے میری نمازوں کی قسم میں آفتاب کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

کتنا نڈر کر دیتی ہے محبت!

وہ بھول رہی تھی کہ قسم صرف اس ذات پاک کی ہے جس کے قبضے میں کُل عالم کی جان ہے۔

"شاباش میں آپ کو شام چھ بجے فون کروں گا۔ جب آفتاب میرے ساتھ ہو گا۔ آپ نے بولنا نہیں ہے صرف سننا ہے۔ آفتاب اپنے منہ سے بولے گا جو میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

اللہ حافظ۔

پاکیزہ فون رکھ چکی تھی۔ اس کا دل پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ وہ خود کو تسلی دے رہی تھی ہو نہ ہو آفتاب کی طرف سے کوئی سرپرائز ہی ہے۔

محبت کی سب سے بڑی طاقت یہی ہے کہ یہ خوش گمان ہے!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ تماشا سا کیا لگا ہوا ہے؟
چوک میں آئینہ لگا ہوا ہے
مرضیوں کا مرض ہے چاروں طرف
جس کو دیکھو خدا لگا ہوا ہے
ہم بھی کوشش میں ہیں کہ جی لگ جائے
جس طرح آپ کا لگا ہوا ہے
تیری ہر بات مانتے جائیں؟؟
ہم پہ تُو دلربا لگا ہوا ہے؟؟
اب تو وہ طنز بھی نہیں کرتا
اس کو کچھ تو برا لگا ہوا ہے
چار دن شور تو کرو گے تم

تازہ تازہ پتا لگا ہوا ہے

"یار میں تجھے کیا بتاؤں تو موہن پورے والی کا اگر posture دیکھ لے تو پاگل ہو جائے۔ وہ جب شرماتی ہے تو اُف!۔۔۔ تیری سوچ ہے!"

یہ آفتاب کی آواز تھی۔

اس کی سماعتوں میں سیسہ پگھلا ہوا اڈالا جا رہا تھا۔ وہ شدت تکلیف سے پاگل ہو رہی تھی مگر اُف بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اب سفیان بولا۔ "یار پاکیزہ کا کیا سین ہے؟"

"پاگل ہے۔ ہر وقت کہتی ہے شادی کر لو۔" پاکیزہ کو دکھ ہوا۔

"ہے لڑکی بہت اچھی۔۔۔ جتنا پیار وہ مجھ سے کرتی ہے، کوئی دوسری نہیں کر سکتی۔" پاکیزہ کو خوشی ہوئی اس کی وفا کی لاج رکھ لی گئی تھی۔

"شادی ہو جائے تو کوئی برائی نہیں لیکن گھر والے مشکل سے مانیں گے۔" پاکیزہ مزید خوش ہوئی کم از کم وہ شادی تو کرنا چاہتا ہے۔

لیکن یار پڑھ لکھ رہی ہے، اچھی لڑکی ہے۔ گھر والے کیوں نہیں مانیں گے تیرے؟" سفیان نے پوچھا۔

"کالی جو ہے۔۔۔ امی اتنے گورے بیٹے کے لیے کالی لڑکی بیاہ لائیں گی؟ تجھے تو میرے خاندان کی حسن پرستی کا پتہ ہی ہے۔" پاکیزہ یکدم جھکڑوں کی زد میں آئی تھی۔

تنکا تنکا کیسے بکھرتے ہیں آج سمجھ میں آ رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے تو سمیرا سے شادی کرلے گا۔" سفیان نے ایک اور وار کیا۔

"ہاں وہ بھی اچھی ہے۔ دیکھ جس کے لیے گھر والے مان جائیں باہر نہ مانے تو خاندان میں مہوش بھی تو ہے۔" بہت آرام سے آفتاب نے اپنی ماموں زاد کا نام لیا تھا۔

"وہی جس کی وجہ سے تو پچھلی دفعہ لاہور دو دن رہنے گیا اور چار دن بعد واپس آیا؟"

"ہاں یار وہ بہت پیاری ہے۔ گوری چٹی اوپر سے گھٹنوں تک آتے بال ویسے برقع اوڑھتی ہے لیکن برقع سے پھر قیامت نکلتی ہے۔ اسی کو جلانے کے لیے تو پاکیزہ کی باقی سب سے بات کرواتا ہوں۔" اس سے زیادہ پاکیزہ سن نہیں سکتی تھی، وہ برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے فوراً سے فون بند کر دیا۔ چھت پر گھٹنوں میں منہ دیئے وہ زارو قطار رو رہی تھی۔ اس کے پاس کیا بچا تھا کچھ بھی نہیں اسے کتنا دکھ ہوا تھا کیا وہ ماپ سکتی تھی؟

نہیں ممکن ہی نہیں تھا۔۔۔ ممکن تھا تو بس رونا!۔۔۔

دو گھنٹوں بعد جب اس سے صبر نہ ہوا تو فون اٹھایا۔ اسی دشمن جاں کے پیغامات موبائل سکرین پر جگمگا رہے تھے۔

انسان صبر کر سکتا ہو تا تو ناشکرا نہ ہو تا۔ انسان صبر کر سکتا ہو تا تو وہ ناامید نہ ہو تا۔ انسان صبر کر سکتا ہو تا تو وہ ہر صورت نبی ہو تا۔

انسان صبر کر سکتا ہو تا تو وہ انسان ہی نہ ہو تا۔

پاکیزہ سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔

میرے سامنے پاکیزہ پاکیزہ عزہ عزہ کرنے والا مجھے میری پیٹھ پیچھے کیسے یاد کرتا ہے۔۔۔ اسے ذرا خبر نہیں کہ میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر بیٹھی ہوں۔ میرے ساتھ محبت محبت کھیلنے والا فقط مجھ سے کھیل رہا تھا۔ مجھے آفتاب سے بات کرنی چاہیے ضرور کرنی چاہیے۔

" آفتاب میں نے آپ سے پیار کیا تھا۔"

"کیا تھا کا مطلب کیا ہے؟ تم مجھ سے اب پیار نہیں کرتی؟" وہ بالکل نارمل تھا ابھی تین دن پہلے تو ملا تھا۔

پاکیزہ کو قسم یاد آئی۔

"کرتی تھی۔۔۔ اب کیسے کروں؟"

"کیا ہوا ہے پاکیزہ؟ تم عجیب عجیب باتیں کیوں کر رہی ہو؟" وہ ہمیشہ کی طرح پریشان ہوا۔

قسم تو صرف اللہ کی ہوتی ہے اسے فوراً یاد آیا تھا۔

"مجھے موہن پورے والی اور سمیرا سب کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔"

کون موہن پورے والی؟ کون سمیرا؟" وہ ایسے انجان بنا کے پاکیزہ کے پاؤں انگاروں پر آئے اور سر بھڑک اٹھا۔

"وہی لڑکیاں جن کی وجہ سے میں آپ کو کالی لگتی ہوں اور آپ کے گھر والے میرے لیے نہیں مانیں گے۔ آفتاب میں نے آپ کو پورے دل سے چاہا تھا۔ آپ کے علاوہ کبھی کسی کو دیکھا بھی نہیں اور آج سفیان بھائی کے ذریعے مجھے کیا سننے کو ملا؟ یہ اوقات نکلی میری محبت کی؟ آپ نے مجھے رنگ روپ سے تولا۔ میرے لیے تو آپ کا رنگ روپ پہلے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ جب آپ سے محبت کرنے لگی تو محبت نے آپ کی روح سے تعلق قائم کر دیا۔ اب مجھے آپ کے رنگ سے بالکل فرق نہیں پڑتا۔ اللہ نہ کرے آپ کے چہرے پر تیزاب گر جائے اللہ نہ کرے میرے منہ میں خاک آپ کے ساتھ کوئی حادثہ ہو جائے آپ معذور ہو جائیں تب بھی میرے دل میں آپ کی محبت کم نہیں ہو سکتی، میں آپ سے اسی طرح محبت کرتی رہوں گی۔ اس محبت کے باوجود میں کہاں کھڑی ہوں؟ میں کیوں ابھی تک ظاہری رنگ و روپ میں تولی جا رہی ہوں؟ آپ مجھ سے محبت کی صداقت کے دعوے کرتے رہے اور خود موہن پورے والی سمیرا سے تعلق نبھاتے رہے؟ میں تب کہاں تھی؟ مجھے دھوکہ دیتے آپ کا دل ایک دفعہ بھی نہیں کانپا؟ ایک مرتبہ بھی آپ نے نہیں سوچا کہ مجھ پر کیا گزرے گی؟ میری بے قدری کی سوکی میری محبت کی بے قدری کیسے کر لی؟ ہر نماز کے بعد میں آپ کے لیے پہلے اور اپنے لیے بعد میں دعا کرتی تھی۔ آپ مجھے اپنی قسمت مانتے تھے۔۔۔ کوئی قسمت کو بھی یوں ذلیل

کرتا ہے؟ کوئی دعاؤں کو یوں ٹھکراتا ہے؟ آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ میرے ساتھ آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ مجھے آپ جیسے شخص کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا۔۔۔ کبھی نہیں رکھنا'!' وہ چیختے ہوئے بول رہی تھی۔ مسلسل رو رہی تھی۔

وہ چاہتی تھی آفتاب اسے کہے "جاناں یہ تو بس ڈراؤنا خواب ہے۔ میرے ہاتھ پر ہاتھ دھرو۔ دیکھو میں ادھر ہی ہوں اور ہماری دنیا بھی یہیں ہے۔ تم نے جو سنا جھوٹ ہے۔ سچ تو بس محبت ہے جو میں تم سے کرتا ہوں"۔

آفتاب نے گلے کو ہلکا سا کھنکارا۔۔۔ پاکیزہ کی سماعتیں بے چین ہوئیں۔ خوش گمانی آنسوؤں میں جھلملا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے میں بھی ایسی لڑکی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا جو لفظوں پر آنسوؤں سے زیادہ یقین کرے۔ جو میرے دوست کے ساتھ مل کر مجھے دھوکہ دے۔"

یہ آفتاب کہہ رہا تھا۔۔۔ پاکیزہ کا آفتاب!۔۔۔

پاکیزہ کی روشنی اسے اندھیرے میں دھکیل رہی تھی۔ وہ فون رکھ چکا تھا۔ پاکیزہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے درشت حقیقت کا سامنا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ یہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ چھوڑ گئے ہم نے اُف تک نہ کی
بہت مضبوط ہیں یہ اعصاب اپنے
موسم ہجر میں سب کچھ ہے بنجر
آنگن نہیں سبز و شاداب اپنے

پاکیزہ کو سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میں نے جس شخص کو اپنی ساری زندگی سونپی تھی۔ وہ مجھ سے دامن چھڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک دفعہ بھی صفائی نہیں دی، اس نے ایک بار بھی منانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کوئی ایک حرف تسلی کا تو کہتا وہ اپنی کوئی لولی لنگڑی توجیہہ پیش کرتا۔ میں اس کو خود اپنے لیے مضبوط بنا لیتی۔۔۔ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ کیا میں دامن جھاڑ لوں؟ کیا میں بھی دامن جھاڑ لوں؟

میرے سینے میں دل کی جگہ جو اس کا مسکن تعمیر ہوا ہے وہ تو ڈھے جائے گا۔ دھڑکنیں دھڑکنے کا سبب بھول جائیں گی۔ میں اس کے بغیر کیسے زندہ رہوں گی؟ لوگ میرا نام اس کے ساتھ لیتے ہیں؟ کتنے لوگ ہیں جو جانتے ہیں میں اس سے محبت کرتی ہوں ۔۔۔ میں لوگوں کو کیا چہرہ دکھاؤں گی؟ وہ تو مجھے بیوی کہتا ہے۔۔۔ کیا بیویاں برداشت نہیں کرتی؟ کیا شوہر برے نہیں ہوتے؟ عورتیں تو نجانے کیسے کیسے ستم برداشت کرتی ہیں۔۔۔ عورتیں سوتن کا دکھ جھیل لیتی ہیں۔۔۔ میں کیسی لڑکی ہوں؟ میں کیسی بیوی ہوں؟ میری وفا کی بس اتنی سی اوقات تھی؟ کہاں آفتاب نے ایک غلطی کیا اور میں نے دامن جھاڑ لیا؟ میری محبت میں کیا اتنا دم خم

نہیں کہ ایک شخص کو محبت سے بدل سکے وہ انسان ہی ہے ناں؟لوہے سے بنا ہوا تو نہیں۔۔۔ تبدیل تو لوہے کی شکل بھی کی جا سکتی ہے پھر میں رب کی رحمت سے کیوں مایوس ہوں؟ میری وفا، میری محبت، میری نمازیں اس شخص کو بدل دیں گی لیکن میں تو اپنی !نمازوں کی تو میں قسم کھا چکی ہوں اور وہ قسم توڑ بھی چکی ہوں۔۔۔

اللہ بہت مہربان ہے وہ مجھے معاف کر دے گا۔۔۔ وہ کوئی نا کوئی راستہ کھول دے گا۔۔۔ وہ مجھے رسوا نہیں کرے گا۔ اگر وہ میرے نصیب میں نہیں تھا تو سات سال میرے ساتھ نہ رہتا۔ سات سال ہو گئے کہ وہ میری ہر عید کی مہندی ہے۔۔۔ ہر شب برات کی دعا ہے۔۔۔ میرا رمضان کے آخر میں ملنے والا ثواب ہے۔۔۔ مجھے کیسے اس عطا سے الگ کیا جا سکتا ہے۔۔۔ مجھے اللہ یوں نہیں چھوڑے گا۔۔۔ میں گناہگار ہوں مگر اسکی نام لیوا ہوں۔ معجزہ تو وہ ان کے ساتھ بھی دکھا سکتا ہے جو صدق دل سے صرف ایک دفعہ اسے یاد کرتے ہیں۔۔ کیا میری یہ ٹوٹی پھوٹی عبادتیں میرے اللہ کو راضی نہیں کر لیں گی؟ کیا میرا اللہ اس دنیا کی سب چیزوں میں سے ایک چیز مجھے دے نہیں دے گا؟

وہ بہت پر امید ہو کر سوچ رہی تھی۔

ہم گناہوں پر گناہ کرتے ہیں۔ توبہ نہیں کرتے۔ سچی توبہ کرنا بڑے نصیب کی بات ہے مگر ہم خود کو بد نصیب ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ ہمیشہ وہ مانگتے ہیں جو ہمیں مل ہی نہیں سکتا۔ ایک شے ہی تو ہوتی ہے جو خوار کرتی ہے۔۔۔ ہم اس ایک شے کو اس ایک شخص کو اللہ کے لیے نہیں چھوڑتے لیکن اللہ سے امید کرتے ہیں کہ وہ وہی ایک شخص ہمیں دے دے جس کے لیے ہم اللہ کی بھی نہیں سنتے۔

تف ہے!

ہم انسانوں کی ذلیل خواہشوں پر تف ہے !

ہم انسانوں کی غلط انسانوں سے محبت پر!

تف ہے! ہمارے ہٹ دھرمی پر۔۔۔ تف ہے!

کسی انسان کے لیے اللہ سے لو لگانے پر۔۔۔ تف ہے !

انسانیت کے درجے سے گرنے پر۔۔۔ تف ہے!

تف ہے! آج کے دور میں محبت کرنے پر۔۔۔!

تف ہے!

انسان کی اوقات ہی کیا ہے۔۔۔ اسے اپنی محبت پر قابو پانا چاہیے۔۔۔ محبت کو اتنا منہ زور نہیں ہونے دینا چاہیے کہ وہ منہ کے بل کانٹوں کے راستے پر آپ کو گھسیٹتی جائے اور اس وقت لہولہان چہرے لیے ہم جان کنی کے عالم میں چلا رہے ہوں۔۔

محبت نہیں۔۔۔ محبت اب اور نہیں۔۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تیری گلی میں سارا دن

دکھ کے کنکر چنتا ہوں

اپنا صبر ہے اپنا روگ

دریا ہوں اور پیاسا ہوں

"اسلام علیکم۔۔۔ آفتاب" وہ آفتاب کو فون کر رہی تھی حالانکہ آفتاب کو اسے فون کرنا چاہیے تھا۔

"ہاں بولو کیا بات ہے؟" اس نے سلام کا جواب نہیں دیا تھا حالانکہ اسے دینا چاہیے تھا۔

"آپ ناراض ہیں مجھ سے؟" وہ ڈرے سہمے لہجے میں پوچھ رہی تھی حالانکہ اسے اس وقت سوالی نہیں ہونا چاہیے تھا۔

"تم ہو کیا چیز؟ تم نے فون کیوں کیا مجھے؟ ایک محبت تم سے سنبھالی نہیں گئی اور میرے سر پر چڑھتی ہو؟" وہ چلا رہا تھا۔

"آفتاب پلیز۔۔۔ میری بات کو سنیں مجھے سفیان نے کہا تھا۔" وہ سسک رہی تھی۔"

"کوئی کچھ بھی کہے گا تو تم یقین کر لو گی؟ مجھے ہزاروں لوگ کہتے ہیں پاکیزہ کے ایک وقت میں دس لڑکوں کے ساتھ رابطے ہیں تو کیا میں مان لوں؟" وہ نشتر چلا رہا تھا بھالے اٹھا کر کردار کی دھجیاں اڑانے پر اتر آیا تھا۔

"کون کہہ رہا ہے؟ میرے بارے میں؟ کون کہہ سکتا ہے؟ آپ تو مجھے جانتے ہیں ناں؟ آپ تو مجھ پر یقین کرتے ہیں ناں؟" اتنا شدید جملہ وہ سہہ نہیں پائی تھی۔ بلبلا کر رہ گئی تھی۔

"میں یقین کرتا تھا۔۔۔ اب نہیں کروں گا! تم نے بھی تو یقین نہیں کیا۔۔۔ کیا خبر کہنے والے تمہارے بارے میں سچ ہی کہتے ہوں۔" وہ بے یقین ہوا۔

بے اعتباری سے بڑی بے وفائی بھی نہیں۔

"ایسا نہیں ہے آفتاب۔۔۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ ٹوٹ رہی تھی۔

"اب یہ مت کہنا کہ تم میرے علاوہ کسی کو دیکھتی بھی نہیں ہو۔" وہ اس کی باتیں تھپڑ بنا کر اسی کے منہ پر مار رہا تھا۔

"یہ سچ ہے آفتاب میں نے آپ کے علاوہ کبھی کسی کو سوچا بھی نہیں۔" سمجھ میں نہیں آ رہا تھا بے اعتباری کو اعتبار میں کیسے بدلے؟

"ہاں بالکل۔۔۔ تب ہی تمہارے فون پر سفیان سے رابطے تھے۔" طنزیہ لہجہ۔۔۔ یہ اس کا آفتاب تو نہیں تھا۔

"میں نے پہلی دفعہ فون پر بات کی ہے سفیان سے۔" وہ روتے ہوئے یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں کیسے مان لوں کہ تم نے پہلی بار بات کی ہے اور صرف سفیان سے کی ہے۔" لہجے کی درشتگی زہر سے زیادہ زہریلی ثابت ہو رہی تھی۔

"آفتاب پلیز میرے ساتھ ایسے نہ کریں۔ مجھے نہ چھوڑیں۔" وہ ڈری تھی۔

لڑکیوں کا نام کسی ایک نام کے ساتھ جڑ جائے اور پھر کسی دوسرے کے ساتھ جڑے تو یہ نام کے مٹنے اور دوبارہ لکھنے جیسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں ہو سکتا! یہ تو ایسے ہے جیسے جیتے جی کو پہلے زندہ مار دو اور پھر مرے ہوئے کو زبردستی زندہ کرو۔

نزع کا عالم کیسا ہو گا؟ وہ تصور کر سکتی تھی۔۔۔ آفتاب فون رکھ چکا تھا۔ وہ اکیلی سسک رہی تھی۔

پاکیزہ نے ڈھیروں پیغامات بھیجے تھے۔ کسی کا جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ صرف رونا تھا جو اس کے اختیار میں تھا اور وہ جی بھر کر رو رہی تھی۔ وہ مٹی بن سکتی تو دھول ہو جاتی۔ آفتاب کے پیروں کو چوم لیتی، اس کے پیروں پر سر رکھتی۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑتی، اسے کسی طرح منا لیتی لیکن انسان کے اختیار میں بھی کبھی کچھ ہوا ہے۔

ساری رات پاکیزہ کی روتے ہوئے گزری۔ اس نے ہزاروں دفعہ معافی مانگی تھی۔ سینکڑوں دفعہ کہا تھا کہ وہ بس اس سے شادی کر لے۔ باقی جو دل چاہے کرے۔ وہ زندگی کو انگاروں پر بھی گزار لے۔ اگر اسے آفتاب کا نام مل جائے لیکن اسے جواب میں صرف یہ سننے کو ملا تھا کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔۔۔

وہ شخص جو اسے محبت کی راہ پر لے کر آیا تھا۔۔۔ وہ شخص جس کی وجہ سے اس نے پھپھو سے پردہ رکھنے کی سعی کی۔۔۔ وہ اس سے لا تعلق ہو گیا تھا۔۔۔ اسے گھر سے نکالنے والا۔۔۔ اس کی لگام ہاتھ میں تھامنے والا۔۔۔ آج اس کی بات بھی سننے کا روادار نہیں تھا! ساری لفاظی استعمال کر کے سارے واسطے دے کر بھی کوئی جواب نہ ملا تو اس نے آخری حربہ اپنایا۔

اس نے موبائل سے روتے ہوئے ویڈیو بنائی جس میں آفتاب کے سامنے کان پکڑے اور ہاتھ جوڑے اس کی سنہری کلائیاں جیسے زنگ آلود ہو گئی تھیں، لبوں پر پپڑی جم چکی تھی۔ بال الجھے ہوئے تھے، آنسو تھے جو مسلسل رواں تھے۔ محبت کے کوچے میں اس سے اس کے نام کے معنی بھی چھین لیے تھے۔ بڑی بے آبرو ہوئی تھی۔ ندامت، خوف، پچھتاوا، اس کی نظروں سے جھلک رہا تھا۔ چمکتی ذہین آنکھیں۔۔۔ خالی ہو گئی تھی! ایک محبت نے حشر برپا کر دیا تھا۔

فجر کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔ وہ سجدے میں پڑی تھی۔ موبائل تھرتھرایا۔۔۔

"میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسئلہ تو یہ ہے میں لاکھ کہوں کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں لیکن میں تم سے نفرت نہیں کر سکتا۔ تمہیں مجھ پر جتنے بھی شکوک ہیں میں سب دور کر دوں گا بس تم یہ چوبیس گھنٹے ہم دونوں کی زندگی سے نکال دو۔"

آفتاب کا مسیج پڑھ کر وہ پھر سجدے میں چلی گئی تھی۔

امید کا دامن تھام کر صحراؤں میں بھٹکتے رہنا بھی برا نہیں لگتا۔ امید ہی ہے جس کی کونپلیں پھول بن کر خوشبو بکھیرتی ہیں۔ مہکِ حُب نے اسے پھر سے دنیا میں بیگانہ کر دیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اپنی دُھن میں رہتا ہوں

میں بھی تیرے جیسا ہوں

سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ وہ اب پاکیزہ کا پہلے سے زیادہ خیال رکھتا تھا اور پاکیزہ ہمیشہ کی طرح اس کی ابرو کی جنبش پر اپنی چال بدلتی تھی۔

لڑکوں کے آپسی تعلقات بہت عجیب ہوتے ہیں۔ جو کوئی یہ ظاہر کرے اس کی ایک ہی لڑکی سے دوستی ہے تو اسے شرافت کے" طعنے ملتے ہیں۔ اس لڑکی کے ساتھ تعلقات خراب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس لڑکی کی مسلسل بدتعریفی کی جاتی ہے۔ اپنے عشق معاشقی کے ناکام اور کامیاب ہزاروں قصے سنا کر دوسروں کو احساس کمتری میں مبتلا کرتے ہیں۔ ایسے میں اگر فرضی جھوٹے قصے نہ سنائے جائیں تو انسان ان کے سامنے چھوٹا پڑ جاتا ہے۔ جو جتنا بڑا کمینہ ہے اس کو اتنی ہی زیادہ عزت سے بھائی بلایا جاتا ہے۔ کسی موہن پورے والی سمیرا کا کوئی وجود نہیں ہے اگر وجود ہے تو صرف تمہارا۔" یہ تسلی کا وہ لالی پاپ تھا جو آفتاب نے چند لمحوں میں پاکیزہ کو تھما دیا۔

ساتھ ہی ساتھ اپنی والدہ سے فون پر سلام دعا بھی کروادی۔ اس سے زیادہ پاکیزہ کو کیا چاہیے تھا۔ یہ اس کی غلطی تھی کہ اس نے سفیان پر اعتبار کیا۔ اسے کسی کے کہنے میں آکر چھپ کر آفتاب کی باتیں سننی ہی نہیں چاہیے تھی۔ وہ آفتاب جو سورج کی مدھم پڑتی کرنوں میں اسے پہاڑی کے دامن میں اپنے سامنے لیے بیٹھا تھا۔

"آفتاب یہ بہت مہنگی جگہ ہے۔" وہ منمنائی۔

"تو کیا ہوا تم سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہے" اس نے سنہری کلائی پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔

"آپ یہ پیسے اپنے کاروبار پر لگا لیتے۔" اس نے مشورہ دیا۔

"کبھی کبھی دل کا بیوپار بھی کرنے دیا کرو۔" وہ مسکرا کر گویا ہوا۔

اس نے اپنے بائیں جانب نظر دوڑائی۔ سارا شہر آنکھوں کے سامنے نظر آ رہا تھا۔ مونال پر آنے کا وہ اکثر سوچتی تھی لیکن اتنی گہری دوستی کسی کے ساتھ نہیں تھی کہ آ سکتی۔ آج کل آفتاب کا کاروبار اچھا چل رہا تھا وہ پاکیزہ کے کہے بغیر اسے یہاں لے آیا تھا۔۔۔ یہ ہی تو ہوتی ہے محبت! آپ کچھ کہتے ہی نہیں اور سامنے والا سمجھ جاتا ہے۔

آرڈر آچکا تھا۔ پاکیزہ نے آفتاب کی پلیٹ میں خود سالن ڈالا اور پھر بوٹیاں توڑنے لگی۔ وہ سب ذمہ داریاں پہلے سے اٹھا چکی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کام کر کے اور آفتاب کو دیکھ کو خوشی ہوتی تھی۔ اس خوشی کا نعم البدل پوری دنیا بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ آفتاب محظوظ ہونے والی حسین مسکراہٹ اپنے وجیہہ چہرے پر لیے اس پری پیکر کو دیکھتا رہا۔ پاکیزہ کے لب پھڑ پھڑائے اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی آفتاب نے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ دھرا تھا۔

"مجھے پتہ ہے تم یہ پوچھنے لگی ہو گی کہ رشتہ کب بھیجو گے۔۔۔ بس بھائی کی شادی ہونے دو پھر پہلا کام یہی کروں گا۔ بار بار کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کرو ہاں یہ سچ ہے میں نے تمہیں بہت انتظار کروایا ہے۔ یہ بھی تو سچ ہے میں تمہیں چھوڑ کر کہیں بھاگ نہیں رہا۔ میں تمہیں چھوڑ کر پگلی کہیں بھاگ ہی نہیں سکتا۔ میں من و عن تسلیم کرتا ہوں کہ جتنا پیار تم مجھ سے کرتی ہو اتنا کوئی بھی نہیں کرتا۔ اس رات بھی تمہاری اس بات نے میرا سیروں خون بڑھا دیا تھا کہ اگر تمہاری کھال کے جوتے بنا کر بھی مجھے پہنا دیئے جائیں تو تم اُف تک نہیں کرو گی۔ یقین جانو میں تمہیں کانٹا چبھنے دینے کی تکلیف سے بھی نہیں گزارنا چاہتا۔ جہاں میرا اتنا انتظار کیا ہے تھوڑا سا اور انتظار کر لو۔"

سنہری چار انگلیاں آفتاب کے محفوظ ہاتھوں کے حصار میں تھیں۔ سورج کی مدھم ہوتی کرنوں نے فلک کے مغربی حصے میں رنگوں کی سرمست برکھا برسا دی تھی۔ پاکیزہ نے ایک نظر آسمان پر ڈالی بلاشبہ آفتاب زیادہ خوبصورت لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ زرد رنگ مِرے حال کی گواہی ہے
کہ عشق سبز نہیں چھوڑتا! اگر ہو جائے
ڈرانے والے تجھے کیا خبر مشیّت کی
جو آج زیر ہے وہ کل کلاں زبَر ہو جائے
علی یہ عشق تو اب کشف ہو چلا، کہ مجھے
تری خبر ترے آنے سے پیشتر ہو جائے!

"پاکیزہ کرکٹ دیکھو کرکٹ" آفتاب کے مسلسل پیغامات آ رہے تھے۔

پاکیزہ نے کل یونیورسٹی میں اپنا تحقیقی کام جمع کروانا تھا اور آفتاب کے چونچلے ختم نہیں ہو رہے تھے۔ وہ جب بھی میچ دیکھتا پاکیزہ سے بھی

اصرار کرتا۔ ساتھ ساتھ دعائیں کرواتا جاتا پاکیزہ کی پیری اور آفتاب کی مرشدی میں اضافہ ہوتا جاتا۔

تحقیقی کام تقریباً مکمل تھا۔ بی ایس کی ڈگری کہنے کو چار سال کی ہوتی ہے مگر تحقیقی کام اسے پانچویں سال تک کھینچ کے لے جاتا ہے۔

باقی کام صبح میں دیکھ لوں گی۔ پاکیزہ نے اپنا سارا پھیلاوا سمیٹا اور بستر پر بیٹھ گئی۔ ٹی وی سکرین پر میچ چل رہا تھا۔

آتنے لوگ ایک گیند کو یہاں سے وہاں دیکھتے جا رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔ پاکیزہ کو میچ دیکھنا کبھی پسند نہیں رہا تھا۔ اسے صحیح طریقے سے سکور دیکھنا بھی نہیں آتا تھا۔ فیصلہ تھرڈ امپائر تک پہنچ جاتا لیکن پاکیزہ کو سمجھ ہی نہیں آتا کہ ہیلمٹ کے اندر کھلاڑی کون ہے۔

بات صرف وہی کہ محبت جادوئی شیشی جیسی ہے اور محبت میں گرفتار ہونے والا انسان خود کو اتنا چھوٹا کر لیتا ہے کہ کسی کو بھی نظر نہیں آتا پھر اپنے آپ کو اس شیشی میں ڈبو لیتا ہے۔ اپنا رنگ تو مانو رہتا ہی نہیں۔ شیشی کا رنگ چڑھ جاتا ہے، محبت کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ انسان وہی نظر آتا ہے جو محبت چاہتی ہے، انسان وہی بن جاتا ہے جو محبت کہتی ہے۔

اب پاکیزہ کو یہ بھی سمجھ آتا تھا کہ کس ایمپائر نے فلاں ٹیم کے حق میں فیصلہ کیوں نہ دیا؟

آفتاب کی پسند اسے اپنے رنگ میں ڈال چکی تھی۔

"دعا کرو یہ آؤٹ ہو جائے" پیغام آیا۔

"ہاں جیسے میں تو پیرنی لگی ہوں۔" پاکیزہ نے ازراہ مذاق کہا۔

نہیں بھئی تم تو جادوگرنی ہو جس نے مجھے قابو کر رکھا ہے۔

"آپ مجھ سے بڑے جادوگر ہیں جو مجھ جیسی تین چار جادوگرنیوں پر بیک وقت سحر طاری کر سکتے ہیں۔

"ایک تم ہی سنبھالی جاؤ تو بہت بڑی بات ہے"۔

"ہاہاہا"

!"ہاہا نہیں۔۔۔ دعا کرو یہ آؤٹ ہو جائے"

"اللہ جی پلیز یہ آؤٹ ہو جائے۔"

"اوہ یس۔۔۔ آؤٹ! دیکھا پیرنی جی"

"آپ کا حُسنِ نظر ہے جو میری دعاؤں کو آسمان تک پہنچا دیتا ہے"۔

"جی نہیں یہ آپ کے لفظوں کا آسمان تک پہنچنا ہی ہے جس کی وجہ سے میں تمہیں نہیں چھوڑتا۔ یہاں میں نے تمہیں چھوڑنا ہے وہاں تم نے بددعائیں کر کے مجھے آسمان پر پہنچا دینا ہے۔"

"اللہ نہ کرے آپ بھی مذاق میں کیا کیا کہہ جاتے ہیں۔"

" دعا کرو بنگلہ دیش میچ جیت جائے۔"

"آفتاب بنگلہ دیش کا پاکستان کے ساتھ میچ ہے۔ میں بنگلہ دیش کے لیے کیسے دعا کروں؟"

" پاگل میں نے شرط لگائی ہوئی ہے۔"

" آپ شرط پاکستان کے حق میں بھی تو لگا سکتے تھے۔"

" تب تم کہتی شرط حرام ہے۔"

"شرط تو واقعی حرام ہے۔"

"دیکھو یہ صرف میچ ہے بنگلہ دیش اور پاکستان کی جنگ نہیں ہے۔ بنگلہ دیش کی ٹیم کے کھلاڑی اچھے ہیں انہوں نے محنت زیادہ کی ہے اور ہمارے ہاں کی کرکٹ تو تم جانتی ہو وہ کرکٹ کم سیاست زیادہ ہے۔ محنت میں عظمت ہے تو جیتنا تو بنگلہ دیش کو ہی چاہیے۔"

آفتاب کی بات نے پاکیزہ کے دماغ پر کوئی دھاک نہیں بٹھائی تھی لیکن دل ماننے پر مجبور تھا۔ مانتی نہ تو اور کیا کرتی۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔"

" دعا کرو بنگلہ دیش کے لیے۔"

" کر رہی ہوں۔"

پھر بنگلہ دیش ہار گیا تھا پاکستان جیت گیا۔ پاکیزہ کے لیے یہ معمولی بات تھی۔ کوئی جنگ تو تھی نہیں بس ایک کرکٹ میچ ہی تھا۔

آفتاب کا میسج آیا۔

" بہت بڑی منحوس ہو تم! اب تو تمہاری دعائیں بھی پوری نہیں ہوتیں۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ابھی کیا کہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ابھی کیا سنیں۔۔۔۔۔۔۔۔؟

کہ سرِ فصیلِ سکوتِ جاں

کفِ روز و شب پہ شرر نما

وہ جو حرف حرف چراغ تھا

اسے کس ہوا نے بجھا دیا؟

کبھی لب ہلیں گے تو پوچھنا!

سرِ شہرِ عہدِ وصالِ دل

وہ جو نکہتوں کا ہجوم تھا

اسے دستِ موجِ فراق نے

تہہِ خاک کب سے ملا دیا؟

! کبھی گل کھلیں گے تو پوچھنا

ابھی کیا کہیں۔۔۔ ابھی کیا سنیں؟

یونہی خواہشوں کے فشار میں

کبھی بے سبب۔۔۔ کبھی بے خلل

کہاں، کون کس سے بچھڑ گیا؟

کسے، کس نے کیسے بھلا دیا؟

کبھی پھر ملیں گے تو پوچھنا۔۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

"کیا سوچا ہے پھر تم نے پاکیزہ" پھوپھو اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ پچھلے آٹھ سالوں میں اب زندگی ان کے اندر نظر آنے لگ گئی تھی۔ وہ خوش تھیں، اپنا خیال رکھنے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔ پاکیزہ نے ماخذ جاننے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود رہی۔ اب تو اس کا بھی محور بدل چکا تھا، ساری کوششوں کا منظر نامہ بدل چکا تھا۔

"کس بارے میں پھوپھو؟" وہ جانتے ہوئے بھی انجان بنی۔

"تم ایم ایس کے سیکنڈ سمسٹر میں آ چکی ہو وہ لڑکا تو پتا نہیں کیا کر رہا ہے۔ بی ایس سی تو اس سے ہوئی نہیں تھی۔" تسکین اتنا سمجھ گئی تھی کہ پاکیزہ اس معاملے میں بالکل بھی سمجھنے سننے والی نہیں ہے۔

پھوپھو بی اے تو اس نے کر لیا تھا۔" پاکیزہ نے کمزور سی حمایت کی۔

رو پیٹ کر بی اے کیا ہے۔ تم اپنے گریڈ دیکھو، اپنی ڈگری دیکھو۔

"پھوپھو آپ میری محبت بھی تو دیکھیں!"

"محبت کا اچار ڈالو گی؟"

"ویسے محبت کا اچار ڈالا جائے تو وہ بھی لاجواب ہو۔" اس نے بات ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی۔

" پاکیزہ یہی عمر ہوتی ہے بیاہے جانے کی۔ یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو دوبارہ کبھی نہیں آئے گا۔"

" پھوپھو اسے تھوڑا سا سیٹل تو ہونے دیں۔"

" مرغی خانہ کتنے عرصے سے چلا رہا ہے۔ ابھی تک اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا۔

"برائلر مرغی کے خلاف کالم دیکھیں آپ۔ اس ملک میں کیا کر سکتا ہے؟" یہ پاکستان کی دیوانی نہیں کہہ سکتی تھی۔ یہ کسی اور کے جملے اس کی زبان سے نکل رہے تھے۔

" مجھے تو لگتا ہے اس ملک میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔بس اس لڑکے کا کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"مجھے کیوں لگتا ہے آپ مجھے خوش نہیں دیکھنا چاہتی؟"پاکیزہ نے انتہائی چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

تسکین صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔سارے خرچے پاکیزہ کے پورے ہوتے تھے،خواہشیں پوری ہوتی تھیں۔ایک نہ ختم ہونے والا ماہانہ خرچ تھا جو پاکیزہ کے پاس موجود رہتا یہ اور بات کہ وہ خرچہ اکثر کسی کے کاروبار کو ڈھنگ سے چلانے کی مد میں نکل جاتا۔تسکین نے بھائی کے حصے پر کبھی حق نہ جمایا،ایک آنہ خود پر خرچ نہ کیا تا کہ پاکیزہ خوش رہ سکے۔پاکیزہ کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ سکے۔پاکیزہ نے بات کر دی تھی۔وہی بات جس سے بچنے کے لیے تسکین نے عمر گزار دی،آج تسکین کے منہ پر تھپڑ بن کر لگی تھی۔وہ کچھ نہ کہہ سکی۔خاموشی سے چلی گئی۔

کچھ باتیں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نصیب میں لکھی ہیں۔ہم جنتے ہیں کہ ہمیں سننے کو ضرور ملیں گی۔ایک نہ ایک دن ان باتوں سے واسطہ ضرور پڑنا ہوتا ہے۔ہم کچھوے کی طرح اپنے خول میں سر دیئے رہتے ہیں پھر اچانک سے کلہاڑے کی طرح کوئی چیز ہمارے خول کو چیر دیتی ہے۔ہم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس چیز کو دیکھتے ہیں۔وہ چیز نہیں ہوتی،وہی بات ہوتی ہے جس سے بچنے کے لیے ہم ساری عمر خول میں گزار دیتے ہیں۔بات ہنستی رہتی ہے اور ہم رونے کے قابل بھی نہیں رہتے !

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مکمل یہ مجھے ہونے نہیں دیتی

کہ بے چینی مجھے سونے نہیں دیتی

"آفتاب پھوپھو شادی کے لیے بہت زور ڈال رہی ہیں۔"بہت ڈرتے ہوئے اس نے تذکرہ کیا تھا۔

آفتاب شادی کے ذکر سے چڑ جاتا تھا۔"میں کہیں بھاگ تو نہیں رہا۔۔۔تم سے ہی شادی کروں گا۔مجھے اتنی بار نہ کہو کہ میرا دل ہی تم سے اچاٹ ہو جائے۔"

"تو کر لو شادی"بڑا اسپاٹ سا جواب آیا۔

"یعنی آپ گھر والوں کو بھیج رہے ہیں۔"

"ہاں میں آج بات کرتا ہوں۔"آفتاب نے بہت نرمی سے کہا تھا۔سپاٹ سا لہجہ نجانے کہاں اڑن چھو ہو گیا تھا۔پاکیزہ ہواؤں سے ہلکی ہو گئی۔

آج کا سارا دن وہ ساتھ گزارنے والے تھے۔شروعات اتنی عمدہ ہو گی پاکیزہ نے سوچا نہ تھا۔اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

" ویسے ہماری روتے ہوئے کوئی سیلفی نہیں بنی۔"آفتاب نے کہا اور اس لمحے کو قید کر لیا۔

پاکیزہ کو ہنسی آ گئی۔

"آپ بھی ناں۔۔۔" ہنستے ہوئی پاکیزہ کی آفتاب نے ایک تصویر اور بنالی۔

سارادن مہکتے چہکتے ہوئے گزرا۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ شام کے پنچھی نے جب اپنے پر پھیلانا شروع کیے اور روشنی سمٹنے لگی تو وہ گھر واپس آئی۔

"کہاں سے آرہی ہو؟" بڑے عرصے بعد تفتیش ہوئی تھی۔

"یونیورسٹی سے۔۔۔ جھوٹ بولنا صرف پہلی مرتبہ مشکل ہوتا ہے، اس کے بعد عادت پڑ جاتی ہے۔

"مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔" انداز جارحانہ تھا۔

"اگر جھوٹ بھی بول رہی ہوں تو اپنا نقصان کروں گی۔ آپ کا کچھ نہیں جائے گا۔" وہ کب اتنی ہٹ دھرم ہوئی تھی اسے خود بھی معلوم نہیں ہوا۔

" اسے کہو تم سے شادی کرلے۔"

" مجھ سے ہی کرے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔

"جس نے شادی کرنی ہو وہ اتنا ٹالتا نہیں ہے۔

"ابھی پچھلے ماہ اس کے بھائی کی شادی ہوئی ہے۔ اسے سانس تو لینے دیں۔ ابھی اگر اس کے گھر والے آئے بھی تو صرف رشتہ طے کریں گے شادی سال دو سال بعد ہوگی۔" وہ کہہ رہی تھی۔

دل میں سرگوشی جاری تھی۔ تیسرے سال ہمارے گھر بیٹی ہوگی جس کا نام ہم دعا رکھیں گے۔ دعائے آفتاب۔۔۔ سورج کی دعا۔۔۔ طاقت کی دعا۔۔۔۔ روشنی کی دعا۔۔۔۔ یہ بات اس نے اور آفتاب نے اتنی دفعہ آپس میں کی تھی کہ وہ اس بات کو سوچے بغیر نہ رہ سکی۔

"اگر بیٹا ہوا تو؟" پاکیزہ نے بیٹی کے لیے اس کی دیوانگی دیکھ کر پوچھا تھا۔

"تو میں اس کا نام حیدر رکھوں گا۔" اس نے پاکیزہ کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں رکھ کر کہا تھا اور پاکیزہ کی نظریں جھک گئی تھی۔

وہ گھر کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد بھی گھر سے باہر ہی تھی۔ مسکرا کر سر جھٹکا تو دیکھا تسکین تو جانے کب کی جاچکی تھی۔

وہ آج گھر بات کرے گا۔۔۔ جو خواب میں اتنے سالوں سے دیکھ رہی ہوں اس کی تعبیر جینے کے دن آگئے ہیں!

وہ نام جس کی چاہ میں عمر گزاری ہے وہ میرے نام کو ملنے والا ہے!

وہ مہندی میرے ہاتھ پر رنگ چھوڑے گی جس پر ایک نام لکھا ہوگا میرے آفتاب کا نام !

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سہمے سہمے سے بیٹھے ہیں راگی اور فنکار

بھور بھئے اب ان گلیوں میں کون سنائے جوگ

جب تک ہم مصروف رہے یہ دنیا تھی سنسان

دن ڈھلتے ہی دھیان میں آئے کیسے کیسے لوگ

ناصر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اداس

وہی پرانی باتیں اس کی وہی پرانا روگ

"امی نہیں مان رہی۔" ساری امیدیں جیسے کرچی کرچی ہو گئیں تھیں۔

"آفتاب کیوں کیا ہوا؟" وہ سراسیمہ سی ہو گئی۔

"دو بڑے بھائی تو تمہیں پتا ہے پہلے سے ہی الگ رہ رہے ہیں۔ تیسرے بھائی کی شادی ہوئے ایک مہینہ ہی ہوا ہے لیکن علیحدہ گھر کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ امی کا رو رو کر برا حال ہے۔ کہتی ہیں کہ بیٹے اس لیے بڑے کیے کے پال پوس کر لوگوں کے حوالے کر دوں۔ رات بھی فشارِ خون اتنا بڑھ گیا کہ ہسپتال لے جانا پڑا۔" آفتاب کی آواز سے تھکاوٹ اور پریشانی نمایاں تھی۔

"میں سمجھتی ہوں آفتاب۔ آپ بس امی کا خیال رکھیں۔" وہ بمشکل اسے سمیٹ سکی حالانکہ اس وقت وہ خود بکھر رہی تھی۔ وہ بالکل نہیں سمجھی تھی لیکن اسے ایسے ہی کہنا تھا۔

"شکریہ پاکیزہ تم نے سمجھا۔ میں بہت پریشان تھا۔ ظاہر ہے بار بار تمہاری امیدوں کو بڑھاوا دیتا ہوں اور پھر کوئی نا کوئی رکاوٹ آ جاتی ہے۔" آفتاب واقعی شرمندہ محسوس ہوا۔

"کوئی بات نہیں آفتاب۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ وہ اس وقت ڈسی ہوئی ہیں۔ انہیں شاید سمجھ نہیں آ رہی۔ اگر تیسرے بندے کی نظر سے دیکھا جائے تو تمہارے گھر کو اس وقت واقعی ایک لڑکی کی ایک عورت کی ضرورت ہے۔"

"ان عورتوں نے ہی تو امی کو پریشان کیا ہے ورنہ سچ یہی ہے کہ ایک ایسی لڑکی چاہیے جو امی کی خدمت کر سکے، گھر کو سنبھال سکے۔"

" آپ اپنی امی کو یقین دلوائیں کہ میں یہ سب کر لوں گی۔ وہ جیسے چاہیں گی ویسے رہ لوں گی۔"

"ابھی وہ اتنی ناامید ہیں کہ اگر میں رشتے کی بات کرتا ہوں تو وہ مزید تحفظات کا شکار ہو جائیں گی۔ انہوں نے سوچ لینا ہے کہ پسند کی شادی کے بعد تو میں بالکل ہی ان کے ہاتھ سے نکل جاؤں گا۔"

"میں آپ کو ہاتھ سے نہیں نکلنے دوں گی۔ مجھے اتنی سمجھ تو ہے کہ جو لڑکا اپنے والدین کی عزت کرتا ہے وہی اپنی بیوی سے محبت کر سکتا ہے۔ جو اپنے ماں باپ کا نہ ہو سکے وہ بیوی کا کیا خاک ہو گا؟"

"تمہارا یہ فلسفہ میں امی کے گوش گزار تب کروں جب امی سننا چاہیں۔۔۔ان کے خیال میں تو میں ابھی بہت چھوٹا ہوں۔شادی کے قابل ہی نہیں ہوں۔کسی اور کا خرچہ اٹھا ہی نہیں سکتا۔"

"میں اپنا سارا خرچہ خود اٹھا لوں گی۔مجھے نوکری کرنی پڑی تو وہ بھی کر لوں گی۔مجھے صرف آپ کا نام چاہیے۔"

"تم سمجھ نہیں رہیں وہ مجھے لا پرواہ سمجھتی ہیں۔"

"میں گھر کی سب چیزوں کا بھی خود دھیان کر لوں گی۔آپ کی لا پرواہی کچھ معنی نہیں رکھے گی۔آپ امی کو ایک دفعہ مجھ سے ملوائیں تو سہی۔میں اپنے اخلاق سے ان کا دل جیت لوں گی۔وہ جو چاہیں گی وہ ہو جائے گا بس وہ آپ کی شادی مجھ سے کروا دیں۔"

"کیا پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو؟شادی امی نے تو نہیں کرنی میں نے کرنی ہے۔میں بہت پہلے سوچ چکا ہوں کہ تم سے شادی کروں گا۔تم ایسے بول کر مجھے شرمندہ نہ کرو۔"آفتاب نے اس کا مان بڑھایا تھا۔

وہ مکمل جھک چکی تھی بڑی مشکل سے اٹھ کھڑی ہوئی۔یہ سچ تھا ایک آفتاب کا نام پانے کے لیے،اس کے نام کی مہندی ہاتھوں میں سجانے کے لیے،اس کے گھر عزت سے جانے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔۔۔سب کچھ کر سکتی تھی!

جھوٹی امید ٹرک کی بتی جیسی ہے۔۔جلتی بجھتی رہتی ہے اور بندہ اشعار پڑھنے کے لالچ میں گاڑی پیچھے لگا کر رکھتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ مضطرب تھا عشق میں کہ نقصان کچھ نہ ہو
ہم مطمئن کہ جاں کا خسارہ ہے اور بس!!!

"تو پھر نہیں بھیجا اس نے رشتہ؟"تسکین پھوپھو کے لہجے میں طنز تھا۔پاکیزہ کو محسوس ہوا۔

"بھیج دے گا جب بھیجنا ہو گا۔"فرق تو پاکیزہ کو پڑنا تھا اور بہت پڑنا تھا اور بس اسی کو پڑنا تھا لیکن بظاہر لاتعلقی سے کہتے ہوئے اس نے بالوں کو لپیٹ کر کیچر میں قید کیا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ وہ مجھے رشتہ بھیجنے والا نہیں لگتا۔"

"نہیں پھوپھو آپ نے ہی کہا تھا کہ رابطہ رکھو۔آپ نے ہی کہا تھا کہ وہ کہہ رہا تھا کہ رشتہ بھیج دے گا۔میں آپ کی ہی وجہ سے پر امید رہی ہوں۔"

"تو اب میں ہی کہہ رہی ہوں کہ وہ رشتہ نہیں بھیجے گا۔اب بھی یقین کر لو۔"لہجے میں سفاکی کی انتہا تھی۔پاکیزہ کے حلق میں بھی خراشیں پڑ گئی۔

"کیا اتنا آسان ہے کٹھ پتلی بن کر جینا؟جب کوئی کہے یقین کر لو تو آنکھیں بند کرنا اور یقین کا سفر طے کرتے جانا۔۔۔پھر کوئی کہے کہ چھوڑ دو تو روح کے سارے بندھن توڑ کر،عادت،محبت،ضرورت سب کو چھوڑ کر واپس پیچھے مڑ جاؤ۔کیا واقعی اتنا آسان ہوتا ہے؟

ہاں اندھوں کی طرح آگے چلنا آسان ہے لیکن واپسی ناممکن ہے۔اس ناممکن سے ممکن کو نکالا جائے تو روح پھر بھی آدھی وہی اس نہ میں رہ جاتی ہے۔"

"پھوپھو بھیج دے گا رشتہ۔نہ بھیجنا ہو تو مجھے امید ہی کیوں دے؟" وہ تسلی چاہتی تھی۔

"وقت گزاری اسی کو کہتے ہیں پاکیزہ۔" انہوں نے تسلی نہیں دی تھی، تلخی دی تھی۔

"مان لیں کہ حسد کرنا اسی کو کہتے ہیں۔" اس نے تلخی لوٹائی۔

"تم مجھے لاکھ برا کہو۔تم میری چھوٹی بہن بھی ہو، بیٹی بھی ہو۔مجھے تمہارے لیے جو ٹھیک لگے گا کہوں گی۔لڑکیوں کی رشتے کی عمر نکل جائے تو گلے پڑے والی مصیبتیں مل جاتی ہیں، خوشیاں لانے والے رشتے نہیں ملتے! میں مزید انتظار نہیں کروں گی۔جو اچھا رشتہ ملا شادی کر دوں گی۔"

"انتظار آپ نے نہیں کرنا۔انتظار میں نے کرنا ہے میں کرلوں گی۔" وہ واپس نہیں آسکتی تھی۔

" ساری عمر انتظار کرو گی؟

" ہاں کرلوں گی انتظار۔انتظار رنگ لاتا ہے!"

" رنگ مانگ میں بکھرے گا یا خون بن کر آنکھ سے بہے گا۔۔۔یہ وقت بتاتا ہے۔"

"بس پھر آپ مجبور نہ کریں۔وقت پر چھوڑ دیں۔وقت بتائے گا تو سمجھ لوں گی۔"

" وقت کی مار خدا یاد کروا دیتی ہے۔"

" کسی بہانے ہی سہی وہ یاد تو آئے گا ناں۔"

اس نے بات ختم کی تھی۔

یہ باتیں کاتب تقدیر نے بہت آرام سے لکھ لی تھی۔اس کا کام لکھنا ہے۔وہ لہجے بھی نہیں بھولتا اور نیتیں بھی نہیں بھولتا۔

اب چھوڑ دوں؟ اب کیسے چھوڑ دوں؟ بے خوابی میں بھی اس کا نام لبوں سے نکلتا ہے۔نیند میں اس کے خواب ستاتے ہیں۔ملن کا وقت آیا ہے تو چھوڑ دوں؟ چھوڑنا تھا تو پہلے چھوڑتی ناں۔۔۔ایک انسان کو اپنا بنانا اتنا بڑا کون سا محاذ ہے کہ لوگ ہار مان لیتے ہیں۔۔ بزدل لوگ۔۔۔!

میں تو ہار نہیں مانوں گی۔

اس نے سوچوں میں بے لاگ تبصرہ کیا اور پشت بستر پر ٹکا دی۔آنکھیں بند تھیں۔

محبتیں تب کیوں آتی ہیں جب ہمیں ان کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ایک محبت کتنی محبتوں کو اضافی ثابت کر دیتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مجھ کو بھی انہی میں سے کوئی ایک سمجھ لے

کچھ مسئلے ہیں ناں جو حل نہیں ہوتے آ

"آفتاب میرا رشتہ آیا ہے۔" وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ سلام دعا کے بعد تمہید باندھے بنا ہی گویا ہوئی۔

" تو؟" وہ یوں بولا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

"تو کا مطلب؟ پھوپھو میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔" پاکیزہ نے سمجھانے کی کوشش کی۔

" تو کرلو شادی۔"

"وہ کسی دوسرے سے میری شادی کرنے پر زور دے رہی ہیں۔"

"ہاں! تو کرلو شادی"۔ وہ مشورہ دے رہا تھا یا سر پھاڑ رہا تھا پاکیزہ سمجھ نہ سکی۔

"آفتاب آپ ایسے کیسے کہہ سکتے ہیں؟" وہ سکتے کے عالم میں بولی۔ ایک دوسرے کے منہ میں نوالے بنا بنا کر ڈالنا، سنہری ہاتھوں سے صبیح ماتھے کا پسینہ پونچھنا نجانے کون کون سے منظر تھے جو یاد میں آ گئے اور نگاہ کو دھندلا کر گئے۔

"دیکھو پاکیزہ جہاں بیری ہو وہاں پتھر آتے ہیں۔ رشتے آنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ رشتے آنے دو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ تم نے تو میرا انتظار ہی کرنا ہے۔ اگر بالفرض انتظار نہیں کر سکتی تو پھر شادی کر لو۔"

"آفتاب میں کیسے کرلوں شادی۔ میں آپ سے پیار کرتی ہوں۔" وہ کیسے انہونے فلسفے سمجھا رہا تھا۔

"مجھ سے خاک پیار کرتی ہو۔ بکواس کرتی ہو، انتظار تو کر نہیں سکتی۔ ہر وقت کی بک بک لگا رکھی ہے شادی۔۔ شادی۔۔۔ شادی۔۔۔ بھئی میں ابھی نہیں کر سکتا۔ شادی تمہاری کون سا عمر نکلی جا رہی ہے۔ شادی کی آگ لگی ہوئی ہے۔" وہ چیخ پڑا تھا۔

"آفتاب مجھے آگ نہیں لگی۔۔۔ میری پھوپھو کو لگی ہے۔"

"پھوپھو کو آگ لگی ہے تو لگی رہنے دو۔ لوگوں کے منہ بھی کبھی بند ہوئے ہیں۔ پہلے کہتے ہیں بچہ کس کلاس میں ہے؟ کس سکول میں ہے؟ بڑا ہوتا ہے تو اس کی نوکری کے متعلق سوال کر کر کے مت مار دیتے ہیں۔ کماؤ ہو جائے تو شادی کے لیے جان کو آ جاتے ہیں۔ شادی کر کے توند باہر نکال لے تو پھر بچوں کی فکر شروع ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو تو تم چھوڑ ہی دو۔ لوگوں کی وجہ سے شادی کا طوق گلے میں نہ ڈالو۔ تیس سال تک موجیں اڑاؤ، اس کے بعد شادی کریں گے۔ شادی بہت بڑی ذمہ داری کا نام ہے۔"

" ساری ذمہ داری میں خود پوری کروں گی۔ آفتاب آپ کے سر کچھ بھی نہیں ڈالوں گی۔"

" دیکھو تم شادی کرنا چاہتی ہو تو کرلو۔ تمہیں مجھ سے اچھے بہت مل جائیں گے۔"

"مجھے آپ کے علاوہ اور کوئی چاہیے ہی نہیں۔ اس کے اچھے یا برے ہونے سے کیا لینا دینا؟"

"دیکھو میں تمہیں ترکیب بتاتا ہوں کسی بوڑھے امیر سے شادی کر لو۔ بوڑھا مر جائے گا اس کی دولت لے کر تم میرے پاس آ جانا۔"

"کیسی فضول باتیں کر رہے ہیں آپ آفتاب؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں تم شادی کر لو۔ ہم تو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں ناں۔ ہم ملتے رہیں گے۔ تمہارے بغیر پتہ ہے میں رہ ہی نہیں سکتا۔"

"آفتاب آپ برداشت کر لیں گے کہ کوئی اور مجھے دیکھے، مجھے ایسے ہاتھ لگائے جیسے آپ لگاتے ہیں۔" وہ تلخ ہوئی تھی۔

"ہاں تو اس میں بڑی بات کیا ہے۔ تم نہا دھو کر میرے پاس آنا اس کی بد بو لے کر نہ آنا۔" وہ ہنس رہا تھا۔

"آفتاب آپ یہ برداشت کر لیں گے کہ آپ کی بہن شادی کرے اور اس کے بعد اپنے عاشق سے ملتی رہے نہا دھو کر؟" وہ بہت تلخی سے گویا ہوئی۔

گہری خاموشی!

نجانے کیوں پاکیزہ کے لیے وہ عاشق رہ گیا تھا۔

پاکیزہ بھول گئی تھی وہ اس کے نکاح میں ہے!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

پیار میں جسم کو یکسر نہ مٹا! جانے دے

قربتِ لمس کو گالی نہ بنا! جانے دے

تُو جو ہر روز نئے حسن پہ مر جاتا ہے

تُو بتائے گا مجھے عشق ہے کیا؟؟ جانے دے!!

اس کے پاؤں پر آبلے پڑ چکے تھے اور آبلے اب رس رہے تھے۔ شدید گرمی اور خراب سڑک۔۔۔!

اس سے بڑھ کر کوئی بد نصیبی ہو سکتی ہے؟ ہاں اس سے بڑی بد نصیب تو وہ خود تھی۔

گرم لو کے تھپیڑے اور رستے ہوئے زخم اتنی تکلیف نہیں دیتے جتنا دل کا ٹوٹ جانا۔ وجود کو لاکھ سنبھالو۔۔۔ ان کرچیوں کے ساتھ بکھرتا ہی چلا جاتا ہے۔

آس پاس کی سبھی دکانوں سے جھانکتے دکاندار اس طرح کی دیوانگی دیکھنے کے عادی تھے۔ یہ منت پوری ہونی تھی یا دھاگے کی صورت پیر پر باندھی ہی رہ جانی تھی۔ اس سے بالاتر ایسے سستے تماشے وہ آئے روز دیکھتے تھے۔ تماشہ بنی وہ تھک چکی تھی۔

بڑے آہنی دروازے کو دیکھتے ہی وہ تازہ دم ہوئی۔ تھکاوٹ تو پہلے بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کسی کو پا لینے کا عزم آنکھوں سے جھانک رہا تھا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی اس نے جوتے ایک طرف کو اتارے۔ سیڑھیاں منتظر تھیں۔ وہ یاد آیتیں پڑھتی چڑھتی چلی گئی۔ سامنے برآمدہ سا بنا تھا اور آگے کو ایک چھوٹا سا قبرستان۔۔۔

وہ قبرستان عبور کر کے آئی تو بہت چھوٹا سا دروازہ تھا اسے اب جھکنا تھا۔ جھکا ہوا سر مزید جھکا کر اندر داخل ہوئی۔ پکی زمین پر چھوٹا سا کمرہ تھا۔ قبر پر سبز چادر پڑی تھی۔ ایک میٹھی سی خوشبو جو اندر آتے آتے تیز ہو گئی تھی۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا ہاتھ میں پکڑے شاپر میں سے مٹھائی کا ڈبہ نکالا۔ مزار کی دیکھ بھال کرنے والے نے پاس آکر اتنا پوچھا۔

" بی بی منت لائی ہو؟"

وہ کہہ سکتی تو کہتی دل لائی ہے۔۔۔ لیکن سر صرف اثبات میں ہلا دیا۔ پوچھنے والا ہاتھ کے اشارے سے بٹھا کر چلا گیا۔ اب اسے تب تک وہی بیٹھا رہنا تھا جب تک گیارہ منت مانگنے والے لوگ مٹھائی کے ڈبے میں موجود گیارہ رس گلے جن پر چھلے سجے ہوئے تھے اٹھا کر نہیں لے جاتے۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے انتظار کرنے لگی۔

جوں جوں شام کا وقت منڈیر پر آنے لگا۔ مزار میں رش بڑھنے لگ گئی۔ وہ وہی بیٹھی قرآن پاک پڑھتی رہی۔ ساتویں عورت نے اس کے پاس آکر رس گلا اٹھایا تو ساتھ ہی پوچھا۔ کیا نام ہے اس کا؟ پاکیزہ نے فوراً ہی بتایا۔ وہ آنکھیں بند کر کے کوئی حساب کتاب کرنے لگ گئی۔

"مل جائے گا تجھے مل جائے گا۔" بدوضع سی چال ڈھال والی عورت نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تو اسے یوں لگا کہ گویا وہ مل ہی گیا ہو۔

واپسی میں جاتے ہوئے اس کی چال میں تمکنت تھی۔ وہ پر سکون تھی۔ کچھ چھوٹے چھوٹے اشارے بڑی خوشیوں سے زیادہ خوش کر دیتے ہیں وہ۔ سوچ رہی تھی اندھیرا ہونے کو تھا اور وہ گلی سے باہر نکلنے والی تھی۔ گلی اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ کوئی قرب ہو اور من چاہا ہو تو چال ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ ہوا نے دھیرے سے اس کی پھٹی ہوئی ایڑھیوں پر گدگدی کی۔ وہ ننگے پاؤں واپسی کے سفر پر چلتی رہی۔

اسے کسی نے کہا تھا اکتالیس دن تک اکتالیس دفعہ سورت یسین پڑھ کر اکتالیس باداموں پر پھونک دو۔ ان میں سے تین بادام آفتاب کو کھلا دو اور باقی خود کھا لو۔ وہ تم سے شادی کر لے گا۔ اس نے ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر مسلسل وظیفہ کیا۔۔۔ نتیجہ کیا ملا؟ کچھ بھی نہیں۔۔۔ وہ ناامید نہیں تھی۔ اللہ کے کلام میں بہت برکت ہوتی ہے، وہ گناہگاروں پر بھی اثر کر جاتا ہے۔ اس کی تاثیر سے کوئی بچ نہیں سکتا پھر اس کے نصیب کیسے سوئے رہتے؟ اس کی آنکھوں میں جگنوؤں نے ہر صورت آنا تھا۔

شہر کا کوئی دربار مزار ایسا نہ تھا جہاں وہ نہ گئی ہو۔ اپنی منت کے ستارے آنچل میں پرو کر ہر ولی اللہ ہر زاہد کے سامنے جھولی پھیلانے لگ گئی تھی۔ کسی اللہ والے کو دیکھتی کسی نیک بندے کو دیکھتی تو دعا کی درخواست کرتی۔ اس کی آواز رندھ جاتی، آنکھ سے آنسو نکلنے لگتے۔ اس کے بال سمٹے رہتے، سر ڈھانپا رہتا دعائیں مسلسل سے کہیں زیادہ مسلسل ہو چکی تھیں!

فرض نمازیں تو گھٹی میں شامل تھی۔اب وہ تہجد چاشت بھی نہ چھوڑتی۔قرآن پاک میں پڑھا کہ جو گرم نرم بستر کو چھوڑ کر اللہ کو یاد کرے گا اللہ اسکی حاجت ضرور پوری کرے گا۔بستر اب اسے کانٹے کی طرح لگتا تھا۔اللہ جی تو سب کو دیتے ہیں مجھے بن مانگے دیتے ہیں۔اب میں مانگوں گی تو کیا خالی ہاتھ لوٹا دیں گے ؟اس نے شکر کرنے کی توفیق مانگی تھی وہ صبر نہیں کر رہی تھی۔

عید گاہ کے پیروں نے اسے دیکھا تو دنگ رہ گئے۔یہ لڑکی باؤلی ہو چلی تھی کالا دوپٹہ زمین کی دھول چاٹ رہا تھا۔سکارف کس کر باندھا ہوا تھا۔رویوں رہی تھی جیسے آج ہی یتیم ہوئی ہو۔بین دل کو چیرتے تھے۔ہچکیاں لیتا وجود جب سسکیاں بھرنے کی کوشش کرتا تو ناک لال ہو جاتی۔رواں آنسو چہرے کی ملامت کو مسکینی میں بدل رہے تھے۔اس کا کیا قصور تھا اس نے تو محبت کی تھی۔یہی تو اس کا قصور تھا اس نے محبت کی تھی!

شکر ہے کہ اللہ دلوں کا حال چہرے سے نہیں ظاہر کرتا۔وہ ہم گناہگاروں کے عیب چھپا کر رکھتا ہے۔اگر ہمارے عیب بھی ہمارے چہرے سے دوسروں کو نظر آنے لگ جائیں تو ہم مسکین نہ لگیں۔۔۔ہم تو ذلیل و رسوا ہو جائیں۔۔۔غیب کا علم اسی لیے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔وہ تنہائیوں میں ہونے والے،اندھیروں میں ہونے والے گناہ سب کے سامنے نہیں لاتا۔جب تک ہم زندہ ہیں ہمیں موقع دیتا ہے۔توبہ کر لو۔۔۔بخشش مانگ لو۔۔۔اگر وہ بخشش فرما دے تو پھر ان گناہوں کو ایسے مٹا دے گا جیسے کیے ہی نہیں۔قیامت کے دن جب رائی برابر غلاظتیں نہیں چھپی رہیں گی،اس دن وہ ہمارے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

یہ اس کے عیوب کا چھپنا ہی تھا جو اسے بچا گیا۔اپنے آنسوؤں سے اس نے عید گاہ کے پیر سے ایک آیت لی۔انہوں نے کہا تھا گیارہ ہزار مرتبہ پڑھو جو چاہتی ہو مل جائے گا۔اس نے گیارہ ہزار مرتبہ پڑھ لیا روتی بلکتی پھر گئی۔دن گزر رہے تھے لیکن اثر نہیں ہو رہا تھا۔کوئی تبدیلی نہیں آرہی تھی۔حالات بگڑتے چلے جارہے تھے۔وہ جو نام لے لے کر مرتا تھا،اب آواز سننا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔دل کرتا تو بات کر لیتا ورنہ نظر انداز کر دیتا۔

کوئی اتنا بھی کیسے بدل سکتا ہے ؟اور اگر بدلنا اتنا ہی آسان ہے تو پہلے جیسا کیوں نہیں ہو جاتا۔پہلے جیسا ہو تا تو زندگی کتنی مختلف ہوتی۔۔۔کتنی حسین ہوتی۔۔۔اپنے گلے شکوے دیوتا کے سامنے پیش کرتی۔وہ سن کر ہنسی میں اڑا دیتا۔کہتا آٹھ سال لگا کر تم نے مجھے بدلا ہے اب آٹھ سال بعد چاہتی ہو کہ میں پھر بدل جاؤں!

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتی۔عید گاہ کے پیر نے اب اکتالیس ہزار دفعہ وہی آیت پڑھنے کو کہا۔فرق نہیں پڑا۔تعداد لاکھ ہو گئی۔کہنا آسان ہے پڑھنا مشکل!ایک ہی شخص کا تصور کیے پورے دل سے اللہ کے حضور مسلسل مناجات کرتے رہنا بہت مشکل ہے۔ساری دنیا کے خالق سے اپنی مرضی کا فیصلہ کروانا کہاں آسان ہے۔وہ تو محبت کرتی تھی اس کے لیے سارے مرحلے آسان ہوتے گئے۔تعداد لاکھ سے تین لاکھ تک جا پہنچی۔وہ بوکھلائی سی رہنے لگی تھی۔اس کی آنکھوں میں آنسو ہمہ وقت رہتے۔وہ آفتاب کی ہو جانے کا کلمہ پڑھنے لگی تھی۔

ربنا اتینا فی الدنیا حسنتہ وفی الاخرات حسنتہ پڑھتی تو اسے بہتری آفتاب لگتا۔۔۔اسے حسنتہ آفتاب لگتا۔۔۔وہ آفتاب کا تصور کرتی، وہ اسی کو مانگتی۔

پاکیزہ کی شدتوں سے وہ غافل کہاں تھا۔ ملتا رہتا تھا۔ جب بلاتا کچے دھاگے سے بندھی چلی جاتی۔ وہ موم ہو گئی تھی۔ وہ موڑتا رہتا وہ مڑتی رہتی، وہ توڑتا رہتا وہ ٹوٹتی رہتی۔ وہ جوڑتا رہتا وہ جڑتی رہتی، وہ ڈھالتا رہتا وہ ڈھلتی رہتی، سانس بھی اس کی مرضی سے لیتی لیکن وہ کیا کہتا تھا۔۔۔

"وہ کہتا تھا" مجھے اب تم سے چڑ ہونے لگی ہے۔۔۔اتنی محبت تم کرتی نہیں ہو جتنی ظاہر کرتی ہو۔

وہ دل چیر کر دکھا سکتی تو دکھا دیتی۔ برسوں پہلے وہ دستک دینے والا تھا اور اس نے دروازہ کھولا تھا اب وہ دستک دے رہی تھی اسے بھی تو دروازہ کھولنا چاہیے تھا۔ اس کی ذہانت کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے والا اسے نفسیاتی کہتا تھا۔ "تم نفسیاتی مریض ہو۔ تمہیں نفسیات کے ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے"۔ وہ من ہی من میں سوچتی۔

"میں دل کی مریض ہوں۔ مجھے طبیبِ عشق کو دکھانا چاہیے"۔

اس کی رنگت کو سنہرا کہنے والا اس کے اٹھنے بیٹھنے میں سو سو قباحتیں نکالتا تھا۔ "تم اپنا چہرہ تو ٹھیک کرو۔ ہر وقت کہیں نہ کہیں سے شکل خراب ہوتی ہے۔ اپنی رنگت دیکھو۔۔۔کیا حشر بنایا ہوا ہے۔ تمہارے ساتھ چلتے بھی شرم آتی ہے۔" وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔

آفتاب کو کیا معلوم آفتاب کے لفظوں سے سو دفعہ قبر کھودی جاتی تھی، وہ ہر دفعہ اس میں دفن ہوتی۔ اپنی انا کو اسی قبر میں ڈالتی۔ عزت نفس کو جلا کر خاک کرتی پھر قبر سے نکلتی اور آفتاب کے سامنے ہاتھ پھیلاتی۔

"مجھ سے شادی کر لو۔۔۔" ایک عذاب تھا جو اسے زندگی میں دے دیا گیا تھا۔

سب رنگ پہننا چھوڑ چکی تھی وہ سیاہ رنگ پہنتی تھی ایک بہتر تبصرہ اسی رنگ کے لباس میں ملا تھا۔

"کچھ بہتر لگتا ہے تمہارا رنگ اس رنگ میں۔" تب سے بس سیاہ رنگ تھا سیاہ رنگ کا جوتا، سیاہ رنگ کے کپڑے، سیاہ رنگ کا بیگ۔۔۔ ایک سیاہی تھی جو انتظار کی صورت اس کے ماتھے پر چپکا دی گئی تھی۔ وہ خود کو رگڑ رگڑ کر دھویا کرتی مگر یہ سیاہی جان نہ چھوڑتی۔ وہ !بھول چکی تھی آخری دفعہ بے ساختہ کب ہنسی تھی۔ مسکراتی تو لگتا رو پڑے گی اور اگر وہ روتی تو یہ بات طے تھی آنسو سیاہ نکلتے۔۔۔

نمازیں لمبی ہو گئی تھیں۔ وہ سجدے میں جاتی تو سجدے سے نہ اٹھتی۔ تسبیحات طویل سے طویل تر ہوتی گئی۔ جتنا اللہ کے آگے جھکتی اتنا شرمندہ ہوتی۔ دل میں عجیب کھٹکا سا پیدا ہو گیا تھا۔ اگر یہ نکاح ہے تو کیسا نکاح ہے جو اس شخص کے دل میں محبت پیدا نہیں کر سکا اور اگر نکاح نہیں ہے تو میں اب تک کیوں رابطے میں ہوں؟ میں اس سے کیوں ملتی رہی ہوں؟ ہزاروں سوال تھے۔۔۔جو دل میں طوفان برپا کیے رکھتے۔ وہ سوالوں پر جاتی تو چین سے نہ رہ پاتی۔ اس کی ہر سانس مشکل ہو جاتی۔

ایک وقت تھا کہ آفتاب اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کی عادت بن گیا پھر اسے عادت سے محبت ہوئی۔ اب اسے اِس محبت کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف آفتاب کیا سوچتا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔ دل چاہتا تھا کسی طرح اس کے دماغ میں داخل ہو جائے۔ جتنی بدگمانی اور بے قدری سوچوں میں بھر چکی ہے کسی طرح سے مٹا دے لیکن اس کے اختیار میں یہ تھا ہی نہیں۔۔۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا وہ انسان ہے خدا نہیں! اس کی عقل تسلیم کر رہی تھی کہ کوئی ہستی ہے جس کی مرضی کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا!

وہ چاہتی تو اسے چھوڑ دیتی لیکن چاہ میں کب کچھ تھا؟ وہ دعاؤں سے نکل کر نس نس میں بھر چکا تھا۔ وہ چاہ کر بھی چھوڑ نہیں پا رہی تھی۔ دل و دماغ میں عجیب سی کشمکش تھی۔ آفتاب سے ملتی تو مزید کشمکش کا شکار ہو جاتی۔ وہ کبھی اتنا اچھا بنتا کہ ہیرا لگتا، کبھی اتنا بدلتا کے کاٹ کر رکھ دیتا۔ واقعی ہیرے جیسی صفات تھی۔ خیال رکھنے پر آتا تو پاؤں چومنے لگتا، درشتگی پر اترتا تو نظر بھر کر نہ دیکھتا۔ من چاہتا تو پاکیزہ کو دیکھ دیکھ کر گنگناتا رہتا اور جی نہ مانتا تو ہزاروں فرمائشیں کرتی پاکیزہ پر کان نہ دھرتا۔ ایک آئس کریم کھلانے کے لیے میلوں دور لے جاتا اور کبھی کبھی ایک چھوٹی سی بات پر رُلا دیتا لیکن بات نہ مانتا۔ آفتاب کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ اب اس کو پاکیزہ کے رونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

قرآن پاک آفتاب کو پاکیزہ تحفے میں دے چکی تھی۔ شاید کسی چیز سے وہ سنجیدہ ہو جائے۔۔۔ شاید وہ جان سکے کہ پاکیزہ آفتاب سے کتنی محبت کرتی ہے۔۔۔ پاکیزہ کی ساری کوششیں بے معنی جا رہی تھیں۔ جس دن کوئی وظیفہ مکمل ہوتا آفتاب کا رنگ ڈھنگ تھوڑا سا بدلتا۔ وہ پُر امید ہو جاتی، ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی لیکن پھر کوئی نا کوئی بات بری لگ جاتی اور وہ اتنے فاصلے پر کھڑا نظر آتا کہ وہ خود کو تن تنہا محسوس کرنے لگتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

گئے دنوں کی عزیز باتیں
نگار صبحیں، گلاب راتیں
بساطِ دل بھی عجیب شے ھے
ہزار جیتیں، ہزار ماتیں
جدائیوں کی ہوائیں لمحوں کی
خشک مٹی اُڑا رہی ہیں
گئی رتوں کا ملال کب تک؟
چلو کہ شاخیں تو ٹوٹتی ھیں

چلو کہ قبروں پہ خون رونے سے

اپنی آنکھیں ہی پھوٹتی ہیں

رشتے سچ میں آنے لگ گئے تھے۔ پھوپھو کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود آفتاب کی والدہ نہیں مان رہی تھیں۔ ایک تسلی تو تھی کہ آفتاب راضی ہے۔ بس وہ اسی تسلی سے امید کا دیا روشن کیے آنکھیں انتظار میں جمائے بیٹھی تھی۔ سب کچھ قابل برداشت تھا لیکن دل کا کھٹکا اسے وسوسے میں ڈال رہا تھا۔

اللہ کا نام جھوٹے منہ سے بھی لو تو دل سچا ہو جاتا ہے۔ اللہ کا نام لے کر یہ دنیا اور رسم و رواج دماغ سے نکل چکے تھے۔ بس اللہ یاد تھا۔ وہ نکاح کر کے اللہ کی نظر میں سرخرو ہونا چاہتی تھی۔ آفتاب اور پاکیزہ کے درمیان لڑائی جھگڑے ہونے لگ گئے۔ پاکیزہ کی باتیں آفتاب کو طنز لگتیں۔ آفتاب کی مصروفیت پاکیزہ کو رعونت محسوس ہوتی۔ جب سجدے میں جھکتی تو بس یہ دعا کرتی کہ اگر وہ بد دعا ہے تو اسے میرے لیے دعا بنا دے، اگر وہ بلا ہے تو اسے میرے لیے ردِ بلا بنا دے۔ اللہ سے بس یہی چاہتی تھی کہ آفتاب سے ایک دفعہ سب کے سامنے سچا نکاح ہو جائے پھر بھلے وہ اس کے قریب نہ آئے۔۔۔ پھر بھلے وہ اسے طلاق ہی دے دے۔۔۔

آفتاب قریب تو آتا تھا لیکن نکاح نہیں کرتا تھا۔ سب کے سامنے علی الاعلان اقرار بھی نہیں کرتا تھا۔ باقی بس یہ ہی تھا کے یہ بے نام سا تعلق بھی ٹوٹ ہی جائے۔

وہ پھانسی کے پھندے سے لٹکی ہوئی تھی۔ جان جانے کا خوف بھی تھا اور جینے کی خواہش بھی۔ بچنے کی امید نظر نہ آتی تھی اور مرنے کا اپنا ارادہ بھی تھا۔ زندگی موت بن چکی تھی۔ وہ سمجھ نہیں رہی تھی لیکن حقیتاً زندگی موت ہی کا سفر ہے۔

آفتاب نے بہت اصرار کر کے اسے ملنے بلایا تھا۔ اس گیسٹ ہاؤس میں بھی وہ پہلے کئی دفعہ مل چکے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ خاموشی سرسرا رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے تم بہت خوبصورت ہو۔۔۔" وہ اس کے کانوں میں شہد انڈیل رہا تھا جو پیروں میں ریشمی زنجیر بنتا جا رہا تھا۔

"آفتاب آپ شادی کب کریں گے؟" وہ وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ اس کی زندگی اور موت بس اسی ایک سوال سے جڑی ہوئی تھی۔

"پاکیزہ شادی سے پہلے میں تمہیں نفسیات کے ڈاکٹر کے پاس ضرور لے کر جاؤں گا ورنہ میری تو زندگی تم عذاب بنا کر رکھ دو گی۔" آفتاب بہت ہنستے ہوئے بولا۔

آج اسے کوئی بات بری نہیں لگ رہی تھی۔ ہنسی نے تھوڑی سی تقویت پاکیزہ کو مزید بخشی۔

"آفتاب میری شادی ہو جائے گی۔ پھوپھو مزید انتظار نہیں کریں گی۔" وہ منمنائی۔

"میں شادی نہیں کر سکتا ابھی۔ یہ دیکھو اور تھوڑی سی سمائل دو۔" وہ تصویر بنا رہا تھا، پاکیزہ نے بمشکل مسکراہٹ نچھاور کی۔

"آفتاب کچھ کریں ناں۔ صرف رشتہ بھیج دیں۔ شادی بے شک دس سال بعد کرنا کم از کم رشتہ بھیج دیں۔ میں لوگوں کی باتوں سے تو بچ جاؤں گی۔" وہ اس سے درخواست کر رہی تھی۔ وہ صرف یہی کر سکتی تھی۔

"تم تو کہتی تھی تمہیں صرف دل کی تسلی چاہیے۔ اللہ کو راضی کرنا چاہتی ہوں َلوگوں کی پرواہ نہیں ہے اور آج تم لوگوں کی پریشانی لے رہی ہو؟" پتہ نہیں وہ طنز کر رہا تھا یا پاکیزہ کو لگا۔

"پھر میرے دل کو اطمینان دے دیں َآپ مجھ سے کورٹ میرج کر لیں َپورا پورا نکاح کر لیں۔ قانونی طور پر بیوی بنا لیں۔" پاکیزہ کے دل کا کھٹکا زبان پر آ گیا تھا۔

" تم نکاح کو اپنے دماغ سے نکال کیوں نہیں دیتی ہو۔ ہر روز نئی بات نکالتی ہو۔" وہ غصے میں آ گیا تھا۔

"میں بس ویسے ہی کہہ۔۔۔۔""پاکیزہ کی بات آدھی منہ میں ہی تھی۔

"ویسے ہی کیا کہہ رہی تھی؟ تمہارا کام ہے میرا دماغ خراب کرنا۔ تمہیں سکون پسند ہی نہیں ہے۔ تم چاہتی ہی نہیں ہو کہ ہم دونوں ہنسی خوشی رہیں۔"

"میں ہمیشہ ساتھ رہنا چاہتی ہوں آفتاب۔۔۔ تنگی ترشی میں برداشت کر لوں گی۔" پاکیزہ کی زبان میں کھجلی ہوئی تھی۔

"تمہیں نہیں لگتا تم نفسیاتی مریض ہو؟ تمہارے ساتھ رہ کر میں نفسیاتی ہو گیا ہوں۔ میرا دماغ خراب ہو جاتا ہے تمہاری خرافات سن سن کر۔۔۔" وہ چیخ رہا تھا۔

" آفتاب آہستہ بولیں پلیز۔"

"میں آہستہ بولوں؟ میں آہستہ بولوں؟ مجھے سکھاؤ گی؟ تم اب تم سے سیکھنا پڑے گا کہ میں نے کیسے بولنا ہے؟ تمہارے باپ کا گھر نہیں ہے کہ آہستہ بولوں۔۔۔" وہ بے قابو ہو رہا تھا۔

"پلیز آرام سے آفتاب" پاکیزہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

آفتاب نے جواباً اس کا ہاتھ اتنی زور سے جھٹکا کہ پاکیزہ کو دھکا سا لگا۔ آفتاب کے مضبوط ہاتھوں کی بے رخی نے پاکیزہ کا سر الماری کے ساتھ جا لگایا۔ لوہے کی الماری کا قبضہ ٹوٹ کر باہر کی طرف نکلا ہوا تھا۔ سر پر جو لگی سو لگی۔۔۔ دائیں کان کے پاس سے گال پر زخم بن گیا۔ خون بہہ رہا تھا۔

"آفتاب۔۔۔" وہ سسکی اپنا ہاتھ گال کو لگایا تو پپوٹے سرخ ہو گئے۔ ایک نظر آفتاب کو دیکھا تو وہ اب بھی رخ موڑے کھڑا تھا۔

"یہ دیکھیں مجھے لگ گئی ہے۔ اب تو میری طرف دیکھیں۔" اس نے منت کی تھی۔۔

وہ مڑا۔۔۔ اس کے زخم پر تھوک کر کمرے سے باہر نکل گیا۔۔۔

پاکیزہ۔۔۔ آفتاب کی پاکیزہ۔۔۔

روشنی کی خواہش کرنے والی اپنے چہرے کا داغ لیے مردہ سی کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

منسوب تھے جو لوگ میری زندگی کے ساتھ

اکثر وہی ملے ہیں بڑی بے رُخی کے ساتھ

یوں تو مَیں ہنس پڑا ہُوں تمہارے لیے مگر

کتنے ستارے ٹوٹ پڑے اِک ہنسی کے ساتھ

فرصت مِلے تو اپنا گریباں بھی دیکھ لے

اے دوست یوں نہ کھیل میری بے بسی کے ساتھ

مجبوریوں کی بات چلی ہے تو مئے کہاں

ہم نے پیا ہے زہر بھی اکثر خوشی کے ساتھ

چہرے بدل بدل کے مجھے مل رہے ہیں لوگ

اتنا بُرا سلوک میری سادگی کے ساتھ؟

اللہ جی! مجھے آپ نے کب اکیلا چھوڑا ہے؟ ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے؟ میں نجانے کتنی دفعہ اس سے ملی ہوں۔۔۔ مجھے تو تعداد بھی یاد نہیں لیکن ایک دفعہ بھی ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوا کہ بات گھر تک آئی ہو۔ آپ نے تو اللہ جی مجھے کبھی رسوا نہیں کیا۔۔۔ اس دفعہ کیوں آزمائش اتنی طویل ہوتی جا رہی ہے؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔۔۔ میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ اللہ جی! میں ایسی لڑکی نہیں تھی کہ خود کو نمائش کے لیے پیش کروں۔۔۔ میں ایسی لڑکی بھی نہیں تھی کہ کسی کو اپنا آپ دکھا کر خوش ہوں۔۔۔ راہ چلتے اگر کوئی مجھے چھو کر گزرنے کی کوشش کرتا تو میں بھلے شور نہ ڈالتی تھی لیکن رک کر ایک زہریلی نگاہ اس شخص پر ضرور ڈالتی تھی کہ دوبارہ کسی کو چھونے سے پہلے اس کے دل میں تھپڑ کا ڈر ضرور ہو۔۔۔ میں نے تو محبت کو کبھی اپنی ترجیحات میں شامل ہی نہیں کیا تھا۔۔۔ یہ محبت تھی جو خود میری زندگی میں شامل ہوتی گئی۔۔۔ اس شخص نے مجھے پاگل کیا تھا۔ مجھے اس راستے پہ لے جانے والا وہ شخص ہے۔ میں اسے الزام ضرور دیتی ہوں لیکن اگر وہ میرا ہو جاتا یا مجھے اپنا بنا لیتا تو میں اسے یہ زندگی بھی بطور انعام دے دیتی۔

اللہ جی میرے ساتھ آئینے میں کھڑا ہو کر ہم دونوں کو ایک ساتھ خوبصورت کہنے والا آج آئینے کی گواہی پر بھی نہیں جا رہا۔ میں کدھر جاؤں اور کس سے کہوں؟ اگر وہ شخص خوبصورتی کا رسیا تھا تو اس نے تب مجھے کیوں چنا جب میں واقعی کچھ نہیں تھی؟ ایک تیرہ چودہ سال کی سانولی سی بچی میں اسے کیا نظر آیا تھا۔۔۔ اگر اس نے میرا ہونا ہی نہیں تھا تو مجھے کسی دوسرے کے قابل تو چھوڑتا۔۔۔ ان آٹھ نو سالوں میں اس کی زندگی میں ہزاروں لڑکیاں آتی جاتی رہیں۔ سکول کے زمانے میں بھی وہ مجھے جلانے کی

خاطر کتنی ہی لڑکیوں سے دوستی کرتا رہا لیکن اختتام میں وہ میرے پاس آتا تھا۔ اللہ جی! اب اختتام کب آئے گا؟ اللہ جی! اب وہ میرے پاس کب آئے گا؟

اللہ جی میں اسے بھول بھی جاؤں تو اس کی دیوانگی کیسے بھولوں؟ وہ جو میری ہتھیلیوں پر بار بار نرم بوسے دیتا تھا۔۔۔اس لمس کو کیسے بھولوں؟ میں اس شخص کی بے وفائی کو یاد رکھ لوں لیکن اس دل کا کیا کروں جو اس کے گھر میں دھڑکنے لگ گیا تھا؟ اس مان کا کیا کروں جو مجھے اس کے نام پر تھا؟ اس دعا کا کیا کروں جو میرے خوابوں تک میں آنے لگی تھی؟ میں اس دماغ کا کیا کروں جو اس کے گھر والوں کو اپنا خاندان سمجھنے لگ گیا تھا؟ میں کسی دوسرے انسان سے تو کیا اس کے گھر والوں سے بھی کبھی محبت کی دعویدار نہیں ہو سکتی۔۔۔ محبت تو ایک دفعہ ہوتی ہے اور وہ مجھے ہو گئی۔ اب میں ڈھونگ کر سکتی ہوں لیکن محبت نہیں کر سکتی۔۔۔ محبت کو کہیں یہ محبت بن کر مجھے نہ آزمائے۔۔۔ اس محبت کو کہیں کہ مجھے میری محبت دے دے۔۔۔ یہ ظلم ستم محبت کو کہہ دیں کہ اور نہ کرے ! محبت۔۔۔ نہیں! محبت اب اور نہیں! پلیز نہیں! محبت اب اور نہیں

وہ بیوقوف نہیں تھی وہ تو بہت سمجھدار تھی۔ وہ کیسے کسی کو ہر ایک لمحہ بتاتی۔ جب جب آفتاب نے اس کا اعتماد کمایا تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جس سے اس کا یقین آفتاب پر بڑھتا چلا گیا تھا۔۔۔ وہ پاکیزہ کو سوئی بھی نہیں لگنے دیتا تھا۔ پاکیزہ کے رونے پر جیسے آفتاب کی روح جسم سے نکلنے لگ جاتی۔ خود کو ہزاروں تکلیفیں دے دیتا لیکن پاکیزہ کو ٹھنڈی گرم ہوا تک نہ لگنے دیتا۔ پاکیزہ کی کوئی کتاب کہیں سے نہ مل رہی ہوتی تو آفتاب کی ذمہ داری بن جاتی۔

پاکیزہ اتنے سارے لمحوں کو یاد نہیں رکھ سکتی تھی۔ اگر ان لمحوں کو کسی طرح یاد بھی کر لیں تو ان لمحوں سے کشید کیے جانے والے جذبات کسی کو بتائے نہیں جاتے۔۔۔ جب کوئی آپ کی طرف پیار سے دیکھتا ہے، نرمی سے چھوتا ہے، نم بوسہ دیتا ہے، آنکھوں میں احترام رکھتا ہے تو دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی جگہ بنا لیتا ہے۔ وہ جگہ نہ تو ختم ہو سکتی ہے نہ ہی کسی اور کو مل سکتی ہے۔ اس جگہ میں یا تو وہی رہتا ہے یا کوئی نہیں۔۔۔! جب مکانوں سے مکین چلے جاتے ہیں تو مکان مکان نہیں رہتے کھنڈر بن جاتے ہیں۔

کھنڈر دل لیے جی رہی لڑکیوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ لوگ جب پوچھتے ہیں تو آپ کے پاس دینے کو دلیل نہیں ہوتی، دکھانے کو کوئی ثبوت نہیں ہوتا، صرف جذبات ہوتے ہیں جو آپ محسوس کر سکتے ہیں۔ بدقسمتی یہ کہ جذبات کا احساس بھی کسی دوسرے کو نہیں دے سکتے۔

لوگ سچ کہتے ہیں۔۔۔ لوگ سچ سمجھتے ہیں۔۔۔ یہ لڑکی بے وقوف ہے! یہ تو بہت سمجھدار تھی۔۔۔ لیکن لوگوں پر بیتے تو لوگ بھی جانیں کہ محبت بے وقوف کر دیتی ہے محبت سمجھدار نہیں رہنے دیتی۔

ایک لاکھ دفعہ پڑھنے والا وظیفہ اکیس لاکھ پر چلا گیا تھا۔ ایک عجیب سی بے بسی تھی جو آہستہ آہستہ پاکیزہ پر طاری ہو رہی تھی۔ آفتاب نے اس سے معافی مانگ لی تھی۔ تھوک دینا کون سی بڑی بات تھی۔ محبت نے عزتِ نفس کا احساس مٹا دیا تھا۔ پاکیزہ نے اسے

معاف کر دیا تھا۔ قبر کے کہیں اندر سے عزتِ نفس کا احساس سر اٹھانے کی ناکام کوشش کرتی رہتی لیکن پاکیزہ ان سب ہی کوششوں کو دبک دبک کر سلاتی۔ وہ عزت کو سینے سے لگا لیتی تو لوگ کیا کہتے؟ ہزاروں جگہوں پر لوگوں نے آفتاب اور پاکیزہ کو ساتھ دیکھا تھا وہ پاکیزہ کو کیا سمجھتے۔۔۔؟ سوال یہ نہیں تھا کہ وہ لوگ دوبارہ ٹکرائیں گے یا نہیں۔۔۔ سوال یہ تھا کہ وہ آفتاب کے بغیر لوگوں کا سامنا کیسے کرے گی۔۔۔؟

انسان کو کوئی دوسرا برا لگے تو اس کا گزارہ ہو جاتا ہے۔ وہ نفرت کے لیے ناپسندیدگی کے لیے ایک کونا مختص کر دیتا ہے لیکن اگر اپنا آپ برا لگے تو گزارہ نہیں ہوتا۔ نفرت اور ناپسندیدگی کے لیے کونا مختص نہیں ہوتا۔ زندگی صرف ہو جاتی ہے۔۔۔ زندگی خود نفرت بن جاتی ہے!

پاکیزہ کو اپنا آپ برا لگنے لگ گیا تھا۔ جو اچھا لگتا تھا وہ اسے مل نہیں سکتا تھا پھر کوئی اور اچھا کیوں کر لگتا۔ ان آٹھ نو سالوں میں اس نے اٹھارہ انیس دفعہ استخارہ کروایا تھا۔ ایک سید دوست سے حساب کروایا تھا۔ سب نے یہی کہا تھا کہ آفتاب اس کے حق میں بہترین ہے۔ فٹ پاتھ پر بیٹھے باباجی سے لے کر درگاہ پر بیٹھے فقیروں تک سب نے مثبت اشارے دیئے تھے۔ عام انسان سے لے کر خاص تک سب ہی آفتاب کے حق میں رہے تھے۔ اعداد کا علم رکھنے والوں نے بھی یہی کہا تھا وہ آپ سے محبت کرتا ہے آپ ہی سے شادی کرے گا۔ اب جانے کیسی ہوا چلی تھی کہ سب مثبت اشارے گم گئے تھے۔ دل کی زمین بنجر ہو گئی تھی۔ استخاروں نے اپنا وجود کھو دیا تھا۔ یہ وقت تھا کہ اس کے ہاتھوں میں مہندی لگتی۔۔۔ وہ دلہن بنائی جاتی لیکن اس وقت اسے سیاہ رنگ عطا کر دیا گیا۔

کتنا مشکل ہوتا ہے ساحل پر ایک قدم رکھنا اور پھر ڈگمگا جانا ساتھ ہی لہروں کا آنا اور آپ کو لے ڈوبنا۔۔۔

وہ ڈوب رہی تھی۔۔۔

نیچے۔۔۔

نیچے۔۔۔

اور نیچے!!!

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
بستی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ
سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار
راتوں اٹھ اٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ

"پاکیزہ مجھ سے ملو۔۔۔" اصرار باقی تھا

"آفتاب کیوں ملوں؟ ملنے کو کیا باقی رہ گیا ہے؟" دل سخت ہونے لگ گیا تھا۔

"تم مجھے انکار نہیں کر سکتی۔"

"آپ مجھے اقرار کرنے کی وجہ دے دیں میں بھی انکار نہیں کرنا چاہتی"۔

"وجہ ہے ناں۔۔۔میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا"۔

اور میں آپ کے ساتھ ایسے نہیں رہ سکتی۔"

وہ "وہ" نہیں تھی۔۔۔لیکن اکیلے میں ملنا اور سب سے چھپ کا رشتہ رکھنا۔۔۔ایک دوسرے کو چھونا۔۔۔لوگوں کے سامنے پاک پاکیزہ ہونے کا ڈھونگ رچانا۔۔۔اسے نفسیاتی کرنے لگا تھا۔۔۔اسے اپنا آپ داشتہ محسوس ہو رہا تھا۔

"میرے نیچے۔۔۔مجھے جواب دیتی ہو؟ میرا تھوک چاٹنے والی مجھے جواب دیتی ہو؟ کسی۔۔۔کی بچی میرے آگے زبان چلاتی ہو؟" جو بات آفتاب نے ادھوری کہی تھی وہ پاکیزہ نے پوری سن لی تھی۔۔۔۔

آسمان پہلے کبھی نہیں گرا تھا پاکیزہ کو احساس ہوا۔۔۔آسمان تو آج گرا تھا۔۔۔سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔ یہ تھا محبت کا نتیجہ۔۔۔!

یہ تھا محبت کا انجام۔۔۔!

"آپ مجھے طلاق دے دیں۔" پاکیزہ نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

نکاح کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اسے احساس ہو گیا تھا۔ دل کو تسلی دینا چاہتی تھی۔

آفتاب نے جواباً فون رکھ دیا۔ پاکیزہ کو رونا نہیں آ رہا تھا۔ وہ پچھلے دو سالوں میں بہت رو چکی تھی۔۔۔۔وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔۔۔ مرنا چاہتی تھی! دو تین گھنٹے بعد حواس بحال ہوئے تو اسے رونا آیا لیکن موت نہیں آئی حالانکہ آج اسے موت کی چاہ تھی۔۔۔شدید چاہ تھی۔ موت حرام ہے لیکن زندگی میں ایک دفعہ طلب ضرور بن جاتی ہے۔

"آپ مجھے طلاق دے دیں۔۔۔ آپ مجھے چھوڑ دیں!" پاکیزہ کے لبوں سے اور کچھ نہیں نکل رہا تھا۔ وہ پیغامات میں بھی بس یہی دہرا رہی تھی۔

"میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔مجھے آپ خود سے الگ کر دیں!" ایک ضد تھی جو پاگل پن کی طرح لبوں پر آ ٹھہری۔ زبان کچھ اور کہنے سے قاصر تھی۔

"تم تو نکاح کے بارے میں ویسے بھی مخمصے میں ہو۔۔۔جاؤ میری طرف سے آزاد ہو!" وہ جان چھوڑنے کو تیار تھا۔

وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ پاکیزہ کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وہ اپنا سارا اعتماد گروی رکھ چکی ہے اور آفتاب اپنی ساری کمزوریوں کو طاقت میں بدل چکا ہے۔ وہ کسی سے تیکھا ہو کر نہیں بولتا تھا۔۔۔گالی دینا تو بہت دور کی بات! اب اگر وہ گالی دے رہا تھا تو وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ واقعی آفتاب بن گیا تھا۔ شدید گرم۔۔۔۔جھلسا دینے والا۔۔۔!

"نہیں آپ اپنے منہ سے کہیں کہ آپ نے مجھے طلاق دی۔" دیوانگی باؤلا کر دیتی ہے۔وہ دیوانی زیادہ تھی یا باؤلی زیادہ۔۔۔وہ فیصلہ نہ کر سکی۔

اس اصرار کے پرے کہیں امید کا موتی جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔شاید وہ مجھے منالیں۔۔۔شاید وہ مجھے اپنالیں۔۔۔شاید وہ سب ٹھیک کر دیں۔۔۔آٹھ نو سال کی رفاقت کو وہ ایک دن کے غصے میں تو نہیں چھوڑے گا ناں؟ میں تو اس کی بچپن کی دوست ہوں۔ اب وہ جوانی میرے ساتھ گزار کر بڑھاپا کسی اور کو کے ساتھ کیسے جی سکتا ہے؟ وہ کسی اور کو کیسے نم بوسی دے سکتا ہے؟ وہ کسی اور کو کیسے اتنے پیار سے دیکھ سکتا ہے؟ وہ تو بہت صفائی پسند ہے۔۔۔اگر میں خود کو ایک کے بعد دوسرے شخص کے حوالے نہیں کر سکتی تو وہ ایک کے بعد دوسری لڑکی کے قریب کیسے جاسکتا ہے؟ اس نے اگر غلط بات کہہ دی تو کیا ہوا۔۔۔بس وہ ایک دفعہ معافی مانگ لے میں اسے معاف کر دوں گی۔۔۔معاف کیا کرنا۔۔۔میں اسے پہلے سے زیادہ پیار دوں گی تا کہ وہ میری قدر کر سکے۔میرا اور اس کا رشتہ اتنا کچا تو ہے نہیں کہ میں اس سے طلاق مانگوں اور وہ طلاق دے دے۔کوئی ادھار تو ہے نہیں جو ہمارے درمیان تبادلہ ہو اور بھلا دیا جائے۔ہمیشہ رہنے والے ساتھ میں بھی کبھی ایسا ہوتا ہے؟

وہ خود کو میرا friend forever کہتا ہے۔۔۔میں اسے اپنا ہمجان سمجھتی ہوں۔اگر اس نے غصے میں غلط لفظ استعمال کر دیئے ہیں تو میرا غصہ اسے اپنے الفاظ کی سنگینی کا احساس دلا دے گا۔

"تم واقعی یہ سننا چاہتی ہو؟" آفتاب نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔۔۔امید کے موتی کی چمک کچھ اور بڑھ گئی۔

"اس ذلت بھری زندگی کو مزید کتنا گھسیٹوں آفتاب؟ اگر آپ مجھے اس ذلت سے نجات نہیں دے سکتے تو پھر اس رشتے سے نجات دے دیں۔"

"تم پچھتاؤ گی۔۔۔"

"آپ بھی تو پچھتا رہے ہیں مجھ جیسی نفسیاتی کے ساتھ رہ رہ کر۔۔۔"

"پھر طعنے دے رہی ہو؟ بہت مار کھاؤ گی تم اپنی زبان سے!"

"آپ وار کریں اپنی زبان سے۔۔۔چھوڑ دیں مجھے!"

"میں تمہیں طلاق دیتا ہوں پاکیزہ۔۔۔میں نے تمہیں طلاق دی۔۔۔میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

"اب خوش ہو؟" بہت سفاکی سے اس نے پوچھا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

وہ خوشی کے ہجے بھی کرنا بھول گئی تھی۔۔

آسمان جو پہلے گرا تھا وہ پورا نہیں تھا پاکیزہ کو ایک بار پھر احساس ہوا۔

اب آسمان پورا گرا تھا۔۔۔وہ پورے قد سے آسمان تلے دب گئی تھی۔۔۔سانولا صبیح سب بھول گیا تھا۔۔۔اب کالا تھا۔اس دنیا کا ہر رنگ کالا تھا!۔۔۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

میں خود کو روند کے جاتا تھا اس کی بستی میں

وہ ہجر دے کے مجھے ہی نڈھال رکھتا تھا

میں کتنے کرب سے گزرا ہوں تم نہ سمجھو گے

وہ شخص مجھ کو بہت پُر ملال رکھتا تھا

"طلاق۔۔۔کیا آفتاب نور مجھے طلاق دے سکتا ہے؟ مجھے وہ اپنا آئینہ کہتا تھا۔۔۔اور کیا کوئی آئینے کو یوں توڑ تا ہے؟ وہ کچھ تو درمیان میں رہنے دیتا۔اسے سب کچھ ختم کرنے کی کتنی جلدی تھی۔میں اتنی ارزاں تھی اس کے لیے۔۔۔میں کوئی ٹی شرٹ تھی جسے جب تک چاہتا سینے سے لگایا، تن کا پہناوا بنایا اور جب دل چاہا اتار کر پھینک دیا؟ میں نے کیوں کی محبت؟ کیا میں نہیں جانتی تھی کہ مرد وقت گزاری کرتے ہیں؟ کیا مجھے اپنی عزت کا پاس نہیں تھا؟ سچ تو یہ ہے کہ اپنی عزت نفس کو میں نے محبت کی ٹرے میں بچھا کر پیش کیا۔میں نے خود اسے آسانی دی، اب اگر وہ پوری ٹرے پٹخ کر چلا گیا ہے تو مجھے اپنی روح کے برتن ٹوٹنے کا افسوس منانے کو کوئی حق نہیں۔۔۔!مجھے کوئی حق نہیں کہ میں زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں۔۔۔!میں نے خود اس کی مرضی کے رنگ پہننا شروع کیے تھے۔۔۔!مجھے زیبائش و آرائش پر بھی حق نہیں۔۔۔!مجھے تو نمازوں پر بھی حق نہیں۔۔۔میں کس منہ سے نماز پڑھوں گی۔۔۔میں نے تو اپنی نمازیں بھی اس کے لیے گروی رکھ دی۔وہ مجھ سے دور ہو گیا ہے، اتنا دور کہ مجھے تو اسے دیکھنے کا، سننے کا، محسوس کرنے کا حق بھی باقی نہیں رہا!

کچھ لوگوں کے لیے اللہ جی دنیا مختص کر دیتے ہیں، کچھ لوگوں کو آخرت میں حصہ دے دیتے ہیں، میری نہ دنیا رہی نہ آخرت، میرے نصیب کھوٹے نکلے۔۔۔!

میں آفتاب کے پاس جا کر اس کے پاؤں بھی پکڑ لوں تو اب ہمارے درمیان پہلے والا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا، رشتہ وہ قائم کر بھی لے تو شاید اعتبار کبھی قائم نہیں ہو گا۔ایک طریقہ بچتا ہے کہ میں حلالہ کر لوں، لیکن حلالہ کرنے کی نیت سے نکاح کرنا بھی جائز نہیں۔۔۔کیا میں آخری حد تک چلی جاؤں۔۔۔نہیں اگر مجھے آخری حد پر جانا تھا تو اس طلاق کے وبال سے پہلے جانا چاہیے تھا۔آخری حد یعنی وہ بورڈ جس پر میں نے لکھا ہوا پڑھا تھا کہ محبوب آپ کے قدموں میں۔۔۔

کالے جادو ہی سے سہی، میں اسے اپنا بنا لیتی۔لیکن نہیں، تب میرے اندر کچھ غلط ہو جانے کی گھنٹی بجنے لگ جاتی تھی۔مجھے یاد ہے میں نے اس دیوار سے فون نمبر دیکھ کر اس پر فون بھی کی تھی جس عامل نے فون اٹھایا تھا اس نے کہا تھا بی بی، پہلے اپنے سر پر دوپٹہ

رکھو پھر اپنا مسئلہ بتانا۔اس وقت واقعی میرے سر پر دوپٹہ نہیں تھا۔۔۔مجھے اس کی باتوں میں کچھ نہ کچھ سچائی لگی تھی۔میں چاہتی تو آخری حد پار کر لیتی، کالے جادو کا سہارا لے لیتی لیکن اگر اب سہارا نہیں لیا تو پھر مجھے رونے کا بھی حق نہیں ہے۔اب جب زمین مجھ پر تنگ ہو گی اور آسمان شعلے برسائے گا، اس کی دید میری آنکھوں کی ٹھنڈک بن کر مجھے نہیں ملے گی تو میں دیکھوں گی کہ کیسے میرے اندر واپس اس آخری کنارے پر جانے کی تمنا نہیں لوٹتی۔کاش مجھے ڈوبنا آتا۔۔۔ تیر تو نہیں سکتی۔۔۔ آخری حد پر جا کر ڈوب ہی جاتی لیکن اس سے دور تو نہ ہوتی۔

وہ آدمی نہیں ہے، وہ سرطان ہے۔وہ میری رگ رگ میں ہے، وہ میری ہر تکلیف، ہر درد، ہر آہ میں ہے۔میری تنہائی بھی تنہا نہیں ہے۔وہ ہمیشہ سے دوسرا ہے، میرے سر پر سوار ہے۔کاش وہ انسان نہ ہوتا، شیطان ہوتا۔۔۔وہ اتنا برا ہوتا کہ میں اس سے نفرت کر سکتی۔۔۔وہ کچھ تو اتنا برا کرتا میرے ساتھ کہ میری روح اس کی یاد آنے کے ڈر سے کانپ اٹھتی، اس کی کوئی برائی میری آنکھوں سے لہو بن کر ٹپکتی اور میں اپنی کلائیاں نوچ لیتی۔وہ بے وفا تھا تو ڈھنگ سے ہی آہنی بے وفائی پر اکڑ جاتا۔وہ غرور کرتا، اپنے سارے پردے فاش کر کے میرے سامنے آنے باطن کے زہر سمیت آن کھڑا ہوتا۔میں اس کا نام بھی لینا گوارا نہ کرتی۔لیکن نہیں۔۔۔! نہیں۔۔۔!اس نے تو ظلم کی انتہا کر دی۔۔۔میرے ساتھ وہ حد بھی پار نہ کی جس سے آگے کھڑی ہو کر میں اسے تن کا پجاری ہونے کا الزام دیتی۔اس نے اپنی ضرورت کو مجھ سے اس سلیقے سے پورا کیا کہ میں اسے غلام ہونے کا طعنہ بھی نہیں دے سکتی۔ایک دو دفعہ کے علاوہ اس نے مجھے سختی سے چھوا بھی نہیں۔کبھی اپنے دوستوں کے سامنے میری نمائش نہیں کروائی، کبھی بند کمرے میں کسی کو آنے نہیں دیا، میں نے سارے اختیارات اس کو دیئے تھے لیکن وہ کبھی اندھا نہ ہوا۔۔۔اس حد کو ہمیشہ دھیان میں رکھا جو ہمارے درمیان تھی۔

میں کیسے اس کی بے وفائی پر یقین کروں جس کی پارسائی کی گواہی مجھے میرا دل دیتا ہے، میں کیسے اس کے بغیر جینے کا ارادہ کر لوں جو ہمیشہ مجھے تحفظ دیتا آیا ہے۔اس نے جانا ہی تھا تو ہر ہر چیز کی کرچیاں کر کے جاتا۔۔۔وہ آخری حد ہی توڑ دیتا، اس نے مجھے کنوارا کیوں رہنے دیا؟ کنواری منکوحہ سے تو کہیں بہتر بیوہ ہو جانا ہے۔وہ مجھے مکمل اپنا کر کے مر جاتا لیکن یوں بیچ راستے میں تو نہ چھوڑتا۔وہ کسی ایک لمحے میں تو میرا ہوتا، مکمل میرا ہوتا، فقط میرا ہوتا!

کیا میں اس کو ایک نظر دیکھ کر ٹھیک ہو جاؤں گی؟ وہ شخص جس سے میں نے ہر چھوٹے بڑے موقع پہ، ہر نازک لمحے میں وعدے لئے کہ وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑے گا۔مجھے ہمیشہ ایسے ہی چاہے گا۔ہر وہ پل جب کوئی بھی عام انسان جھوٹ نہیں بول سکتا۔نیند کے خمار میں، تکلیف کی انتہا پہ میں نے اس ست ہزار بار پوچھا تم مجھ سے محبت کرتے ہو ناں؟ اس نے ہر ہر بار مجھ سے جھوٹ بولا۔مجھے جھوٹا یقین دلایا کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔تم جو فرض کرتی ہو میں اس کا اظہار کرتا ہوں اور بار بار کرتا ہوں کہ میں تم سے سچا پیار کرتا ہوں۔اس مکار شخص کے جھوٹے چہرے میں ایسی کون سی کشش ہے کہ میں غصے سے

ہی سہی اس کا چہرہ نہ دیکھوں تو مضطرب رہتی ہوں, میرا نشہ ٹوٹنے لگتا ہے۔کوئی شے من کو نہیں بھاتی۔کوئی موسیقی دل کو نہیں چھوتی۔کوئی چیز مجھے اپنی طرف متوجہ نہیں کر پاتی۔میرے ہاتھ شدتِ طلب سے کپکپانے لگتے ہیں۔دل کے کونے سے بے سکونی چیخ چیخ کر پکارتی ہے کہ اس کو ایک دفعہ صرف ایک نظر دیکھ لو۔۔۔اور بس دیکھنے کی دیر ہے۔مدھم سی چلتی ہوئی یہ دھڑکن اپنی نارمل رفتار پہ آجاتی ہے۔دماغ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہے جیسے منشیات کے عادی کو ڈوز مل گئی ہو۔میں اللہ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ آخر اس کے چہرے میں میرے لئے ایسا کیا رکھ دیا ہے کہ میرا زخم خوردہ دل چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ میں اسے دیکھتے ہی ٹھیک ہو جاؤں گا؟ کیوں سب دوائیاں بے اثر ہو جاتی ہیں؟ کیوں نیند میری آنکھوں سے روٹھ جاتی ہے؟ کیوں یہ سوال میرے ہاتھوں پہ لرزش طاری کئے رکھتا ہے کہ کیا میں اسے دیکھ کر ٹھیک ہو جاؤں گی؟ کیوں میں آپ اپنی بے چینی کو آزماتی ہوں اور ہر دفعہ اسے دیکھ کر جب سکون ملتا ہے تو آپ ہی فاتح اور آپ ہی مفتوح بن جاتی ہوں۔میں بے وقوف نہیں ہوں۔میں بہت سمجھ دار ہوں۔میں جانتی ہوں وہ نشہ ہے اور نشہ حلال نہیں۔۔۔۔۔!لیکن پھر بھی مجھے وہ ایک نظر چاہیے۔

اب میں کہاں جاؤں؟ کس سے فریاد کروں؟ اپنے زخم کس کو دکھاؤں۔۔۔زخم بھی ایسے کہ جو ملے ہی نہیں اور ہیں بھی اذیت ناک!ساری غلطی میری جلد بازیوں کی ہے۔۔۔سب گناہ قصور میرے کھاتے میں لکھا جانا چاہیے۔۔۔میں نے اس سے طلاق مانگی کیوں؟ مجھ بدبخت کو اس سے طلاق نہیں مانگی چاہیے تھی۔میں منحوس جانتی تھی کہ میں اس کو دیکھے بنا نہیں رہ سکتی تو پھر مجھے صبر کرنا چاہیے تھا۔مجھے صبر کے بدلے میں وہ مل جاتا۔اب تو میرے ہاتھ میں خاک ہے۔دل کرتا ہے اس خاک کا اتنا اڑاؤں کہ میرا چہرہ مجھے ہی نظر نہ آئے۔۔۔اس خاک سے خود کو ڈھانپ لوں اور مر جاؤں۔۔۔ہاں یہی اچھا ہے!میرے لیے یہی اچھا ہے!خودکشی کرنے والے کی ویسے بھی یہ سزا ہے کہ اسے قیامت تک اس کے طرز خودکشی سے مارا جائے گا۔میں اگر زندہ رہی تو اسے یاد کر کر کے روز مرتی رہوں گی۔۔۔اس سے بہتر ہے میں مر ہی جاؤں۔۔!

کیا میرا مرنا اچھا ہے؟ میری تو خاک بھی اس زمین کو آلودہ کر دے گی۔۔۔میں جہاں دفن ہوں گی وہاں صرف بے شمار خاردار جھاڑیاں ہی اگیں گی۔سب کی سب بنجر ہوں گی۔ان پر کوئی ثمر کبھی نہیں آسکے گا۔خیر مجھے یہ سوچنے کی کیا حاجت کہ میرے مرنے کے بعد کیا ہو گا۔سچ یہی ہے کہ اب اس دنیا میں کسی کو نا میری ضرورت ہے نہ مجھے کسی اور کی۔۔۔یوں کیا جائے کہ اب سکون سے مر لیا جائے۔''وہ ایم ایس کیمسٹری کی ذہین طالبہ جب خود کلامی کر کے تھک گئی تو ہاتھ میں تھامی شیشی کھول لی, اگلے ہی لمحے وہ ساری دوائیاں منہ میں انڈیل چکی تھی۔کانپتے ہاتھوں سے پانی کی بوتل کھول کر منہ سے لگائی۔پاکیزہ کا سر اب کرسی سے ٹکا ہوا تھا۔آنکھیں موت کے انتظار میں گول گھومتے پنکھے پر جا لگیں تھیں۔آدھ کھلے دروازے پر خاموشی پہرہ دے رہی تھی۔کھڑکی سے باہر دکھائی دیتے درخت کی سب شاخیں ٹنڈ منڈ ہو چکی تھیں۔۔بس ایک شاخ پر ایک آخری پتہ جھول رہا تھا جو ہوا کے جھونکے سے زمین برد ہونے والا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ہم نے اکثر تمہاری راہوں میں

رُک کے اپنا ہی انتظار کیا

اس کے پاس مرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ جینے کا جو ایک جواز تھا وہ اس سے چھن چکا تھا لیکن کیا مرنا اتنا آسان ہوتا ہے؟ موت کی تمنا کرنے پر موت آجاتی تو ہر کوئی اپنی زندگی میں ایک مرتبہ تو ضرور مرتا۔۔۔ وہ سوتی تھی، جاگتی تھی، کھاتی تھی، پیتی تھی۔ اسے اپنی زندگی کا خود بھی اعتبار نہ رہا تھا۔ یونیورسٹی میں اس کے گرد جتنے بھی انسان تھے وہ اسے بھیڑیے نظر آتے تھے۔ اس کا خول اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ خود سے بھی وہ سو بار منہ چھپاتی۔۔۔ خود کو حیرت سے دیکھا کرتی۔۔۔ وہ تو بے وفا ہے مجھے چھوڑ کر جی سکتا ہے لیکن کیا میں اس کے بغیر جی کر بھی بے وفا ہونے کا ثبوت نہیں دے رہی؟ مجھے تو اسی لمحے مر جانا چاہیے تھا جس لمحے اس نے مجھے چھوڑا۔۔۔! سوال جواب اپنی جگہ لیکن چلتی سانسیں اجازت لے کر نہیں چل رہی تھی۔ ایک دل چاہتا کہ آفتاب نور کو فون کر کے اس سے پوچھے کہ ایک دفعہ بھی اسے ان لمحات نے نہیں روکا جو میرے اور اس کے درمیانے شدید قربت کے گواہ تھے۔۔۔ ایک دفعہ بھی وہ چھوڑتے چھوٹے تحفے اس کے راستے میں نہیں آئے جو میں نے اپنے خلوص سے خریدے تھے۔۔۔ وہ کیوں بھول گیا کہ اس کی تکلیف پر میری آواز بھرا جاتی ہے۔۔۔ میرے آنسو بے مول کرنے کا فیصلہ اس نے کیسے کر لیا؟ اگر اس کے اندر اتنی بڑی تبدیلی آ رہی تھی تو مجھے پتا کیوں نہیں چلا۔۔۔ میں کہاں گم تھی۔۔۔ میں کن وظیفوں اور منتوں میں کھوئی ہوئی تھی جب وہ میری ذات کا حصار توڑ کر باہر نکلا۔۔۔ مجھ سا بے خبر بھی کوئی ہو گا؟ یہ سب سوال بھی ساون کی بارش کی طرح اندر ہی اندر برستے۔۔۔۔ گھٹن کم نہ ھوتی، حبس اور بھی بڑھ جاتا۔۔۔

پہلے اگر وہ فون کرتی، رابطہ کرتی تو دل کی تسلی کے لیے نکاح کے نام پر رچایا ہوا ایک ڈرامہ ہی سہی اس کی تسلی کے لیے کافی تھا۔ اب تو دلاسے کا کوئی ذریعہ نہیں رہا تھا۔ وہ فون کرتی تو خود سے نظریں کیسے ملاتی۔ آنکھیں بے خواب تھی، ہونٹ بے رنگ۔ راتوں کو چیخیں مارتی نیند سے اٹھ کھڑی ہوتی۔ سانس تیز چل رہا ہوتا اور زندگی متنفر ہوتی۔ تسکین نے پوچھنے کی بہت کوشش کی لیکن پاکیزہ کی چپ نہ ٹوٹی۔ وہی تھی جو دو دفعہ اس کا معدہ واش کروا چکی تھی لیکن چپ نہ توڑ سکی تھی۔ چپ کا آکٹوپس جنون بن کر اس کی رگوں میں اتر آیا تھا۔ کبھی اونچی آواز میں موسیقی سنتی، بال گلے میں ڈالتی اور جھولتی تھی۔ اس لمحے اس کی آنکھیں زندگی سے عاری ہو جاتیں۔ کبھی دوپٹہ لپیٹتی اور مصلے کی ہو کر رہ جاتی۔ سجدے پر سجدے کرتی لیکن دل کو سکون نہ ملتا۔ رگوں سے خون نکالنا، ڈھیروں ڈھیر دوائیاں کھالینا، ساری رات جاگتے رہنا، خود کو بھوکا رکھنا۔۔۔ وہ ہر طرح کا ظلم کر رہی تھی لیکن آفتاب نور کی یاد سب مظالم سے زیادہ ظالم تھی! جب یاد آتی دل میں خراش سی پڑ جاتی، لہو رسنے لگتا اور آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر جامد ہو جاتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

کہنے والوں کا کچھ نہیں جاتا

سہنے والے کمال کرتے ہیں

کھڑکی سے چاند کی روشنی اس کے بے رنگ وجود پر پڑ رہی تھی۔بال الجھے ہوئے گلے میں پڑے تھے،وہ آنکھیں کھولے چھت کو دیکھ رہی تھی،بازو بستر سے نیچے جھول رہا تھا۔

"کیا اسے میری یاد نہیں آتی ہو گی؟"اس نے خود کلامی کی۔۔۔رات کے دو پہر گزر چکے تھے۔سوال جواب کی تلاش میں سر پٹخنے لگا تھا۔اسی اثنا میں اس کا فون بجا۔

"ہیلو ہیلو،پاکیزہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔۔۔"آفتاب کی بے چین آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔

تلخی حلق تک بھر آئی۔"تم نے ہمارے درمیان چھوڑا ہی کیا ہے آفتاب؟"

"میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوں گا پاکیزہ۔پلیز تم میری بات سنو۔"

"تمہاری ہی تو سنتی آئی ہوں۔راستے تو تم نکالتے رہے لیکن منزل نہ تمہیں نظر آ سکی نہ میں پا سکی۔"

"ایسے نہ کہو،بے وقوفی کے کسی فیصلے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے دور نہیں جا سکتے۔۔۔ہم الگ نہیں ہو سکتے۔۔۔عزہ تم میری عزہ ہو ناں؟پلیز میری بات سنو۔"وہ پھر اسے بچوں کی طرح پچکار رہا تھا۔

"سننے کے لیے کیا رکھا ہے؟تم کہتے ہو چھوڑنا بے وقوفی تھی لیکن مجھے گزشتہ دو ماہ میں سمجھ آیا ہے کہ تمہیں اپنانا میری بے وقوفی تھی۔"

"اچھا سچ بتاؤ میرے بغیر رہ سکتی ہو؟میں تو تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"اگر میری مرضی کی بات ہے آفتاب نور تو تم میرا چاند تھے اور میں چکور۔تمہارے بغیر میں بالکل نہیں رہ سکتی،لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مجھے اب تمہارے بغیر ہی رہنا ہے۔"

"عزہ مجھے تم تم کہہ کر ہرٹ نہ کرو۔مجھ سے پہلے کی طرح بات کرو۔"

تم کتنے نازک ہو۔ایک تم سے ہرٹ ہو جاتے ہو اور میں حیوان ہوں کہ مجھ پر گالیاں سن کر بھی اثر نہیں ہوتا۔مجھے تمہارا طلاق دینا بھی ہرٹ نہیں کر سکتا۔"وہ کتنا ہرٹ ہوئی تھی اس کا لہجہ بتا رہا تھا۔

"پاکیزہ میں نے تمہیں غصے میں طلاق دی تھی۔میں تمہیں فتوی۔۔۔"

"بس آفتاب نور بس!مذہب کو مزید کھلونا نہ بناؤ۔یہ تمہارا کھیلنا ہی تھا جس نے ہمارے درمیان سو کالڈ رشتے کو بھی تباہ کیا اور خود مجھے بھی۔۔۔میں کیا تھی اور تم نے کیا کر دیا؟کبھی سوچا نے؟"

"دیکھو اب زیادہ نہ بولو۔۔۔مجھے غصہ آجائے گا!میں نے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کیا۔جو کچھ ہوا ہے تمہاری مرضی سے ہوا۔میں نے کبھی جبر نہیں کیا۔"

"اگر سب کچھ میری مرضی سے ہو رہا تھا تو مجھے چھوڑنے سے پہلے بھی میری مرضی پوچھ لیتے۔میں تو محبت کے آگے سر جھکاتی رہی تم آخر میں دامن جھاڑ کر محبت کے حصار سے ہی نکل گئے۔"

"میں اب بھی تم سے پہلے جیسی محبت جتا سکتا ہوں۔"پاکیزہ کو لہجے میں خباثت عیاں لگی۔

پاکیزہ جو اتنی دیر سے امید کا سرا تھامے بیٹھی تھی، پھٹ پڑی۔"محبت کا نام نہ لو، محبت کو کیوں بدنام کرتے ہو، محبت یہ نہیں کہ ایک دوسرے کو دیکھا جائے، محبت یہ بھی نہیں کہ ایک دوسرے کو چھوا جائے، محبت عبادت کا دوسرا نام ہے۔محبت عزت کا پہلا روپ ہے۔محبت خباثت اور منافقت کے بہروپیوں کے پاس بھی نہیں بھٹکتی۔محبت روحانیت کا لبادہ ہے۔آفتاب کاش تم یہ بات سمجھ سکتے۔"

"میرے سامنے زیادہ فلاسفر بننے کی ضرورت نہیں ہے۔تم بھی جانتی ہو تمہاری محبت کے تن پر کتنے کپڑے سلامت ہیں۔"

"بس آفتاب نور بس۔۔۔!مجھے اپنا وہ روپ نہ دکھاؤ کہ میں تم سے نفرت بھی نہ کر سکوں۔"

"نفرت، محبت پرانی صدی کے قصے ہیں۔اب سارا مدعا ضرورت ہے۔"

"اور تم جیسوں کی ضرورت کبھی پوری نہیں ہوتی۔۔۔"

"انسان کی بچی تو بنتی ہی نہیں ہو۔میں نے سوچا شاید سدھر گئی ہو گی لیکن تمہارے نفسیاتی دماغ پر سے محبت اور عزت کا بھوت اترتا ہی نہیں ہے۔"

"تمیز سے بات کرو۔"

"بکواس بند کرو اور سڑتی مرتی رہو۔"

فون اللہ حافظ کے بغیر بند ہو چکا تھا۔آفتاب نے بے شک صلواتیں سنائی تھیں لیکن اتنے عرصے بعد اس کی آواز سن کر پاکیزہ کو سکون مل گیا۔آنکھیں بند ہوئی تو نیند نے آلیا۔کیسا شخص ہے خنجر سے وار کرتا ہے اور مجھے پھول بن کر لگتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

صرف احساس ہے یہ، روح سے محسوس کرو

پیار کو پیار ہی رہنے دو، کوئی نام نہ دو

کتنی بڑی بدنصیبی تھی نیندیں چرا لینے کا الزام جس پر تھا اسی کی آواز سن کر چین ملتا تھا، اسی کی آواز سن کر نیند آتی تھی۔نمازیں تھیں کہ جاری تھیں اور شاید نمازوں کا ہی اثر تھا کہ وہ چاہ کر بھی خود سے آفتاب سے رابطہ نہیں کر پا رہی تھی۔موبائل فون ہاتھ میں ہوتا،

سکرین سے سر ٹکرانے کا دل کرتا لیکن جس نے سر کو جھکا دیا تھا اس کو ٹوٹا ہوا دل کیسے دکھاتی۔ دل کرتا کہ اپنے رابطے اتنے وسیع کر لے کہ آفتاب اسے کسی اور کے ساتھ دیکھ کر جھلس اٹھے۔ کبھی دل کرتا اپنی ہڈیوں کا سرمہ بنائے اور زندگی کی چوٹی پر رکھ دے۔۔۔ حالات کی ہوا لے اُڑے اور دنیا اس لڑکی کو ہی بھول جائے جسے دنیا کو یاد رہ جانے کا شوق تھا!

بے بسی کی انتہا تھی۔ اگر کچھ مثبت تھا تو یہ کہ وہ رابطے میں پہل نہیں کر رہی تھی۔ رابطہ پھر بھی برقرار تھا، ناامیدی جیسی ایک امید دل کے اندر خنجر کی طرح گڑی ہوئی تھی، اس نے نہیں آنا تھا لیکن وہ شاید آجائے شاید کوئی راستہ نکال لے۔ زہر کو زہر کاٹتا ہے، لوہے کو لوہا کاٹتا ہے تو میرا استمگر ہی میرا ہمدرد بن جائے! کوئی ایسا معجزہ لے کر آئے کہ زندگی کے سارے گل مہک اٹھیں، سارے رنگ جی اٹھیں۔۔۔!

خواہشوں کی انگڑائیوں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ یہ سستی کے سندیسے زندگی کی صبح تک لاتی ہی رہتی ہیں۔ طلاق جیسے جاں گسل مقام سے ذرا پہلے تک کچھ دوستوں نے بہت سمجھایا تھا تھوڑا سا فاصلہ لے آؤ۔ اپنی زندگی جینا سیکھو، اسے اس کی زندگی جینے دو۔ اس کے پیچھے بھاگو گی تو وہ تمھارے آگے آگے بھاگے گا۔ اس سے تھوڑا سا فاصلہ رکھو تاکہ اس کا تم میں تجسس باقی رہے۔ وہ فاصلے کی وجہ جاننے کو ہی سہی تمھارے پاس تو آئے لیکن پاکیزہ کو تو محبت کے طلسم پر اندھا اعتبار تھا۔ بھلا جو محبت کر سکتی ہے وہ فاصلہ کیسے کر سکتا ہے؟ محبت نے پھر کیا کیا تھا۔۔۔ اسے درگاہوں پر بھٹکتا ہوا چھوڑ دیا تھا۔۔۔ اس کے پیروں میں گھنگھرو باندھ دیئے تھے۔۔۔ اسے محبت نے آنکھوں کی وحشت اور درد کی لذت دی تھی!

محبت جسے وہ فاتح عالم سمجھ بیٹھی تھی۔۔۔ اسی کو فتح کر کے اس کی قبر پر اپنی تختی لگائے ہنس رہی تھی۔ وہ روز جی رہی تھی اور روز مر رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ آفتاب کی پسند کے کپڑے پہنے یا انہیں آگ لگائے۔ کسی نوکری کو حاصل کرنے کی کوشش کرے یا پردے میں بیٹھ جائے۔ آفتاب کے ساتھ جن جگہوں پر جاتی رہی ان مناظر کو کن آنکھوں سے دیکھے۔۔۔ عرصہ ہوا وہ تو اپنا دماغ استعمال کرنا چھوڑ چکی تھی۔ آفتاب کی آنکھوں سے دیکھتی، اس کے کانوں سے سنتی آ رہی تھی۔

جب اذیت پسندی کی انتہا پر پہنچتی تو چیخ چیخ کر رب سے سوال کرتی کہ اس کے دل میں میرے لیے نیکی ڈالی ہی کیوں تھی؟ اسے وحشی بنانا ہی تھا تو اسے مکمل درندہ بنا کر میری زندگی میں بھیجتے؟ وہ مجھے روند کر چلا جاتا مجھے کوئی ایسا دکھ دیتا کہ میں اسے بددعا دے سکتی۔ اے محبت تو نے مجھے ادھورا غم کیوں دیا؟ محبت تو نے مجھے بیچ راستے میں اکیلا کیوں چھوڑ دیا؟ محبت تو فاتح عالم تھی کیسے مجھے مفتوح بنا کر چھوڑ دیا؟ محبت تو نے کتبہ نفرت کے ملبوں پر لگانا تھا میرے زندہ وجود پر کیوں ٹھوک دیا؟ محبت تو اپنے ہونے کو ثابت کر۔۔۔ مجھے یوں نشان عبرت نہ بنا۔۔۔ محبت اور ظلم نہ ڈھا۔۔۔ بس کر محبت اب نہیں۔۔۔ محبت اب اور نہیں!

وہ سب کچھ داؤ پر لگا چکی تھی۔ دل واپس جانے کو چاہتا تھا۔ اگر واپس اس راستے پر جانا تھا تو صحیح طریقے سے جانا تھا۔ مزید کھلونا بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ دوسری طرف آفتاب جیسی بھی نیت کا مالک تھا عادی ہو چکا تھا۔ تین چار دن بعد ایک پیغام بھیج دیتا۔ کبھی مسڈ

کال آجاتی۔ یہ چھوٹے چھوٹے پیغام اور نہ اٹھانے والی کال ہی تھی جن کی بدولت پاکیزہ زندہ تھی۔ یہ احساس موجود تھا کہ وہ اکیلی نہیں تڑپ رہی، کہیں کوئی اور بھی بے سکون ہے۔ بے چینی حد سے سوا ہو جاتی تو پھر وہ اندازہ لگاتی کہ اگلا فون کب آنا ہے۔ فون کو پاس رکھتی اور جیسے ہی بجتا اٹھا لیتی۔ صرف آواز سننے سے ہی افاقہ ہو جاتا، اللہ سے اس سے دور جانے کی جتنی دعائیں مانگتی۔۔۔ اتنی کوششیں نہ کر سکتی!

"پاکیزہ کیسی ہو؟"

"میں بہت خوش ہوں۔" وہ زبردستی آواز میں کھنک پیدا کرنے کی کوشش کرتی۔

"تم میرے بغیر خوش نہیں رہ سکتی۔"

"ایسے بہت سے یقین مجھے بھی تمہاری ذات پر تھے۔ وہ ٹوٹ گئے تو کیا یہ نہیں ٹوٹ سکتے؟"

"نہیں ٹوٹ سکتے۔" وہ ابھی بھی پر یقین تھا۔

"یہ کیوں نہیں ٹوٹ سکتے؟"

"کیونکہ میں آفتاب ہوں میں طلوع ہوتا ہوں تو غروب بھی ہو سکتا ہوں لیکن تم پاکیزہ ہو اور تم عزہ ہو سکتی ہو اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

"بے تکی وضاحت! کبھی مجھے تم پر حیرت ہوتی ہے۔ تم کیسے مجھے فون کر لیتے ہو؟"

"بالکل ایسے ہی جیسے پہلے کرتا تھا۔"

"پہلے کی بات اور تھی آفتاب نور۔ اب میں تمھاری کچھ نہیں لگتی۔"

"بات وقت کی نہیں ہوتی۔ احساس کی ہوتی ہے۔ میرے دل میں تمھاری آج بھی ویسے ہی قدر ہے جیسی پہلے تھی۔"

"غلط بات مت کرو۔ بات احساس کی نہیں بات رشتے کی ہوتی ہے۔ میں تمہارے ساتھ اسی لیے تھی کہ ایک رشتہ تھا اب تو کوئی رشتہ نہیں رہا۔"

"پاکیزہ اگر تمھیں آنکھیں کھولنے کی توفیق ملے تو تمھیں پتہ چلے کہ رشتہ تو پہلے بھی نہیں تھا۔۔۔ محبت تھی! جس کے وجود سے تم اب انکاری ہو گئی ہو۔"

"تمہارے کہنے کا کیا مطلب ہے آفتاب؟ رشتہ نہیں تھا؟ رشتہ ہی تو تھا۔۔ رشتے کی وجہ سے ہی میں تم سے ملتی رہی، رشتے کی وجہ سے ہی میں تم پر اندھا اعتماد کرتی رہی۔"

"اپنے آپ سے پوچھو کیا وہ رشتہ سچا رشتہ تھا؟ اُس وقت مجھے بھی اپنی کم علمی میں یہی لگا کہ شاید ایسے نکاح ہو جاتا ہو لیکن آج ایک مولوی صاحب سے پوچھا تو انھوں نے اس نکاح کی سختی سے تردید کی۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم آفتاب؟ ایک کے بعد دوسرا اتنا بڑا دکھ نہ دو کہ میرا دل پھٹ جائے۔"

"پاگل لڑکی یہ دکھ نہیں ہے یہ خوشی ہے۔پہلے جو گناہ ہوا وہ بھول جاؤ۔آؤ نئی زندگی شروع کرتے ہیں۔"

"آفتاب جس امید پر میں اپنی زندگی گزار بیٹھی ہوں تم اسی امید کو جھوٹا کہہ رہے ہو؟ میں جسے عبادت سمجھ کر کرتی رہی تم نے اپنی کم علمی سے اسے میرے لیے گناہ ثابت کر دیا۔"

"دودھ پیتی بچی تو تم بھی نہیں تھی۔تم نے صرف میرے کہے پر اعتبار کیوں کیا؟خود بھی تحقیق کرتی ناں۔"

"آفتاب روز نئی باتیں لے کر نئے الزام لے کر کہاں سے آجاتے ہو؟ مجھے ایک دفعہ ہی آئینہ دکھا دو،میں روز اپنا ٹکڑوں میں گھناؤنا چہرہ دیکھ پاگل ہوتی جا رہی ہوں۔"

"نفسیاتی تو تم پہلے بھی تھی۔۔۔اب پاگل ہو رہی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے؟"

"نفسیاتی تھی تو اب رابطہ کیوں کرتے ہو؟"

"عادت ہو گئی ہے۔عادت ختم ہو جائے گی تو چھوڑ دوں گا۔"

"تم ایک دفعہ پھر میرے پاس مجھے چھوڑنے کے لیے آرہے ہو؟اس نکاح کو جھٹلا رہے ہو جو نکاح ہم دونوں کے تنہائی میں ملنے کی وجہ تھا۔"

"تم نے کہا تھا نکاح کی بنیادی شرط رضامندی ہے۔"

"ہاں لیکن اس کا سر عام اعلان بھی تو کرنا چاہیے۔نکاح کو خفیہ رکھنا جرم ہے۔اخفاء اس بات کی نشانی ہے کہ نکاح نہیں کیا گیا گناہ کیا گیا ہے جسے چھپایا جا رہا ہے۔"

"آفتاب میں نے تو چھپایا ہی نہیں۔جس سے زیادہ قریبی ہوئی ان کو بتایا بھی۔تم ہی کہتے تھے صحیح وقت آنے پر سب کو خود علم ہو جائے گا۔تم ہی محبت کی تشہیر سے بچتے تھے۔میں تو چاہتی تھی کہ سب کو معلوم ہو۔یہ جو میرا مذاق بنتے ہیں۔ہمارے درمیان کے معاملات سے واقف ہو جائیں۔تمہارے دوستوں کو بھی تو پتہ تھا۔"

"اور وہ ابھی تک اس بے وقوفی پر میرا مذاق اڑاتے ہیں۔وہ میری بے وقوفی تھی پاکیزہ وہ نکاح نہیں تھا۔ایسے نکاح ہوتا تو ساری دنیا کر لیتی نکاح۔یہ نکاح واقعی نکاح ہوتا تو اپنا آپ منوا لیتا۔"

پاکیزہ فون رکھ چکی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

جسم کی ٹھنڈی سی

تاریک سیہ قبر کے اندر

نہ کسی سانس کی آواز،نہ سسکی کوئی

نہ کوئی آہ، نہ جنبش، نہ ہی آہٹ کوئی

ایسے چُپ چاپ ہی مر جاتے ہیں کچھ لوگ یہاں

قصور کس کا تھا؟ قصور صرف اسی کا تھا۔ آفتاب جو کہتا گیا وہ یقین کرتی گئی۔۔۔ لڑکوں کا کیا ہے وہ تو کہتے رہتے ہیں۔ یقین لڑکوں کا نہیں کرنا چاہیے۔ آفتاب کو تو کہنے سے فرق نہیں پڑا تھا۔۔۔ پاکیزہ کو پڑا تھا! اسے ایک شخص کے لیے خود کو پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔ جب آفتاب اس سے کہہ رہا تھا کے تم لیٹے لیٹے تھک جاؤ گی تو میں تمہارے پاؤں بھی دباؤں گا تب پاکیزہ کو سننا نہیں چاہیے تھا، اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آفتاب کو سر نے چھڑی ماری تھی تو پاکیزہ کو دو جوس نہیں لینے چاہیے تھے۔ بار بار اس کی نشست کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ پاکیزہ کو حمزہ سے آفتاب کے گھر کا نمبر نہیں لینا چاہیے تھا۔ اگر نمبر لے لیا تھا تو اس پر فون نہیں کرنا چاہیے تھا پاکیزہ کو تسکین کی باتوں سے اپنی مرضی کے مطلب نہیں لینے چاہیے تھے۔ وہ اب تسکین کو الزام کیسے دے سکتی تھی؟ اس نے پہلے کب تسکین کی ہر بات سنی تھی جو اب ہر الزام تسکین پر رکھ کر بری الذمہ ہو جاتی۔۔۔ جو کیا تھا اس نے خود کیا تھا ۔کوئی دوسرا اس کے جسم میں داخل ہو کر اس کے اعضاء سے اپنی مرضی کا کام نہیں کروا سکتا تھا۔ اگر اس کے ماں باپ نہیں تھے اور اس کے دل کے اندر محرومیاں ہی محرومیاں تھیں تو تب بھی یہ اس کا اپنا قصور تھا کے وہ ان محرومیوں سے اپنی سمت خراب کر بیٹھی۔ اس کو کوئی حق نہیں تھا کہ محرومیوں کا ازالہ کرنے کے لیے کوئی بھی راستہ چن لے۔ لڑکیوں کا کیا ہے؟ وہ تو بلاتے رہتے ہیں بہکاتے رہتے ہیں۔ وہ لڑکی تھی اسے ثابت قدم رہنا تھا۔ اس کے بستے سے جب 'ہاکس' اکیڈمی کے نوٹس نکلے تھے تو اسے واپس کر دینے چاہیے تھے۔ اس مہربانی سے دل میں نرم گوشہ پیدا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ رویا تھا تو ہر شے پاکیزہ کے لیے کیوں ساکت ہوئی تھی؟ کیا کوئی بھی رو کر اپنی ٹھیک غلط بات منوا سکتا ہے؟ کیا رونا بہترین ہتھیار ہے؟ کیا صرف رونا کافی ہے؟ کسی پر یقین کرنے کے لیے اس کے آنسو کافی ہیں؟ آنسو تو کسی بھی بات پر آ سکتے ہیں۔۔۔ جب کوئی اور رشتہ جوڑنے کی ضرورت نہیں تھی تو دوستی کیوں کی؟ دوستی بھی تو رشتہ ہے۔۔۔ لڑکے لڑکی کی دوستی تو تباہی کا دہانہ ہے پاکیزہ نے صرف ایک ''اُن'' کہنے سے سمجھ لیا کہ وہ عزت کرتا ہے۔۔۔ عزت ایسے کی جاتی ہے؟

پاکیزہ کی سب سے بڑی غلطی تو یہ تھی کہ وہ خود کو کسی افسانے کی ہیروئن سمجھتی رہی۔ وہ سمجھ رہی تھی جو کچھ اس کے ساتھ ہو رہا ہے وہ آج سے پہلے کبھی کسی کے ساتھ نہیں ہوا۔ جتنی محبتیں آفتاب نچھاور کر رہا ہے ویسے کوئی کسی پر نہیں کرتا۔ یہی اس کی غلطی تھی! خوشنما لفظ اور خوبصورت وعدے دھوکہ ہیں یہ ہر لڑکی کو خوشبودار پھولوں کی صورت دیئے جاتے ہیں۔ لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ یہ خوشبو صرف ان کے لیے ہے حالانکہ خوشبو کو بھی کبھی قید کیا جا سکتا ہے۔

آفتاب چالیس منٹ تک اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا رہا تھا تو یہ پاکیزہ کی اپنی دہ ہوئی شہ تھی۔ اسے آواز بلند کرنی چاہیے تھی۔ وہ اوپر سے سمجھدار بنتی تھی۔۔۔ اندر سے بے وقوف تھی۔۔۔ ازلی بے وقوف تھی! ہر لڑکی کی طرح اس کا باہر کا خول ہی بس پکا تھا، اندر چڑیا

جتنا دل تھا۔جب آفتاب نے ہاتھ پکڑا تھا تو پاکیزہ کو خاموش نہیں رہنا چاہیے تھا۔ایک تھپڑ کھینچ کر اس کے منہ پر مارنا چاہیے تھا۔ اسٹینڈ اس نے لینا تھا اگر اس نے اسٹینڈ نہیں لیا تھا تو اسے کوئی حق نہیں تھا کہ حالات پر سارا ملبہ گرائے، آپ کو کوئی کھڑا نہیں کرتا ۔۔۔لوگ صرف دھکا دیتے ہیں۔کھڑا تو خود ہونا پڑتا ہے۔آفتاب اسے دھکا دیتا رہا تھا اور وہ گرتی رہی تھی اس نے کبھی اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

لڑکوں کا کچھ نہیں جاتا لڑکیوں کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔پاکیزہ نے اس بات کو بہت بار سنا تھا لیکن خود پر بن پڑی تو اسی بات کو سمجھ نہ سکی۔اللہ نے اگر اسے ماں نہیں دی تھی تو اسے صبر کرنا تھا۔اسے اس گھر سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں تھی جس میں ماں رہتی ہے۔جب آفتاب کیک کی کریم انگلی پر لگا کر اس کے گال پر لگا رہا تھا تب پاکیزہ کو آنکھیں میچنی نہیں چاہیے تھی آنکھیں کھولنی چاہیے تھی اور وہ انگلی ہی توڑ دینی چاہیے تھی۔اگر آفتاب نے گرم گرم چائے پی لی تھی تو کوئی بڑا کام نہیں کیا تھا۔۔۔اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔وہ زہر بھی پی لیتا تو پاکیزہ پر اثر نہیں ہونا چاہیے تھا۔آج اثر لے کر وہ کہاں بیٹھی تھی وہ یہ سن کر بیٹھی تھی کہ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں اتنا احساس ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اسے کہہ چکا تھا میرا تھوکا چاٹنے والی میرے آگے بولتی ہے۔

حساس ہونا یا نہ ہونا انسان کے ہاتھ میں نہیں ہوتا اپنے احساسات کا اظہار انسان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔اسے اپنی حساسیت کو کمزوری ثابت نہیں ہونے دینا تھا لیکن اب۔۔۔اب کیا ہو سکتا تھا؟اب تو زندگی بے مقصد ہو گئی تھی اب تو زندگی کے ہونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا وہ مرنا چاہتی تھی۔

نیند کے جھونکے قریب سے بھی نہیں گزر رہے تھے اگر کچھ قریب تھا تو افسوس۔۔۔!اگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تو کوئی ارادتاً اسے دیکھنے اس کے سکول کے باہر آئے تو وہ اپنے پاؤں پر چل کر آفتاب سے ملنے کیسے جاتی رہی؟اگر وہ اس کے سامنے کھڑا گولیاں نگل رہا تھا تو نگلتا رہتا۔وہ مدر ٹریسا نہیں تھی۔اسے کوئی ضرورت نہیں تھی اس کا بازو تھام کر اسے سنک تک لے جائے۔

"آفتاب نور"

پاکیزہ نے دوبارہ فون کیا تھا۔نام نہاد طلاق کے بعد یہ پہلا فون تھا جو پاکیزہ نے کیا تھا۔کچھ تھا جو اس سے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔کچھ تھا جو اس کے اندر لاوے کی طرح اچھال چھکا بنا ہوا تھا۔

"ہاں بولو پاکیزہ آگئی یاد؟"آفتاب کا انداز استہزائیہ تھا بالکل ویسا جیسی پاکیزہ کو امید تھی۔

"ہاں آفتاب نور مجھے یاد آگئی۔مجھے یاد آگئی کہ اگر پہلے میں تمہارے ہاتھ کا کھلونا بنی تو صرف اس وجہ سے کہ مجھے تمہارے مسلسل پیچھے نے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔جب میں نے تم سے ثبوت مانگے تو تم نے اسلام کے احکامات کو محبت کی پیکنگ میں پیک کر کے پیش کیا۔ہاں یہ میری غلطی تھی کہ میں نے تم پر یقین کیا۔مجھے خود تحقیق کرنی چاہیے تھی!مجھے دیکھنا چاہیے تھا کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط۔بھٹکنے والا راستہ میں نے خود منتخب کیا۔یہ میرا تحقیق نہ کرنا ہی تھا جس نے میری عبادت کو گناہ بنا دیا۔میرے نو سال مجھ سے

چھین لیے۔ یہ میری غلطی تھی کہ جب کسی نے مجھ سے نمازوں کی قسم اٹھانے کو کہا تو میں اٹھا بیٹھی اور پھر تمہاری محبت۔۔ تمھاری اندھی محبت میں اُس قسم کو بھی ارزاں سمجھ کر توڑ دیا۔ میں نے اپنی جان پر خود ظلم کیا لیکن اب مجھے یاد آگیا ہے کہ میری جان میری اپنی ہے۔ میں جو ضائع کر چکی سو کر چکی۔ محبت کے نام پر اب مزید عزت داؤ پر نہیں لگاؤں گی۔ مجھے یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں کہ میرا تم سے تعلق بحال ہو سکتا ہے یا نہیں لیکن یہ جاننے کے بعد کہ تم اسلام کی سب ہی باتوں کو اپنے پیدا کرنے والے کے احکامات کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر سکتے ہو میں تم سے مزید کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔ ایسا شخص جسے اللہ تعالیٰ کے قانون سے ڈر نہیں لگتا اسے اللہ کے کلام نے کیا بدلنا ہے۔ میں تمھاری عادتیں تبدیل کر سکوں یا نہ کر سکوں تمھاری فطرت نہیں بدل سکتی۔ تم نے محبت کو مذاق سمجھا، عزت کو ارزاں جانا۔ مجھے قصہ کہانی بنایا پھر میں کیسے امید کروں کہ ہماری داستان امر ہو گی؟

ایسا کام جو دو زندگیوں سے متعلقہ ہو وہ دونوں کی باہم رضامندی مانگتا ہے۔ میں خود کو رضامندی کی انتہا تک لے جا کر دیکھ چکی ہوں لیکن تمھارے اندر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اب میں تمہیں مزید رضامندی کی طرف لانا بھی نہیں چاہتی۔ لیکن اگر دو میں سے ایک کو بدلنا ہی ہے تو اب میں بدلوں گی۔ اس دن تم نے مجھے طلاق دی تھی آج میں تمھیں اپنی زندگی سے بدر کرتی ہوں۔ جاؤ اس بھری دنیا میں آزاد ہو تم۔ چاہو تو پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرو یا سمندر کی تہہ میں اتر جاؤ۔ میں اپنی سچی محبت کا اکلوتا خزانہ تمہیں دے کر آج تم سے چھین لینے کا دعویٰ کرتی ہوں۔ اب تم کہیں بھی سر پٹخو خزانہ تو دور کی بات آفتاب نور تمھیں سکون بھی نہیں ملے گا۔ میری طرف سے تمہارے لیے انکار ہے۔ انکار سمجھتے ہو تم؟ انکار کا درد جانتے ہو؟ ہونہہ! کاش کوئی زہریلی گفتگو تمہاری بھی سماعتوں سے اتری ہوتی تو تمھیں معلوم ہوتا کہ ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بلانے والا جب پیچھے دھکیلتا ہے تو قدم کتنی بری طرح لڑکھڑاتے ہیں، دل کی کرچیاں کتنی ہوتی ہیں اور راتوں کا آسیب کیسے جینا دوبھر کر دیتا ہے؟ تم کیا جانو آفتاب نور جس درد کی میں بات کر رہی ہوں تم اس کی دال سے بھی واقف نہیں لیکن اب ہو گے۔۔۔ اب ضرور ہو گے! پاکیزہ نے آج تمھیں اپنی زندگی، اپنے وجود، اپنی محبت، اپنے حصار، اپنی ذات کے بندھن، تمہارے ساتھ گزارے لمحوں اور شدتوں سب سے آزاد کیا۔ جاؤ آفتاب نور میں نے تمھیں آزاد کیا''۔ وہ ضبط کی آخری انتہاؤں پر تھی۔ خزاں کے موسم نے پیڑ بے رونق کر دیئے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے آج خوابوں نے اس کی دہلیز سے منہ موڑا تھا۔

"تمھیں اپنی لفاظی پر خود ہنسی نہیں آتی؟ کیسی بہکی بہکی باتیں کرتی ہو؟ نفسیاتی مریضہ ہو؟ میری مانو یہ محبت وحبت کچھ بھی نہیں۔ چار دن کی زندگی ہے اچھے دوستوں کی طرح گزار لو۔'' وہ کہہ رہا تھا جب اسے جواب نہ ملا تو کان سے ہٹا کر فون کو دیکھا۔ فون کب کا بند ہو چکا تھا۔

ہواؤں نے نے رخ بدلا۔۔۔ موسم شاید بدلنے والا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ کون باغ میں خنجر بدست پھرتا ہے

یہ کس کے خوف سے چہرہ بدل رہی ہے ہوا

پاکیزہ کہانی ختم کر چکی تھی۔ اس کے خیال میں جو نو سالہ تکلیف کا دور تھا وہ اپنے اختتام کو پہنچا تھا۔ آفتاب نور کے دونوں نمبر بلاک لسٹ میں ڈال کر وہ پر سکون ہو گئی تھی۔ اپنا نمبر تبدیل کرنے کا خیال تو آتا لیکن مردہ محبت کے مرجھائے ہوئے پھول اپنی خوشبو تاحال مقید کیے بیٹھے تھے۔ وہ آفتاب نور سے جھوٹ بول سکتی تھی کہ وہ اس سے پیار نہیں کرتی۔ لیکن پیار تو اس نے کیا ہی کب تھا؟ یہ بدبخت پیار تو اسے ہوا تھا۔ اب اس کی قبر ہمیشہ اس کے دل میں رہنی تھی بالکل ایسے ہی جیسے کانٹیکٹس میں موجود آفتاب نور کے بلاکڈ نمبر تھے۔

ایم ایس میں تھیسس شروع ہو چکا تھا۔ وہ مکمل طور پر مصروف تھی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ وہ ریجیکشن کی تہمت ماتھے پر لگا کر بکاؤ مال بن جائے لیکن مسئلہ روز اوّل والا تھا وہ عام لڑکی نہیں تھی۔ جس طرح کوئی بھی لڑکی عام نہیں ہوتی وہ بھی عام نہیں تھی۔ زندگی کے اس مقام پر اسے اس کی محبت نے خاص بنایا تھا۔ محبت اگر اس کو غلط راستوں پر دل کی مرضی کے شخص کے ساتھ جانے نہیں دے سکتی تھی تو محبت کو صحیح شخص کہاں نظر آتا تھا۔ محبت کی بازگشت سے بچنے کے لیے اس نے خود کو بے حد مصروف کر لیا۔

وہ سوچتی میں عام سی لڑکی نہیں تھی کہ کسی کے ساتھ کہیں بھی چلی جاتی۔ میں بے وقوف بھی نہیں تھی کہ لچھے دار باتوں میں آجاتی۔ میں تو بہت سمجھدار تھی۔ مجھے تو اپنی عقلمندی پر بہت زعم تھا۔ یہ زعم یہ ناز سب ناک کے راستے نکلتا ہے۔ آزمائش جب سر پر آتی ہے تو ہوش نہیں رہتا۔ مجھے ہوش نہیں رہا۔ میں سمجھدار ہو کر بھی عام سی حرکت کر بیٹھی۔ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی اس کی فرمائشوں پر لبیک کہتی گئی۔ میں مانتی ہوں مجھ سے غلطی ہوئی۔ غلطی نہیں شاید گناہ کہنا چاہیے۔ میرا یہ اعتراف کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میری غلطی نے بھی تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ بس اتنا ہوا ہے کہ میں آدھی رہ گئی ہوں۔ میں نامکمل ہو گئی ہوں۔ کسی بھی کام کو پوری توجہ سے نہیں کر سکتی۔ بات کرتے کرتے بات بھول جاتی ہے۔ سوتے سوتے آنکھ کھل جاتی ہے۔ سکون کی تلاش میں جتنا آنکھوں کو موندے اپنے اندر کو کھوجتی ہوں اتنی بے چینی سے ملاقات ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی غلطیوں سے دنیا میں کچھ نہیں بدلتا۔ بس دل کی دنیا بدل جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ خالی اور ویران ہو جاتی ہے۔ کیسی ہی بہار دستک کیوں نہ دے، کتنے ہی پھول کیوں نہ کھلیں، سچی مسکراہٹ ہونٹوں پر نہیں اترتی۔ کبھی نہیں اترتی!

ایم ایس کے ساتھ ساتھ ایک این جی او بھی جوائن کر لی جو خواتین کے حقوق کے لیے کام کرتی تھی۔ اب وہ تب گھر داخل ہوتی جب اس کا جوڑ جوڑ دکھنے لگتا اور آنکھیں بند ہونے کو بہانہ مانگتیں۔ ساری رات تکیہ بھگوتی اور صبح دھنسی ہوئی آنکھیں لیے دماغ اور جسم کو ایک دفعہ پھر سے تھکانے لگ جاتی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ بنجر ہے۔ وہ جان گئی تھی کہ محبت کا اس سے اب کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ محبت نے جتنی تباہی پھیرنی تھی پھیر چکی ہے۔ وہ محبت کے مرجھائے پھول یادوں میں لیے رکھتی اور اپنی کبھی نہ رنگ

پا سکنے والی بے رنگ دنیا کے مناظر کو دھندلا کرتی رہتی۔ ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ یہ سارا ٹھہراؤ اس دن رخصت ہوا جس دن رات کے دو بجے اس کے فون نے وائبریٹ کیا۔ سکرین ان لاک کر کے وہ واٹس ایپ میں جیسے ہی گئی اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

محبت کے مردہ پھول چرمرا کر رہ گئے اور ٹھہراؤ میں طوفان آ گیا۔ یہ ایک واحد چیز تھی جو اس نے نہیں سوچی تھی۔ اس کے خیال میں سب ہو سکتا تھا بس یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی صورت نہیں ہو سکتا تھا۔ ناممکنات میں سے ایک امکان حقیقت کا روپ دھارے اسے ڈنگ مارنے کو بے قرار تھا۔ گھٹی گھٹی سی چیخ اس کے گلے سے نکلی جسے اس نے اپنے منہ میں اپنا ہی دوپٹہ دے کر روکنے کی سعی کی۔

چاند آج ماتم کر رہا تھا۔ جانے چاند کا زمین میں بسنے والوں سے کیسا تعلق ہے۔ جیسی آنکھیں اسے دیکھتی ہیں ویسا آئینہ بن جاتا ہے۔ کبھی خوش، کبھی اداس اور کبھی ماتمی۔۔۔ افسوس کی چاندنی نے اپنے پر پاکیزہ کے کمرے کی کھڑکی تک پھیلائے ہوئے تھے اور اندھیرا مسلسل بڑھ رہا تھا۔

وہ انتہائی قابلِ اعتراض ویڈیو تھی جو پاکیزہ کے موبائل پر بھیجی گئی تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اس ویڈیو میں کوئی اور نہیں خود پاکیزہ تھی۔ وہ لمحات جو کبھی پاکیزہ کی محبت کے شاہد تھے اب سانپ بنے پاکیزہ کو ڈس رہے تھے۔

پاکیزہ آفتاب کے کان کی لُو کو انگلی سے چھو رہی تھی۔ وہ اُس کے خوبصورت ہاتھوں پر مہرِ محبت ثبت کر رہی تھی۔ وہ اُس کے پیروں پر سر رکھ رہی تھی۔ وہ اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہ محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے دوپٹے سے بے نیاز تھی۔ کتنی حیرت کی بات تھی۔۔۔ پاکیزہ ان پیروں کو، اس کان کی لُو کو، ان بالوں اور ان ہاتھوں کو کروڑوں میں بھی پہچان سکتی تھی لیکن ان ویڈیوز میں وہ شخص خود نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف پاکیزہ نظر آ رہی تھی۔ پاکیزہ کا دِل پھٹنے والا تھا۔

آفتاب نے جب اسے کہا تھا ''مجھے تمہیں دیکھے بغیر نیند نہیں آتی میرا دل کرتا ہے کہ تمہاری ویڈیو بنالوں تاکہ تم سے ملنے کے بعد گھر جا کر تمہیں دیکھ کر سکون سے سو تو سکوں۔''

جواب میں پاکیزہ نے کہا تھا ''جانِ پاکیزہ آپ کو اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔''

تب آفتاب کی مغرور مُسکراہٹ پر وہ دل و جان سے صدقے واری گئی تھی۔ اب دل چاہتا تھا کہ ان ویڈیوز میں جا گھسے اُس شخص کو بھی دیکھے جو اُس وقت محبت کا خراج وصول کر رہا تھا۔ کتنی اندھی تھی پاکیزہ؟ وہ محبت محبت کہہ کر اپنی ہوس پوری کرتا رہا۔ ضرورت پوری کرنے کو ویڈیوز بناتا رہا اور پاکیزہ اسے اجازت دیتی رہی۔ اتنا اندھا یقین تھا کہ ایک دفعہ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ ویڈیوز دیکھ لے۔

آج وہ کہاں کھڑی تھی؟ اپنے کمرے میں اپنے بستر پر چادر اوڑھے لیٹے ہوئے بھرے بازار میں ننگی ہو گئی تھی۔ ایسے ہی تو نہیں کہتے لڑکیوں کی عزت کانچ سی نازک ہوتی ہے۔ ایک دراڑ بھی پڑے تو نظر آ جاتی ہے۔ یہاں تو سارا کانچ ہی ٹوٹا ہوا تھا۔ آج وہ رونا چاہتی

تھی اُسے رونا نہیں آرہا تھا۔ اسے وہ داغ مل گیا تھا جو اسے درکار تھا، آفتاب نے اپنی اصل او قات دکھادی تھی وہ انتہا تک چلا گیا تھا۔

پاکیزہ نے محبت کی انتہا کی تھی اور اس نے او قات دکھانے کی۔۔۔!

پاکیزہ نے ویڈیوز فوراََ ڈیلیٹ کی لیکن اب تصویریں آرہی تھیں دھڑا دھڑ تصویریں۔۔ سب کی سب پاکیزہ کی۔۔ ایک سے ایک عجیب۔ وہی تصویریں جو بھیجتے ہوئے قابلِ اعتراض نہ لگی تھیں اب واپس ملی تو کالک سی محسوس ہونے لگی۔ پاکیزہ کے ذہن میں سوشل میڈیا پر وائرل ہوئی بہت سی لڑکیوں کی تصاویر گھوم گئیں جن پر لاکھوں لوگوں کے نازیبا کمنٹس آتے رہتے تھے۔ کیا وہ بھی اُن میں سے ایک بن جائے گی؟

اس کے ذہن میں بہت سی خبریں گھوم گئیں جو اکثر لوگ چسکے لے کر سُنایا کرتے تھے۔

مشہور یونیورسٹی کی گولڈ میڈلسٹ نے چوتھی منزل سے کود کر جان دے دی۔

فلاں کی بہن پنکھے کے ساتھ پھندا لگا کر مر گئی۔

لڑکی نے اپنے باپ کے پستول سے خودکُشی کرلی۔

کم عمر لڑکی گولیاں نگل کر اس جہانِ فانی سے رُخصت ہوگئی۔

کیا وہ بھی خبر بننے والی تھی؟

اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی؟ اُس نے تلخی سے سوچا۔

"بڑی آئی دنیا میں نام بنانے والی۔۔۔ بڑی آئی بڑی بڑی باتیں کرنے والی۔۔ جب مرد کے پیچھے چلی ہو۔۔۔ اپنا راہبر آج کے زمانے کی محبت کو بنایا تھا تو پھر انجام بھی سہو۔۔۔ اپنے ہاتھوں کی کرنی بھی خود بھگتو۔ لوگ تمہیں یاد رکھیں گے ضرور یاد رکھیں گے لیکن تمہاری پہچان کیا ہوگی؟ اکیلے کمرے میں ملنے والی، نت نئی گاڑیوں میں بیٹھنے والی، چند سو کی گھڑی کے عوض بکنے والی، گندی تصاویر پھیلانے والی، فحاشی پھیلانے والی، ناجائز تعلقات رکھنے والی۔۔۔ لوگ ایسے لوگوں کو بھی یاد رکھتے ہیں اور ان پر تھوکتے ہیں۔ تمہیں دھتکارنے کے لیے یاد رکھا جائے گا۔ پاکیزہ تم نے اپنے نام کی لاج تور کھ لی ہوتی۔" وہ خود سے نفرت کررہی تھی۔ زہر خند خود کلامی جاری تھی، جب اگلے میسج نے چونکا دیا تھا۔

"میرے نمبر ابھی اَن بلاک کرو۔" وہ دیکھ چکا تھا کہ سارے میسج پڑھے جاچکے ہیں، بڑے آرام سے حکم بھیج رہا تھا۔

پاکیزہ کے پاس اور کیا چارہ تھا؟ کوئی بھی چارہ نہیں تھا۔ وہ شخص جو حساب رکھتا تھا کہ پاکیزہ نے مہینے کی کس تاریخ کو بیلنس ڈلوایا تھا اپنے معاملات میں کتنا بااختیار تھا۔ اس کے پاس موجود سم یا موبائل کی تعداد کیا ہے آج پاکیزہ جاننے کا دعوٰی نہیں کرسکتی تھی۔

"تمہیں مجھ سے ملنا ہوگا ہر صورت ورنہ تمہاری تصویریں گلی میں آویزاں ہوں گی۔" یہ وہی آفتاب تھا جس کی آنکھ کے اشارے پر پاکیزہ نے اپنے گھر کی دہلیز چھوڑی تھی، اپنی ذات کے اصول توڑے تھے۔

"اگر اپنی اور اپنے مرے ہوئے والدین کی عزت سلامت چاہتی ہو تو میں جب اور جہاں کہوں ملنے آ جانا۔" وہ مشورہ نہیں دے رہا تھا، فیصلہ سنا رہا تھا۔

پاکیزہ کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اگر وہ کر دیتا جو وہ کہہ رہا تھا تو پھر پاکیزہ کیا کرتی، پاکیزہ کم از کم پاکیزہ نہ رہتی۔ اس کی بنجر آنکھیں پھر آباد ہوئی تھی، وہ سچ میں آباد تھی۔ اس دفعہ آنکھوں کو آباد کرنے والی وحشت تھی۔ ایک بے نام سا خوف تھا۔ ہلکی سی آہٹ پر دل پوری جان سے کانپ جاتا۔ وہ کچھ نہیں کر رہی تھی صرف منتیں کر رہی تھی۔

"پلیز ایسے نہیں کرو۔ تم تو مجھ سے پیار کرتے تھے ناں۔ میں تم سے آج بھی پیار کرتی ہوں۔ تمہیں اللہ کا واسطہ ہے میری زندگی برباد نہ کرو۔"

"اچھا پیار کرتی ہو؟ اس دن تو پتا نہیں کس کس شے سے مجھے آزاد کر دیا تھا اور آج پیار کرتی ہو۔۔۔ واہ!"

"آفتاب پلیز مجھے ایسے برباد نہ کرو۔"

"میں تمہیں برباد نہیں کر رہا۔ تم پہلے کی طرح مجھ سے ملتی رہو۔ میں اپنی حدود سے باہر نہیں نکلوں گا۔ جہاں تک آخری مرتبہ تمہیں چھوا تھا بس وہیں تک۔۔۔"

"آفتاب نہ گندا کرو خود کو۔ مجھے نہ گندا کرو۔ تم ایسے نہیں تھے تم ایسے نہیں ہو سکتے۔" وہ باقاعدہ رو پڑی تھی۔

"تم بھی تو میری جان ایسی نہیں تھی۔ چپ چاپ میری مان لو۔ میں بھی پہلے کی خاموش محبت کرتا رہوں گا۔"

"آفتاب مجھے گندی لڑکی نہ بناؤ۔ تم پر خدا کا قہر نازل ہو گا۔"

"بیچ عورت پھر مجھے بد دعائیں دے رہی ہے۔؟ میں نے تجھے کوئی گالی نہیں دی خود کو خود ہی گالیاں دے کر میرا دماغ نہ خراب کر۔ جب تجھ سے کہوں گا مجھ سے ملنے آ جانا ورنہ تیری سات نشتیں یاد رکھیں گی کہ تو نے میری نافرمانی کی ہے۔"

"آفتاب! آفتاب!" وہ پکارتی رہ گئی اور وہ فون بند کر چکا تھا۔ آج کا رونا صحیح معنوں میں رونا تھا۔ محبت وجبت ڈھکوسلہ ہے آج پاکیزہ کو یقین آ گیا۔

اس دنیا میں ہم جتنی بھی دنیائیں بناتے ہیں وہ اسی دنیا سے جڑی ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی طور وہ مکمل تصویر میں اپنا کردار ضرور نبھاتی ہیں۔ آج پاکیزہ کی دنیا بھی جب بڑی دنیا میں نظر آئی تو پاکیزہ کا ہی دل چاہا کہ وہ منظر سے غائب ہو جائے لیکن ایک یہی تو معجزہ ہے جو کسی پیغمبر کو اللہ نے اس کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ انسان کو ہر صورت میں اپنا لکھا پڑھنا ہے، اپنا بویا کاٹنا ہے، اپنے کیے پر پچھتانا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

پرندے سہمے ہیں درخت خوف زدہ

یہ کس ارادے سے گھر سے نکل رہی ہے ہوا

پہلے کی طرح ملنا ہوتا تو وہ خوب بن سنور کر جاتی۔ آفتاب کو وہ ویسے بھی سادگی میں بھاتی تھی۔ لیکن اچھا جوڑا پہننا، سلیقے سے بال باندھنا اور آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیر کھینچنا پاکیزہ کے لیے سنگھار سے کم نہیں تھا، ہر دفعہ محبت کے بلانے پر وہ گئی تھی۔ آج وہ عزت داؤ پر رکھ کر اسے بلا رہا تھا، وہ صرف ارزاں نہیں ہوئی تھی بلکہ نام نہاد محبت کے لیے بک گئی تھی۔ دل کرتا تھا کہ اپنے پاؤں کاٹ لے، بھلا ایک شریف زادی کے پیر ایسے کسی راستے پر کیسے قدم رکھ سکتے ہیں۔ کیا میں ضرورت کا نشانہ بن جانے والی غیر ضروری شے ہوں؟ میں پاکیزہ جس نے ایسی محبت سے اپنے نام کو کافی حوالہ بنای کہ وہ اس لیے ہوں کہ ایک آفتاب جس سے ایک دفعہ میں امتحان پاس نہیں ہوتا وہ اپنی انگلیوں کے اشارے پر مجھے نچائے؟ پاکیزہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ساری دنیا کو تہس نہس کر دے۔ وہ اس دنیا کو آگ لگا دے جس میں وہ آفتاب نور سے ملی۔ آفتاب تو پھر آفتاب ہی نکلا۔۔۔ جھلسا کر رکھ دیا اور پل بھر کے لیے بھی رحم نہ آیا! پاکیزہ صرف سوچ سکتی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ وقت بھی آ گیا جب وہ کٹھ پتلی اُس کے سامنے بیٹھی تھی۔

"میں تم سے پیار کرتا ہوں۔" وہ بالوں میں انگلیاں چلاتے جال پھینک رہا تھا، دام میں آئی چڑیا اس جال کی بدبو سے واقف تھی لیکن کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

آنے سے پہلے پاکیزہ نے کتنا سوچا تھا کہ وہ آفتاب نور کے بڑھنے والے ہاتھ کاٹ دے گی۔ کوئی خنجر لے کر اپنے پیٹ پر وار کرے گی اور موت کا الزام آفتاب کے سر پر دھر جائے گی۔ زہر کی چڑیا کسی بہانے اس قاتل کو چٹا دے گئی جس نے اس کے ارمانوں کا خون بہایا، لیکن وہ اس سب میں سے کچھ نہ کر سکی، کچھ بھی نہیں!

وجہ وہی کہ وہ ایک لڑکی تھی، اسی دنیا میں رہتی تھی، اسی معاشرے کا حصہ تھی، جسے مردوں کا معاشرہ کہا جاتا ہے۔ قصور چاہے آفتاب کا ہو، دو لاشوں میں سے زیادہ بدنامی اس لاش کے لواحقین کی ہوتی ہے جو لڑکی کی ہو، کوئی سکھ تو پاکیزہ نے پھپھو کو دیا نہیں تھا، اب ڈھلتی عمر میں یہ دکھ بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔

"آفتاب اللہ کا واسطہ ہے مجھ پر رحم کرو۔" خود کو استعمال ہونے دینے کی ذلت آنسو بن کر بہہ پڑی۔

"تمہیں لگتا ہے مجھے تمہارے رونے سے فرق پڑے گا تو اور رو لو"۔ وہ خباثت کی انتہا پر تھا، دِست درازی بڑھ رہی تھی، پہلے اسی دست درازی پاکیزہ کو دیوانگی سمجھتی تھی، آج حیوانیت محسوس ہو رہی تھی۔

"آفتاب پلیز نہیں ناں، ایسے نہیں کرو۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

"اگر ایسے روؤں گی تو کل پھر بلاؤں گا، روز بلاؤں گا۔" وہ قطعی پن سے بولا۔

پاکیزہ نے بامشکل اپنی سسکی قابو کی۔ وہ حد سے بڑھ رہا تھا۔ دیوانہ ہو رہا تھا۔

"آفتاب بس پلیز بس۔ تمہارے گھر بھی بیٹیاں ہیں۔ تمہارے بھائی کی بچیاں، بہن کی بیٹی۔۔ میرے ساتھ یہ سلوک نہ کرو۔" نجانے کیسے اس کی زبان کھلی تھی۔

"چٹاخ" ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے کنول چہرے کو داغدار کر گیا۔ پانچ انگلیاں ثبت ہوئی اس کے بعد بھی ہاتھ نہ رُکے وہ اپنی مرضی سے سفر طے کرتے رہے۔ وہ اپنی عادت کے مطابق سب کچھ کر چکا تھا لیکن یہ بھی ایک کڑوا سچ تھا کہ آخری حد اب بھی نہیں توڑی تھی۔

روتی ہوئی پاکیزہ کی آنکھوں میں سوال تھا "اتنے ہی وحشی ہو تو آخری حد کیوں نہیں پھلانگتے؟"

پاکیزہ کو بس سٹاپ پر چھوڑتے ہوئے اس نے بڑی سرد مہری سے جواب دیا تھا۔

"میں اپنے خلاف کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا۔"

پاکیزہ دنگ رہ گئی۔ پاکیزہ جسے محبت کی پاکیزگی سمجھتی رہی وہ عیاری کی انتہا تھی۔ اُف! یہ شخص میرے ساتھ تب سے کھیل رہا تھا میں جب سے اس سے محبت کر رہی تھی، چلنا دوبھر ہوا تھا۔ وہ بس کے بجائے ٹیکسی کو ہاتھ دے کر اس میں بیٹھ گئی، سٹاپ پر بہت سے چہرے گھور رہے تھے۔ آج پاکیزہ کو پتہ چلا تھا کہ دیکھتے تو سب ہیں لیکن محبت ہمیں اتنا اندھا کر دیتی ہے کہ ہمیں لوگوں کا دیکھنا بھی دکھائی نہیں دیتا۔

پاکیزہ اب مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی آج سے پہلے تک اُسے اپنا آپ مظلوم نظر آرہا تھا لیکن اب ماضی کے آئینے میں اپنا کردار بھی واضح ہو چلا تھا۔ اس نے خود کہاں کہاں بے وقوفی کی تھی سب یاد آرہا تھا۔ آج وہ مان رہی تھی کہ لڑکی بڑھاوا نہ دے تو لڑکے کو شہہ نہیں ملتی۔

میں نے خود آفتاب کو کہا تھا کہ کل کسی اور کے پیچھے مجھے چھوڑ دو گے۔ اتنی عقل کی بات منہ سے تو کہہ دی لیکن دماغ کی اتنی کچی نکلی کہ اپنی کہی بات پر خود ہی یقین نہ رکھا۔ جو آفتاب تیز روشنی سے کمرہ جماعت میں داخل ہو کر کچھ دیکھ نہیں پاتا تھا وہ اگر کسی لمحے سچی محبت میں غلطی سے مبتلا ہو بھی گیا تھا تو کیا دنیا کی چکا چوند اس کی آنکھیں خیرہ نہیں کر سکتی تھی؟ ایک اعتبار کی کمی کا شکار لڑکے سے میں نے کیسے رشتہ مانگنے کا سوچ لیا؟ میں نے کہا تھا کہ میں کسی بے عزت کر کے رکھ دینے والے تعلق کا ساتھ لے کر نہیں جی سکتی پھر اس وقت ہی کیوں نہ چھوڑ دیا اس کو جس دن وہ فون کال پر جھوٹا ثابت ہوا۔ جس دن اس نے مجھے منزل نہیں بلکہ اپنی کئی راستوں میں سے راستہ کہا۔

میں جانتی تھی کہ رشتے ہمیشہ سابقہ کا کارڈ گلے میں لٹکا کر سامنے کھڑے ملتے ہیں تو پھر میں کیوں نہ ڈری کہ اگر کل کو آفتاب نے مجھے نہ اپنایا تو وہ میرا "آشنا" کہلائے گا۔ کسی لڑکی کے لیے آشنا کا ہونا معتبر حوالہ نہیں، میں نے خود کو معتبر کیوں نہ رہنے دیا۔

آفتاب نے مجھے ایک دفعہ کہا تھا کہ جو جل نہیں سکتے وہ پگھل جاتے ہیں۔ میں کیوں نہیں سمجھتی وہ مجھے خاکستر کرنا چاہتا ہے یا پھر میرا روپ بدلنا چاہتا ہے۔ وہ مجھے موم بھی کر سکتا تھا۔ مجھ سے صرف دوستی رکھ کر بھی اتنا عرصہ رابطے میں رہ سکتا تھا لیکن نہیں پہلے میں پگھلی اور آخر میں اس نے مجھے خاکستر کر دیا اس نے مجھے جلا دیا۔ غلطی اس کی نہیں میری ہے، کسی کا کلاس فیلو ہونا اس کی سچائی کی

بڑی دلیل نہیں ہے۔ جو بھی تھا وہ نامحرم تھا، میں نے اللہ کی حدود کو اس کے لیے توڑا، اللہ جی مجھے کیسے ثابت چھوڑ دیتے؟ انہوں نے مجھے اسی انسان کے ہاتھوں ریزہ ریزہ کر دیا۔

میں سمجھتی تھی کہ وہ فون سے باہر نہیں نکل سکتا اور نہ ہی مجھے کھینچ کر نکال سکتا ہے۔ اس نے دونوں کام کیے لیکن میں خاموش رہی میں کٹھ پتلی بنی رہی، میں محبت کا تماشا دیکھتی رہی وہ ضرورت کا پجاری بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بچپن کے دوست کبھی دھوکا نہیں دیتے، میں نے بھی اسی ایک بات پر یقین کیا، کیا میں نہیں جانتی تھی کہ آج کل خون سفید ہو گیا ہے، دوستی تو بہت بعد کی بات ہے۔

مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا کرتے۔ اس نے پہلی بار ڈسا تو میں نے اپنا وجود دوسری مرتبہ کے لیے خود پیش کیا، اُس رات اگر وہ کانچ کی بوتل اپنے گلے پر پھیر کر مرتا تو بے شک مر جاتا۔ میں کیوں بھول گئی میں صرف اپنے کیے کی ذمہ دار ہوں۔ اس کے کیے کا بوجھ مجھ پر نہیں پڑتا۔ میں اللہ جی سے دعائیں مانگنے والی کہ میں صُمٌ بُکمٌ عمیٌ نہیں ہونا چاہتی مجھے ایک انسان کا کر کے نشان عبرت بنانا اور میں خود ہی اس انسان کی ہو تی گئی۔ میں نے اپنے اردگرد موجود سب رشتوں کو ٹھکرایا۔

سب سے پہلے تو میں نے اللہ جی کو اپنے لیے کافی نہ جانا اس کے بعد وہ کرتوت جو میں نے اپنے ہاتھوں سے کیے اس کا ملبہ پھوپھو پر گرانا چاہا۔ اگر پھوپھو نے موبائل دیا تھا تو ساتھ کہا تھا کہ میں اعتبار بھی دے رہی ہوں۔ میں نے موبائل یاد رکھا اعتبار بھول گئی، اعتبار توڑ دیا۔ پھوپھو نے صرف اسلام دعا رکھنے کو کہا تھا اور میں خود حدیں عبور کرتی گئی، اتنی حدیں کہ میں آخر میں بد لحاظ ہو گئی، بد زبان ہو گئی۔ یہ میری ہی ناہنجار زبان تھی کہ جس نے "وقت کی مار خدا یاد کروا دیتی ہے" کے جواب میں کہا تھا "کسی بہانے ہی سہی وہ یاد تو آئے گا ناں!" اب وہ یاد آتا ہے تو میں روتی کیوں ہوں۔ میری تو ہر بات پوری ہوئی ہے۔

میں نے اپنی یتیمی کو اپنی محرومی بنایا۔ اللہ کی عطا پر کبھی نظر نہ کی۔ ویسے تو واسطے دینے کے لیے فوراً رسول ﷺ یاد آتے ہیں۔ اللہ جی کے رسول ﷺ کا واسطہ! لیکن ان ﷺ کا بچپن دکھائی نہیں دیتا۔ کیا وہ ﷺ یتیم نہیں تھے؟ ان ﷺ کے اوپر جو ظلم اپنوں نے ڈھائے ان کو نبی آخر الزمان ﷺ ہونے کے باوجود جیسے جھٹلایا گیا اس کے باوجود آزمائشیں پڑنے سے پہلے ہی ہمارے پاؤں زمین سے اکھڑ کیوں جاتے ہیں؟

جب میں نے خود کو بربادی کے لیے خود پیش کیا تو اب میرا رونا نہیں بنتا۔ قصوروار آفتاب نہیں قصوروار میں خود ہوں۔ اب مجھے اپنا کیا خود کاٹنا ہے۔ مجھے اپنا سامنا کرنا ہے۔ وہ خود کو مکمل آئینہ دکھا کر وضو کرنے گئی تھی۔ اس کے بعد اسے توبہ کے نفل پڑھنے تھے، ایسی توبہ جس کے بعد گناہ نہیں کیا جاتا۔

وہ نہیں جانتی تھی آگے کیا ہوگا، وہ کہاں سے کوئی راستہ پائے گی، لیکن آج اس نے سچائی کو جان لیا تھا۔ آج اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ واقعی عام سی لڑکی نہیں ہے۔ اس کے اندر ہمت ختم ہو گئی تھی، وہ مسخ شدہ کتبے کی طرح تباہ حال تھی لیکن اس کے باوجود اُسے رب کے حضور جھکنا تھا۔ وہ کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکتی تو بیٹھ کر پڑھتی لیکن آج کی رات توبہ گویا فرض ہو چکی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

نہ وعدہ ہے کوئی تم سے، کوئی رشتہ نبھانے کا
نہ کوئی اور ہی دل میں تہیہ یا ارادہ ہے!
کئی دن سے مگر دل میں
عجب الجھن سی رہتی ہے!
نہ تم اس داستاں کے سرسری کردار ہو کوئی
نہ قصہ اتنا سادہ ہے!
تعلق میں جو سمجھا تھا کہیں اس سے زیادہ ہے!!

صبح کی روشنی نے جب کمرے میں قدم رکھے تو پاکیزہ مشینی انداز میں آئینہ کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی۔ بہت دیر بعد وہ اس گھر کے دوسرے کمرے میں گئی تھی، بستر پر چادر تہہ ہوئی پڑی تھی، اور کمرہ خالی تھا۔ پاکیزہ کو عرصہ ہوا پھوپھو کے آنے جانے کا علم نہیں تھا۔ ایک طائرانہ نظر کمرے میں دوڑائی تو سب کچھ پہلے جیسا ملا۔

کتنا عرصہ محبت میں آنکھیں بند کیے ہم سالوں پر سال گزارتے چلے جاتے ہیں، جب آنکھیں کھولتے ہیں تو ہر چیز ویسی ہی ہوتی ہے لیکن ہماری عدم توجہی کا شکار ہو کر اسے ہماری عادت نہیں رہتی۔ لگتا تھا اب اس کمرے کو بھی پاکیزہ کی عادت نہیں رہی، ہوا کے زور دار جھونکے نے سائیڈ ٹیبل پر پڑی ایک فائل کو نیچے گرا دیا۔ پاکیزہ نے آگے بڑھ کر کھڑکی بند کرنے کی کوشش کی، پرانی کھڑکیاں بند کرنے کا فن ہاتھ سے رُخصت ہو چکا تھا۔ اس نے ٹیبل پر پڑا گلدان کھڑکی بند کر کے آگے رکھ دیا۔ فرش پر پڑی فائل کو اٹھایا تو چونک گئی، باہر ڈاکٹر کے نام کے ساتھ بریکٹ میں Oncologist لکھا ہوا تھا۔ وہ بڑبڑا گئی، فائل اس کے ہاتھ سے پھر گر گئی۔ ''کیا اس نے واپسی میں اتنی دیر کر دی تھی؟'' سوال نے منہ چڑایا۔ فائل کھولی تو وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ مریض کا نام تسکین تھا۔ پہلی رپورٹ انہی تاریخوں کی تھی جب پاکیزہ پر شادی کا زور ڈالا تھا۔ وہ وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔

اور پھر اللہ نے مجھ سے ایک جھٹکے میں منوا لیا کہ وہ اللہ ہے۔ بھری دنیا میں کون ہے میرا۔۔۔ کوئی بھی تو نہیں۔ میں خود بھی اپنی نہیں۔ میں نے خود اپنی جڑوں میں اینٹیں رکھی ہیں۔ میں نے سوچا تھا میں اس کے دل پر نقش ہو گئی ہوں۔ اللہ نے مجھے بتایا وہ دل میں اتارنا بھی جانتا ہے وہ دل سے اتارنا بھی جانتا ہے۔ کیا اس نے نہیں کہا تھا کہ تم زمین میں جتنا ہے چاہو تو خرچ کر لو لیکن کسی کے دل میں محبت پیدا نہیں کر سکتے لیکن میں کر سکتا ہوں۔ میں کیسے بھول گئی۔ مجھے اس کا نام رحیم یاد رہا، قہار بھول گیا۔ اسے اگر بغیر حساب کے نوازنا آتا ہے تو وہ واپس چھین لینا بھی جانتا ہے۔ یقین کرو وہ اللہ ہے، یہ اس کے لئے ذرہ برابر بھی مشکل نہیں ہے۔ اس نے مجھے میری اوقات بتائی۔ مجھے بتایا کہ میں انسان ہوں، انسانوں میں رہتی ہوں۔ سانپوں کو انسانوں سے ڈسوانے والے موسم میں انسانوں

میں رہتی ہوں۔ وہ انسان جنہوں نے کبھی میری خوشی کو مقدم نہیں جانا۔ وہ انسان جنہوں نے مجھ پہ ان الزامات کا بوجھ لگایا جنہیں کرنے کا میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں وچا۔ میں کیسے اپنی آنکھیں اور کان بند کر کے خوابِ غفلت میں مدہوش ہو سکتی ہوں۔ میں خود کو Jackle of all trades سمجھنے لگی۔

دنیا کی ذہین فطین بندی جاننے لگی۔ جو ایک انگلی کے اشارے سے اپنی دنیا کے منظر نامے کو بدل سکتی ہے۔ اس میں موجود انسانوں کو کٹھ پتلی کی طرح نچا سکتی ہے۔ میں بھول گئی کہ کٹھ پتلی تو میں خود ہوں۔۔۔۔ اور وہ مجھے تگنی کا ناچ نچا سکتا ہے۔ کیا میں اللہ کو بھول کر دنیا دنیا کروں گی اور پھر بھی اللہ میری مدد کرے گا۔۔۔۔ نہیں! ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نے مجھے شروع سے اپنی طرف متوجہ کئے رکھا۔ میں اس سے رازونیاز کرتی رہی۔ جیسے ہی مجھے کوئی چھونے والا انسانی دوست ملا میں اسے بھول گئی۔ میں نے اس انسان کی دوستی کو اوپر رکھا۔ پھر اللہ نے اسی دوستی سے مجھے نیچے دکھایا۔ پاتال کی سیر کروائی۔ انسان کو اللہ سے محبت کرنی چاہیے۔۔۔۔ ہاں! بالکل کرنی چاہیے لیکن انسان کو اللہ سے ڈرنا بھی چاہیے۔ وہ اپنے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا پسند نہیں کرتا۔ دنیا کو اس کے مقابل نہیں لانا چاہیے ورنہ وہ بس ایک جھٹکا دیتا ہے۔۔۔ صرف ایک جھٹکا اور انسان مان جاتا ہے کہ وہ واقعی اللہ ہے۔

اس اللہ نے آج مجھے اس انسان کا چہرہ دکھایا اور ساتھ ہی ساتھ اب واحد رشتہ بھی دور کرنے کا امکان دکھا دیا۔ پھر کون بچا؟ وہی جو اللہ ہے!

اپنی اوقات پہچاننے کے بعد اپنی اوقات اچھی لگنے لگتی ہے۔ اسے فرش آرام دہ لگ رہا تھا۔ وہ گھر میں رہ کر پھوپھو کا انتظار کرنا چاہتی تھی لیکن ان کے آنے کا وقت بھی تو نہیں معلوم تھا۔ یہ طے تھا کہ اب وہ یونیورسٹی نہیں جاسکتی۔ تحقیقی کام دماغ کبھی نہ کرتا۔ وہ متحیر سے جذبات لیے گھر سے باہر نکل آئی، اب اسے این او جی او میں جانا تھا شاید کچھ سکون ملتا۔

کارڈ بورڈ کی بنی گئی دیواروں کے ذریعے ایک ہال کو تین چار کمروں میں تبدیل کیا گیا تھا، ہال کے پیچھے باغیچہ تھا اور اس کے بعد پھر رہائشی کمروں کی دو قطاریں تھیں، انتظامیہ آگے ہال نما کمرے میں موجود ہوتی جو گیٹ سے اندر داخل ہو کر پارکنگ کے بعد موجود تھا، وہ آج یہاں آرام کرنے کی غرض سے آئی تھی، رات کو کی گئی توبہ میں شاید تاخیر ہو گئی تھی ورنہ صبح اتنی بُری خبر نہ ملتی، آنکھیں بند کر کے اس نے سر کرسی کی ٹیک سے لگا دیا۔ ابھی تک وہ بس فائل ورک کر رہی تھی۔

ساتھ کے کیبن سے چھن کر آتی آوازیں مشاورت اور رہنمائی کا شاخسانہ لگ رہی تھیں۔ کیا وہ بھی کبھی ناصح بن سکے گی؟ اس نے تاسف سے سوچا۔ جواب جانتی تھی۔ دل ہی لتے لینے پر تیار تھا "دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت" ساتھ والے کمرے سے آنے والی آوازیں اب دلچسپ ہو گئی، لگتا تھا اسی کی ذات کو، اسی کے مسئلے کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔

"ڈرتی رہو گی تو وہ ڈراتا رہے گا۔ تم ایک باہر پھر اسے شہ دے رہی ہو، بے وقوف لڑکی وہ لڑکا جو سیدھا کام نہیں کر سکا وہ الٹا کیا خاک کرے گا؟ اس کے اندر اتنی ہمت ہوتی تو اور کیا چاہیے تھا؟ وہ تمہیں بلیک میل کر رہا ہے اور تم ہو رہی ہو۔ اس کے پاس جو ثبوت ہیں

وہ انہیں سوشل میڈیا پر دے کر اپنے لیے خندق کیوں کھودے گا۔ اسے تمہاری چھوٹی عقل کا ادراک ہے اس لیے تمہیں دبا رہا ہے۔ جاؤ اسے کہہ دو جو کرنا ہے کر لو، جہاں تصاویر لگانی ہیں لگا دو، جہاں ویڈیو اپلوڈ کرنی ہے کر دو۔ ساتھ ہی ساتھ اسے یہ نمبر بھی بھیج دینا۔"

"کون سا نمبر باجی؟" ایک مری ہوئی آواز آئی تھی۔

"سائبر کرائم کا نمبر ہے یہ۔ سائبر کرائم کے تحت اگر کوئی شخص آپ کی تصاویر یا ویڈیو کسی سوشل میڈیا کے پلیٹ فارم پر لگاتا ہے تو اس شخص کو پانچ سے سات سال کی قید اور پانچ لاکھ ہرجانہ ادا کرنا ہوگا۔"

"لیکن باجی ان ویڈیوز میں تو میں۔۔۔"

"ہاں ہاں ذاتی ویڈیوز کی ہی بات ہو رہی ہے۔ اس شخص کو معلوم ہے کہ تم اس قانون سے ناواقف ہو اسی لیے تمہیں دبا رہا ہے۔ ایک دفعہ اس کے سامنے شیرنی بن کر آؤ گی تو تمہیں چوہیا سمجھنا چھوڑ دے گا۔ سائبر کرائم کا صرف نام لے لینا۔ جس میں گھر والوں کو بھی معاشقے بتانے کی ہمت نہیں وہ بھی لڑکیوں کی کم علمی کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ آج کے بعد سلائی کے جمع شدہ پیسے اُس کو دینا چھوڑ دو۔

"وہ ہر دفعہ رقم کا مطالبہ کر کے کہتا ہے کہ پھر تصویریں ختم کر دے گا۔"

"اور تم ہر دفعہ اس کی باتوں میں آجاتی ہو؟ پاگل لڑکی بس کرو۔ جاؤ دستکاری کے کورس کا فارم لے کر ریسپشن پر دے جاؤ۔"

ساتھ والے کمرے سے اب آوازیں آنا بند ہو گئیں تھیں۔

"میں کتنی بڑی بے وقوف ہوں۔ ایم ایس کر رہی ہوں اور استعمال ہو رہی ہوں۔" پھر اس نے اپنے گریبان میں جھانکا۔ "کیا مجھے ہی تو استعمال ہونے کا شوق نہیں؟" رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

آوازیں آنا بند ہوئی تو ساتھ والے کمرے کا رخ کیا۔ کبھی کبھی آتی تھی اس لیے سب کا نام معلوم نہیں تھا۔ میز پر فرزانہ کے نام کی تختی پڑی تھی۔ پاکیزہ نے خوشدلی سے سلام کیا۔ جس کا پرتپاک جواب ملا۔ غالباً وہ سب والنٹئیرز کو جانتی تھی۔

"آپ ابھی کسی کو بہت اچھے سے سمجھا رہی تھی، مجھے لگا تعریف بنتی ہے لہذا آپ کے پاس آ گئی۔"

"تعریف اُس خدا کی جس نے یہ جہاں بنایا۔ انسان کو انسان بنایا۔ بس لڑکیاں بے وقوف زیادہ ہو گئی ہیں تو سمجھانا بھی کھل کر پڑتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ خراب عورتیں سائبر کرائم کے ذریعے اپنے مذموم مقاصد نہ پورے کرنے لگ جائیں۔ جب تک کیس کی ہسٹری مکمل نہ پتہ ہو میں سائبر کرائم کا مشورہ نہیں دیتی۔ یہ بے چاری تو اپنے سابقہ منگیتر کے ہاتھوں عرصے دراز سے بلیک میل ہو رہی ہے، اُس منگیتر کے دو بچے بھی ہو گئے لیکن وہ اس کی کمائی پر نظر رکھے بیٹھا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ اس طرح کے کیسز بھی آتے ہیں؟"

"اب تو زیادہ تر غیر شادی شدہ خواتین کے کیسز ہی آ رہے ہیں، جو اصل میں بچیاں ہیں۔ رونا کسی اور چاہیے کہ وہ محبت نہ نبھا سکا لیکن روتی یہ خود ہیں۔ وہ کیوں نہ مرے، یہ کیوں محبت بھی کریں اور یہی مریں؟"

"آپ کی تو لفاظی بھی کمال ہے۔" وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔

"لفاظی میری نہیں میم کی ہے۔ وہ جو دو چار لفظ بولتی ہیں دماغ میں رہ جاتے ہیں، آج تو وہ آئی ہوئی ہیں۔ اب شہر میں تین ادارے بن گئے ہیں تو اس ادارے میں کم ہی آتی ہیں۔ آج بس رہائشی کمروں کا جائزہ لینے آئی ہیں، وہ آئیں تو میں آپ سے ملواتی ہوں۔ ان سے ملنے کے بعد آپ والنٹیر لی مستقل کارکن بن جائیں گی، مجھے یقین ہے، لیجیئے میم تو آ گئی۔" اتنا کہہ کر فرزانہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

فرزانہ کی دیکھا دیکھی پاکیزہ نے بھی کرسی چھوڑی اور مڑ کر کھڑی ہو گئی، سامنے وہی مریضہ تھی، جس کی فائل وہ گھر میں دیکھ کر آر ہی تھی، پاکیزہ نے بمشکل کرسی کا سہارا لیا، اوسان پاکیزہ کے ساتھ ساتھ حیرت نے تسکین کے بھی خطا کر دیئے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ مدوجزر دنیا کھیل ہے سانپ اور سیڑھی کا

یہاں سے اور آگے استعارا جا نہیں سکتا

"گھونسلے میں شور بڑھ گیا تھا، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اچھے موسم نے ان پر ہی اپنا اثر ڈالا ہے، چہچہاہٹ سے فضا کی موسیقی میں اضافہ ہوا تھا، کمرے میں سب رنگ ہی تبدیل ہوئے تھے، پاکیزہ تسکین کی گود میں سر رکھ کر سسک رہی تھی۔" آپ نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔ کبھی نہیں بتایا۔ مجھے اس قابل سمجھا ہی نہیں۔"

"تم نے بھی تو کبھی کچھ نہیں پوچھا پاکیزہ۔ میں نے جب جب تماری بہتری کے لیے کچھ کہنا چاہا تمہیں میں اپنی دشمن لگی۔" پھوپھو نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں غلط تھی پھوپھو، مجھ سے غلطی ہو گئی، مجھے معاف کر دیں، آپ جو کہتی تھی میرے بھلے کے لیے کہتی تھی۔ میں نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، پتہ ہے پھوپھو وہ بھی مجھے چھوڑ گیا ہے۔" پاکیزہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگ گئے تھے بیمار پھوپھی کو وہ تفصیلات نہیں بتا سکتی تھی لیکن کم از کم دل کا بوجھ تو ہلکا کر سکتی تھی دل آج بھی اتنا ہی نادان تھا کہ اتنی ذرا سی بات پر ہلکا ہو جاتا تھا۔ غیروں سے جب التفات بڑھتی ہیں تو اپنے سگے رشتے بھول جاتے ہیں، غیر جب چھوٹ جائیں تو دوبارہ کبھی پہلے کی طرح نہیں ہو سکتے، چھوٹی سی غلطیاں غیروں کے معاملے میں گناہ بن جاتی ہیں۔ اپنوں سے لاکھ شکوے شکایتیں ہو بس ایک دفعہ گلے لگنے کی دیر ہے واپس رابطے بحال ہو جاتے ہیں، اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے۔ ذرا سی کانٹ چھانٹ کر و تو پودے تازہ ہو جاتے ہیں۔

"نہیں میری جان معافی مانگنی کی ضرورت نہیں ہے، میں نے بھی بہت عرصہ خود ترسی میں گزارا، مجھے لگا کہ جتنے ظلم مجھ پر ہوئے ہیں شاید اس دنیا میں کسی پر نہیں ہوئے، گزرتے وقت اور تمہاری باتوں نے احساس دلایا کہ اگر میں دنیا سے یونہی چلی گئی تو میں نے اپنے آنے کا مقصد بھی پورا نہیں کیا۔ اپنے سے جڑے رشتوں سے بھی میں محبت واپنائیت کا سلسلہ قائم نہیں رکھ سکی۔ بس شکوے شکایتیں کرتی رہی۔۔۔ میں نے تمہارا عزم بہت بلند دیکھا تھا۔ میں نے جب عورتوں کے حقوق کے تحفظ کا بیڑا اٹھایا تو میری بڑی خواہش تھی کہ تم میرے کاندھے سے کاندھا ملاؤ۔ تمہاری اپنی مصروفیت تمہیں مجھ سے دور کرتی گئی۔ تم اس وقت کوئی بات سننے پر آمادہ ہی نہیں تھی۔ اگر سنتی تو جان جاتی کہ میری آسودگی کی وجہ دوسروں کی تکالیف دور کرنا ہے۔ میں کسی ایک عورت کا مسئلہ حل کرتی تو میرا اطمینان مزید بڑھ جاتا۔ دن رات کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ میرے ادارے کو حکومت نے بھی رجسٹرڈ کر لیا اور مزید دو عمارتیں بنانے کے لیے معاونت بھی کر دی۔ اس وقت تین ادارے میرے زیر سایہ چل رہے ہیں لیکن میری خواہش ہے کہ اب یہ سب تم دیکھو، میں تو پل دو پل کی مہمان ہوں۔"

پھوپھو کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے، پاکیزہ نے اٹھ کر ان کے گال صاف کیے اور گلے سے لگا لیا۔

"ایسے نہیں کہیں پھوپھو، میرا آپ کے علاوہ کون ہے، آپ نہ رہی تو میرا کیا ہو گا؟ آپ کو ابھی بہت جینا ہے۔ ابھی مجھے آپ کی خدمت کرنی ہے، جو آپ چاہیں گی فلاحی ادارے کے حوالے سے وہی ہو گا۔"

تسکین کے گلے لگی پاکیزہ کو احساس ہوا کہ وقت کتنی تیزی سے آگے بڑھ گیا ہے۔ تسکین کمزور ہو گئی تھی اور پاکیزہ کی گرفت مضبوط تھی۔

"میرا وہ دکھ جو اللہ جی نے مجھے رسوا کرنے کے لیے دیا میں اسے بدنامی کا ذریعہ نہیں بناؤں گی، اگر اللہ جی نے پردہ رکھا ہے تو میں پردہ چاک نہیں کروں گی، میں پھوپھو کو آفتاب سے متعلق ایک لفظ مزید نہیں بتاؤں گی۔" پاکیزہ نے پکا ارادہ کر لیا۔

اس کی سوچوں کا سمندر وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے کمرے میں آکر وہ خود کلامی کر رہی تھی۔ "میں نے اس سے الگ ہو کر بھی اللہ کو نہیں چھوڑا۔ ہاں میں تھوڑا سا ڈگمگائی تھی۔۔۔ ہاں میرے قدم لڑکھڑائے تھے۔ جتنی مضبوطی سے میں نے اللہ کی رسی پہلے تھام رکھی تھی اتنی طاقت میرے ہاتھوں میں نہیں رہی تھی۔ ٹوٹا پھوٹا سا تعلق بن گیا تھا لیکن میں نے اس تعلق کو کبھی ماضی نہ بننے دیا ہمیشہ اسے اپنا حال رکھا۔ روئی تب بھی اللہ کو یاد کیا۔ گناہ کیا تو اس سے دور نہیں ہو گئی اسی کی بارگاہ میں سر رکھا اور اپنے دل کا قرار مانگا۔ میں ضدی بچہ بن گئی۔۔۔ آپ نے وہ نہیں دیا تو قرار تو دیں ناں!

قرار کہاں ملنا تھا پھر آزمائش آگئی۔۔۔ ایک اور آزمائش۔۔۔ ایک بڑی آزمائش۔۔۔۔ قریب تھا کہ شیطان مجھے مایوس کر دیتا اور میں اندھیروں میں بھٹکتی پھرتی لیکن مجھے اسی اندھیروں میں سے روشنی تلاشنی تھی۔ میں حبس زدہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگی اور مجھے زندگی کی کوک سے تازہ ہوا ملی۔ وہ بہت چھوٹا سا اشارہ تھا۔ موم بتی کی روشنی سا چھوٹا اشارہ۔۔۔ میں نے موم بتی کی

روشنی کو اپنا سورج بنایا اور پھر سورج کے رب سے اپنا قرار مانگا۔شاید میری برداشت ختم ہو چکی تھی۔اور وہ میرے پیارے اللہ جی کسی کو اُس کی برداشت سے زیادہ تو نہیں آزماتے ناں؟

بس جیو یا مرو۔۔۔اللہ جی سے اپنا ذاتی رشتہ قائم رکھو۔یقین جانو یہ رشتہ ہی زندگی ہے۔یہ رشتہ ہی زندگی کا اصل ہے۔یہ رشتہ کہیں بھی نماز کی طرح فرض نہیں کیا گیا لیکن یہ کسی بھی فرض سے زیادہ ضروری ہے۔اللہ جی سے راز و نیاز کرتے رہو۔اپنے دل کی باتیں اچھی بری سب کہتے رہو۔جس طرح خود سے خود کو چھپا نہیں سکتے اللہ جی سے بھی نہ چھپاؤ۔وہ پھر تم پر تمہاری برداشت سے زیادہ نہیں بوجھ ڈالیں گے۔۔۔۔یہ اُن کا وعدہ ہے۔۔۔انہوں نے قرآن میں فرمایا ہے۔۔۔!"

محبت جب یک طرفہ ہو جائے اور دوسری طرف سے کوشش نام کی کوئی چڑیا اپنے پر نہ پھڑ پھڑائے تو محبت مردہ چڑیا کی طرح اپنی منڈیر پر پڑی رہتی ہے،ہوائیں لاکھ اس کی بے حرمتی کریں،ذلت کا احساس بے شک ہو تا رہے لیکن یقین جانیں نبض نہیں چلتی۔۔۔دل واقعی مردہ ہو جاتا ہے اور کوئی خواہش نہیں کرتا!محبت پہلے دوسرے فریق کے ہاتھ چھڑانے پر حیرت ذدہ ہوتی ہے،اور پھر یک طرفہ ہو کر مردہ ہو جاتی ہے،جب چیل کوے نوچنے آتے ہیں تو تکلیف ہوتی ہے مگر آہ نہیں نکلتی!اگر آپ بھی تنہا کوشش کر رہے ہیں تو یقین جانیں یہ مقام ضرور آئے گا دل مردہ ہو جائے گا۔

پاکیزہ کا دل مردہ ہو گیا تھا،یہ بھی پاکیزہ نے نہیں کیا تھا،بالکل اسی طرح جیسے اس نے محبت نہیں کی تھی،پہلے محبت خود ہوئی تھی اور اب دل کی موت بھی خود ہی ہوئی تھی۔!

☆☆☆☆☆☆☆☆

محبت ایسا پودا ہے
جو تب بھی سبز رہتا ہے
کہ جب موسم نہیں ہوتا
محبت ایسا رستہ ہے
اگر پیروں میں لرزش ہو
تو یہ محرم نہیں ہوتا

آفتاب تاحال پاکیزہ سے ملنے پر مصر تھا۔پاکیزہ تسکین کی تیمارداری میں مصروف تھی۔جب تک تسکین کو سمیٹنے والا کوئی اپنا نہیں تھا وہ مضبوطی سے زمین پر قدم گاڑے کھڑی رہی لیکن جیسے ہی کاندھا ملا۔۔۔وہ ختم ہونے لگی۔دیمک تو کب کی لگ چکی تھی۔لکڑی اب بھر بھرانے لگی۔وہ کمزور تر ہوتی جارہی تھی۔

پاکیزہ بالکل بدل گئی تھی سر سے پیر تک۔ اپنا تھیسں فریز کر دیا تھا۔ سارا دن تسکین کی خدمت گزاری میں لگی رہتی۔ برسوں کی دھند دنوں میں چھٹ گئی تھی۔ تسکین کی آنکھوں میں ممنونیت جھلکنے لگی تھی۔ پاکیزہ کی انسیت بڑھتی جارہی تھی۔ کیموتھراپی سے کوئی خاص فرق نہیں پڑرہا تھا، بال تقریباً آدھے رہ گئے تھے۔ فلاحی ادارہ دوسروں کے رحم و کرم پر تھا، پاکیزہ کو آخری کیل ٹھونکنا تھی۔

وہ تسکین کو دوا دے کر اپنی الماری کھولے کھڑی تھی۔

یہ گھڑیاں۔۔۔ جو صرف ایک شخص کے کہنے پر پہنی تھی۔

موتیوں کی مالا۔۔۔ جس کے شایانِ شان کبھی کوئی سوٹ نہیں لگ سکا۔

اپنی اور اس کے نام کی کی چینز۔۔۔ دونوں ایک دوسرے میں بری طرح الجھی ہوئی تھی۔۔۔ پاکیزہ نے بمشکل الگ کی۔

گلاب کی کلیاں جنہیں باقاعدہ دھوپ میں خشک کر کے کتابوں میں رکھا گیا تھا۔

بہت خوبصورت سی شال۔۔۔ جس کے رنگ پھیکے نہیں پڑے تھے۔

ٹشو پیپر میں لپیٹ کر رکھی گئی پہلی تنخواہ۔۔۔!

پاکیزہ کا ضبط جواب دے رہا تھا۔ وہ ٹٹول کر سب چیزیں شاپر میں ڈال رہی تھی۔ کوئی اس کے مردہ دل کو بری طرح نوچ رہا تھا۔

"آفتاب میں نے تم سے ملنا ہے۔" اس نے فون کر کے پہلی بات ہی یہی کہی تھی۔

"زہے نصیب زہے نصیب، کوئی فلیٹ دیکھوں یا کوئی کمرا؟" اس کی ڈھٹائی عروج پر تھی۔

"اس دفعہ کسی ریسٹورنٹ میں ملو بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔" وہ پرواہ کرنے والی نہ رہی تھی،

"ریسٹورنٹس کا بل بھرنے کی میری جیب اجازت نہیں دیتی مادام۔" غربت ایک دفعہ پھر خود رو پودے کی طرح اُگ آئی تھی۔

"بل تم نے نہیں میں نے دینا ہے، شام تک میں ریسٹورنٹ کا نام بھیجتی ہوں۔" اپنی بات مکمل کر کے فون رکھ دیا۔

کوئی سلام نہیں کوئی اللہ حافظ نہیں۔۔۔ رشتے کیسے بدل جاتے ہیں۔۔۔ انسانوں کی طرح۔۔۔ ان کے رویوں کی طرح!

سلامتی وہ اس شخص کی چاہ نہیں سکتی تھی اور رحیم اللہ کے حوالے بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کیسا شخص تھا کل تک سب کچھ تھا اور آج سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہے۔ شام چار بجے جب اس نے آفتاب کو ریسٹورنٹ کا نام اور ملنے کا وقت چھ بجے کا بھیجا تو ایک عالی شان ریسٹورنٹ کا نام دیکھ کر وہ چونکا تھا۔ عرصہ ہوا فاصلے مٹانے کے لیے وہ تنہائی میں ملنے لگ گئے تھے۔ آفتاب کو شاید اس سے اتنی اچھی جگہ کا نام سننے کی بھی اُمید نہیں تھی۔ وہ کب کے اس کے پر کتر کر اُسے مینڈ کی بنا چکا تھا، گھڑی کی سوئیاں ٹک ٹک کر رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

پیراہنِ غم سیا ہے کس نے!

خوابوں کو کفن دیا ہے کس نے!

جب گھر میں رکھی ہوئی ہو میت

پھر جشن بپا کیا ہے کس نے!

پاکیزہ نے سرمئی رنگ کا ٹراؤزر پہن رکھا تھا اور ساتھ کالر والا سفید کرتا، ٹراؤزر کے ہم رنگ بٹن کرتے پر اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ دوپٹہ کندھوں سے بار بار پھسل رہا تھا۔ بالوں کو سیدھا کر کے کچھ لٹیں آگے سے اٹھا کر پیچھے ایک پن میں کیچ کر لی تھی۔ آنکھیں کھول کر ٹھنڈے پانی کی ڈھیروں ڈھیر چھینٹیں ماری تھیں، چہرہ کافی حد تک نکھر گیا۔ سن بلاک چہرے پر لگا کر اس نے ہاتھوں کو بھی موئسچرائز کیا۔ خوبصورت پلکوں کو مسکارے سے مزید جاذب نظر بنایا، باریک سا آئی لائنر آنکھوں کو نمایاں کرنے کے لیے لگایا اور کاجل کی دبیز تہہ آنکھوں کے اندر بٹھائی۔ اب وہ چاہتی بھی تو رو نہیں سکتی تھی، ہلکے گلابی سے رنگ کا بلش آن لگا کر ہونٹوں پر شہد کی ایک تہہ جمائی۔ اب چمک باقی رہنی تھی، وہ مکمل طور پر تیار تھی۔ ہاتھوں میں سن گلاسز بھی اٹھا لیے۔ چال میں ایسا اعتماد تھا جو بچپن میں اسٹیج پر جا کر پہلا انعام وصول کرتے وقت آتا تھا۔

سوا چھ بجے کے قریب آفتاب کا پیغام آیا تو وہ ریسٹورنٹ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے پیغام کا جواب نہیں دیا، ریسٹورنٹ کے باہر گاڑی رُکی تو اس نے پیسے دے کے ٹیکسی والے کو فارغ کیا۔ دوپٹے کو کندھے پر پن لگا چکی تھی۔ پارکنگ میں آفتاب کی گاڑی کو دیکھا تو سن گلاسز اتار لی۔ وہ پاکیزہ کو اس حال میں دیکھ کر چونکا تھا، عرصے بعد اس کی کلائی گھڑی کی قید سے آزاد تھی۔

"اچھی لگ رہی ہو۔" آفتاب نے بڑے محتاط انداز میں تعریف کی۔

"میں ہمیشہ سے اچھی ہی لگتی آئی ہو۔" اس نے عرصے بعد حق سمجھ کر تعریف وصول کی تھی۔

"آج کیسے مجھے کھانا کھلانے کی یاد آئی۔" آرڈر دینے کے بعد اس نے بہت ہلکے پھلکے لہجے میں پاکیزہ سے پوچھا ایسے جیسے ان دونوں کے درمیان کبھی کوئی تلخی آئی ہی نہیں۔

"کھانا کھلانے کی یاد تو نہیں آئی۔ اتنے پیسے میرے پاس ہیں نہیں کہ دوسروں پر اڑاتی پھروں۔ میں بس دیکھنا چاہتی تھی کہ محبت کو ٹھکرا کر چہرے پر پھٹکار پڑتی ہے یا نہیں۔" وہ دانستہ طور پر نظریں چرائے بیٹھی تھی۔

"ہاہاہا اور تمہیں پتہ چلا ہو گا محبت ٹھکرا کر بندہ حسین ہو جاتا ہے، ایک بات بتاؤں پاکیزہ میں نے جتنی بچیاں چھوڑی ہیں، وہ بعد میں اور بھی پیاری ہو گئی ہیں۔" آفتاب نے مذاق اڑایا تھا۔

"تمہارا یہ یقین تو میں کبھی نہیں توڑوں گی، تمہارا یقین سلامت رہے گا کہ تمہارا منحوس سایہ دور ہونے کے بعد خوبصورتی واقعی بڑھ جاتی ہے۔" پاکیزہ نے ہنستے ہوئے اسی پر چوٹ کی۔

"یہ بکواس کرنے کے لیے مجھے بلایا ہے؟" اپنے بارے میں وہ ایک بھی لفظ کیسے سن سکتا تھا۔

"ٹیک اٹ ایزی آفتاب نور ٹیک اٹ ایزی۔۔۔ میں نے تو بس تمہیں تمہاری امانتیں لوٹانے کے لیے بلایا ہے۔" اس نے شاپر تھوڑا سا آفتاب کی طرف سرکایا، مہنگے ہوٹل کا ماحول پاکیزہ کو جرات دے رہا تھا۔

"ایسا کیا ہے اس میں؟" آفتاب کو تجسس ہوا۔

"تمہارے دیئے ہوئے جھوٹے تحفے۔۔۔" سارے جواب پاکیزہ کی زبان کے نوک پر تھے۔

آرڈر پر آئے چاولوں کو پاکیزہ نظر اُٹھا کر نہیں دیکھ رہی تھی، وہ کانٹے سے شامی کباب کھا رہی تھی۔

"تم سب استعمال کر چکی ہو، میرے کس کام کے؟ میں کسی اور کو دے ہی نہیں سکتا استعمال ہوئی چیزیں۔" آفتاب نے سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا، وہ مسلسل چاول کھا رہا تھا۔

"استعمال ہوا انسان، استعمال ہوئے جذبات دے سکتے ہو تو استعمال ہوئی چیزیں کیوں نہیں دے سکتے؟ اینی ویز میری طرف سے "کچرے میں پھینک دو یہ چیزیں مجھے نہیں چاہیے۔" پاکیزہ نظر بچا کر نظریں چرا رہی تھی۔

"تمہیں لگتا ہے اس طرح میں تمہیں بھول جاؤں گا؟" آفتاب کو اتنا یقین پاکیزہ کی بے لوث محبت نے ہی بخشا تھا۔

"تم مجھے بھولو یا نہ بھولو میں تمہیں یاد نہیں کروں گی، خود سے تو کبھی بھی یاد نہیں کروں گی۔" پاکیزہ کا خود پر تھوڑا سا سہی اعتبار باقی تھا۔

"اگر خواب میں آ گیا تو؟" وہ چمچ روک کر پاکیزہ کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

"بُرے خواب تو آتے رہتے ہیں۔" پاکیزہ نے کولڈ ڈرنک کی سپ لیتے ہوئے کہا۔

"کب ملو گی"؟ وہ آنکھ مار کر بولا تھا، خباثت کے اظہار کے بغیر رہا نہیں جا رہا تھا، یہ اور بات کہ یہ خباثت اس خوب صورت چہرے پر بالکل بھلی نہیں لگ رہی تھی۔

"کبھی نہیں۔" پاکیزہ نے ٹشو سے ہونٹوں کو نزاکت سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟ کیوں بڑی بڑی باتیں کرتی ہو جبکہ جانتی ہو کہ تم میرے بغیر نہیں رہ سکتی؟" محبت کا یقین ایک دفعہ پھر سر اٹھانے لگا۔

"اب رہ سکتی ہوں۔" پاکیزہ نے پھن اُٹھائے سانپ کو کچلنا چاہا۔

"اب ایسا کیا ہو گیا ہے؟ عزت پیاری نہیں رہی؟ مشہور ہونا چاہتی ہو؟" انداز انتہائی استہزائیہ تھا۔

"چلو تم مشہور کر کے بھی دیکھ لو، یہ میرا وعدہ ہے کہ میں تم سے آخری دفعہ مل رہی ہوں۔" وہ کان پر جوں کو رنگینے نہ دے رہی تھی
۔

"شادی تو نہیں کر رہی؟" وہ مکمل طور پر متوجہ ہوا۔

"ابھی تو نہیں مگر ضرور کروں گی، جیسے ہی کوئی انسان ملا جس کا تن نہیں من پیارا ہو۔" اس نے بھی مکمل توجہ سے جواب دیا

"یعنی اب تمہیں لنگور چاہیے۔ میرے جیسے خوبصورت آدمی کے ساتھ رہ کر کر اب تم کسی عام سے لڑکے کے ساتھ گزارا نہیں کر سکو گی۔" پاکیزہ کے کانوں میں گول بالیوں کو دیکھتے ہوئے وہ بولا، اُسے یہ بالیاں بالکل نہیں پسند تھی۔

"آفتاب تم سے عام کوئی ہو نہیں سکتا اور اس سے خاص کوئی ہو گا نہیں جس کا نام میں اپنے نام کے ساتھ جوڑوں گی۔" پاکیزہ نے انگلی سے بالی کو خصوصی طور پر چھوا۔

"بہت بول رہی ہو، زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔" وہ پھنکارا۔

"سوری ٹو سے تمہارے ماں باپ کی دی ہوئی تربیت تو ہے نہیں کہ جسے کاٹ کر پھینکا جاسکے اور اپنی مرضی کے پر پرزے نکالے جا سکیں۔" پاکیزہ نے کانٹا زور سے پلیٹ میں رکھا تھا، آواز سے کافی لوگ متوجہ ہوئے۔

"ماں باپ تک نہ آؤ۔" وہ مجبوراً آہستہ بولا۔

"کیوں تمہیں اجازت ہے اور مجھ پر پابندیاں ہیں؟ آفتاب تم میری زندگی سے نکل چکے وہ ایک دفعہ تھی جب میں تمہارے دباؤ میں تھی اور وہی آخری تھی، بالکل آج کی ملاقات کی طرح" پاکیزہ واپس نارمل ہو گئی۔

"پاگل ہو گئی ہو؟" اب اس نے فتویٰ صادر کرنا لازمی سمجھا۔

"جو بھی سمجھ لو۔" پاکیزہ نے بڑے مزے سے کاندھے اچکائے۔ کھانا ختم ہو چکا تھا۔ پاکیزہ نے ثابت نوٹ بل بُک میں رکھے اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"آؤ تمہیں گھر چھوڑ دوں۔" پاکیزہ کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے آفر کی۔

"تم مجھے چھوڑ چکے ہو آفتاب۔۔۔ میں خود چلی جاؤں گی!" ہنستے ہوئے پاکیزہ نے اسے لاجواب کیا۔

وہ شاپر گاڑی میں رکھ رہا تھا، پاکیزہ قریب ہی کھڑی تھی، وہ خاموش ہو گیا تھا بالکل خاموش۔

یہ لڑکوں والی چیزیں ہوتی تو میں اپنے پاس رکھ لیتی شاید میرے کام آجاتی۔" وہ بے وجہ ہنس رہی تھی، آفتاب نے چونک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا، یہ لمحہ نہیں پاکیزہ کی آزمائش تھی۔۔۔ اس نے اپنی مسکراہٹ قائم رکھی اور آنکھوں میں لاپرواہی کا تاثر بھی۔ آفتاب تھوڑا سا ہل گیا۔

"آؤ ٹیکسی کروا دو" ایک دفعہ پھر آفر ہوئی تھی۔

"میں ٹیکسی بھی خود کروا سکتی ہوں۔" گیٹ کی طرف قدم بڑھاتے پاکیزہ نے ایک ادا سے کندھے پر آئے بالوں کو پیچھے جھٹکا۔

"چلو میں بھی کچھ کر لوں، تمہارے مطابق اگر یہ آخری ملاقات ہے تو تھوڑا سا حصہ مجھے بھی ڈالنے دو۔" وہ پر سکون ہو گیا تھا، شاید اس کے خیال میں کسی ملاقات کا آخری ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

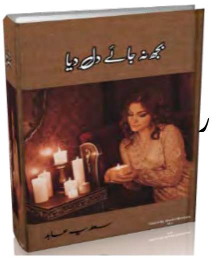
"آج کے بعد مجھے میسج کرنے کی زحمت نہ کرنا۔" بات سخت تھی مگر لہجہ نارمل تھا۔ وہ ناک سے مکھی اڑا رہی تھی۔

عہدِ وفا



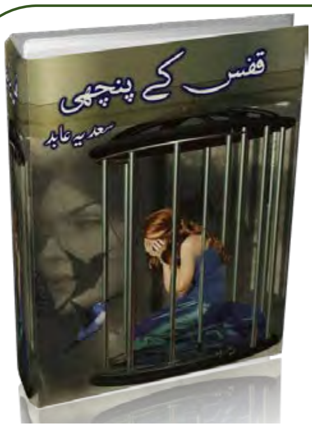
ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا مُنفرد ناول، مُحبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

بُجھ نہ جائے دِل دیا



سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، مُحبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

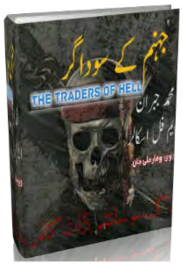
قفس کے پنچھی



سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے جلد، **کتابی شکل** میں جلوہ افروز ہو رہا ہے۔

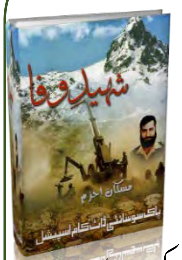
آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

جہنم کے سوداگر



مُحمد جبران (ایم فِل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

شہیدِ وفا



مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

آپ بھی لکھیئے:

کیا آپ رائٹر ہیں؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پر پبلش کروانا چاہتے ہیں؟؟؟

اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ **مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔**

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس میں شُمار ہوتی ہے۔

اور تمہارے خیال میں مجھے کون تمہیں میسج کرنے سے روکے گا؟'' وہ ایک دفعہ پھر پاکیزہ کی بے وقوفی پر ہنسا۔

''میرا آخری میسج!'' وہ اسے چیلنج کرتی کھڑی ٹیکسی کے قریب گئی۔

آفتاب کے قدم وہیں رُک گئے تھے، سفر پاکیزہ نے ختم کیا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر بہت آرام سے بیٹھی تھی، سن گلاسز ہاتھ میں رکھے آنکھیں کھولے پر سکون مسکراہٹ لیے یک ٹک آفتاب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے فرینڈ فار ایور کو ب ائے بائے فار ایور کہا تھا، آفتاب متحیر تھا بہت متحیر!

جب تک پاکیزہ کی ٹیکسی آنکھ سے اوجھل نہیں ہوئی۔ پاکیزہ نے اپنی آنکھیں نہیں جھکائی۔۔۔ اس کی مسکراہٹ بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔۔۔ آفتاب فقط اسے دیکھ کر رہ گیا!

اگلی سڑک پر پہنچتے ہی پاکیزہ نے سن گلاسز آنکھوں پر چڑھا لیے۔ سائبر کرائم کا ڈھونڈا ہوا لنک آفتاب کو واٹس ایپ کیا۔ گھر جا کر اس نے وائس میسج بھیجا

''میں نہیں مروں گی۔۔۔ میں کسی صورت کسی انسان کے لیے نہیں مروں گی۔ مرنا ہے تو تم مرو، کسی ٹرین کے نیچے جا کر سر دو، کسی پُل سے جا کر کودو، تمہارے کرتوت ہیں مرنے والے۔ میں نے منہ چھپانے والا کام کیا ہے لیکن میں نادم ہوں۔ مرنے کا مقام تو تمہارے لیے ہے جسے ندامت بھی نہیں ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔۔۔ میں کوئی جوگ لے لوں گی۔۔۔ دنیا سے کٹ جاؤں گی۔ نہیں! کبھی نہیں! میں تمہارے سامنے کھڑی ہو کر زندگی کو تم سے بہتر جی کر دکھاؤں گی۔ میں تم سے بہتر طور پر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالوں گی اور آنے والی مشکلات کو پچھاڑ دوں گی۔ تم ابنِ آدم ہو تو کیا ہوا تمہاری ماں بنتِ حوا ہی ہے۔ تم ایک لڑکی ہونے کی وجہ سے مجھے ڈرا نہیں سکتے۔ تم اپنی کھوکھلی دھمکیوں سے مجھے پیچھے ہٹنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ میں ثابت کروں گی تم جیسے بہت ہیں۔۔۔ میرے جیسی کوئی نہیں ہے!

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہاری بے وفائی کا راگ الاپتے ہوئے تمہارا نام لے لے کر اپنی زندگی ختم کر لوں گی۔۔۔ تمہاری بھول ہے! میں زندگی کو مکمل طور پر جیوں گی۔ میں گھر بھی بساؤں گی لیکن کسی مرد کے ساتھ۔۔۔ ایسا مرد جو واقعی مرد ہو۔ جانتے ہو مرد کی تعریف کیا ہے؟ مرد وہ نہیں ہے جس کا نام لے کر ڈر لگے، مرد وہ بھی نہیں ہے جس کا تصور ہیبت ناک ہو، جس کی گرج سے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، مرد تو وہ بھی نہیں ہے جو گلی، چوبارے یا گھر کے صحن میں اونچی آواز میں گالیاں بکتا اپنی جنس تولنے کی کوشش کرتا ہے۔ مرد وہ ہے جو سر ڈھانپتا ہے، جو محبت سے اپنے سارے حقوق لیتا ہے اور نرمی سے اپنے فرائض کی ادائیگی کرتا ہے، مرد وہ ہے جس کو دیکھ کر تحفظ کا احساس ہو، جو ہر وقت عورت کو یہ احساس نہ دلوائے کہ وہ بس ایک عورت ہے بلکہ وہ عورت کے عورت ہونے پر مان کرے، اسے لمحہ لمحہ اونچائیاں سر کرنے کی ترغیب دے، اس کا ہاتھ تھام کر بے شک نہ چلائے لیکن اگر وہ گرنے والی ہو تو اس کو ضرور تھام لے۔ مجھے اب ایسے مرد کی تلاش ہے اور ایسا مرد کبھی میرے ماضی میں نہیں جھانکے گا۔ میں اسے تمہارا باب پڑھنے کا

دوں گی وہ ایک بار دیکھے گا اور بند کر دے گا۔ ایسا مرد ملنا بھی مشکل نہیں ہے۔ اگر تمہارے جیسے شیطان پائے جاتے ہیں تو اللہ دنیا میں فرشتے بھی اتارتا ہے۔ میں ایک مرد کے ساتھ خوش رہو گی لیکن تم کسی عورت کے ساتھ خوش نہیں رہو گے کیونکہ تمہاری فطرت میں ہے عورت کو عورت ہونے کا احساس دلوانا۔ تم آج ہنس رہے ہو کل روؤں گے۔ میں آج خاموش ہوں کل قہقہے لگاؤں گی۔ تمہاری ہنسی آج بھی جھوٹی ہے اور میرا قہقہہ کل بھی سچا ہو گا۔ جب جب تم تک میرے قہقہوں کی گونج پہنچے گی تم کان بند کر لو گے۔۔۔ تم اونچی آواز میں چلاؤں گے۔۔۔۔

نہیں!

محبت اب اور نہیں!

زیادہ نہیں بس اتنا عرصہ جو میں نے انتظار میں گزارا، جو میں نے صبر کرنا سیکھنے میں گزارا۔۔۔ اتنا عرصہ تو تم پر بھی مشکل ہو گا۔ جب تم اس مشکل سے نکل جاؤ گے۔۔۔۔ ہاں میں مانتی ہوں کہ تم نکلو گے۔۔۔۔ کیونکہ ہر انسان نے اتنا ہی بھگتنا ہے جتنا اس نے کرم کیا، اس وقت تم کسی قابل نہیں رہو گے۔ تمہاری ساری عمر محبت کا تاوان ادا کرتے گزر جائے گی۔ تب بھی تمہیں سکون نہیں ملے گی۔ تم بیتے دنوں کو یاد کرو گے اور فریاد کرو گے۔۔۔۔

محبت مجھے تیرے ماتھے پر کلنک لگانے کی پاداش میں اور سزا نہ دے، محبت میں تیرا مجرم ہوں لیکن مجھے یوں خوابوں میں آ کر نہ ڈرا، محبت واہموں وسوسوں کا لبادہ نہ اوڑھ۔۔۔ مجھ سے میرا سکون نہ چھین۔۔۔ محبت مجھے معاف کر دے۔۔۔ محبت بس کر! محبت نہیں! محبت اب اور نہیں

اس میں سب سے Worst پتا ہے کیا ہے؟!

تمہاری آواز سننے کو میں بھی نہیں ہوں گی تب تم جانو گے تم نے کیا کھویا ہے!

تم میری محبت کے قابل نہیں تھے آفتاب لیکن اُمید کرتی ہوں نفرت کے مستحق بھی نہیں ٹھہرو گے۔ اس کے باوجود بھی جو کرنا ہے کر لو۔ میں محبت کے نام پر بلیک میل مزید ہو سکتی تھی لیکن جو عزت تک آئے اُس محبت پر سو بار لعنت! جاؤ میری طرف سے آزاد ہو۔ جو کرنا ہے کر لو، میری عزت چوبارے پر لانے کی کوشش کی تو تمہاری عزت کو میں خود رسوا کروں گی، تمہارا معاملہ میرے تمہارے وکیل اللہ جی کے حوالے!"

یہ پاکیزہ کا آخری میسج تھا جسے لکھتے ہوئے کاجل پھیل گیا تھا۔ ضبط انتہاؤں پر پہنچ گیا تھا۔۔۔ دونوں ٹِک جیسے ہی سبز ہوئے پاکیزہ نے سم موبائل سے نکال کر توڑی اور باہر پھینک دی۔

ماڈرن محبت کا ماڈرن انجام!

☆☆☆☆☆☆☆☆

مرے مسافر!

میں جانتی ہوں

ابھی سفر ابتدا ہوا ہے

ابھی مسافت کی حد بھی لکھی نہیں گئی ہے

ابھی تو جنگل میں راستہ ڈھونڈنا پڑے گا

ابھی تو رستے میں شام ہو گی

تم لڑکیاں لڑکوں کو جاننے والا کہتی ہو، کبھی محلے والا بتاتی ہو، کبھی پھوپھی کا بیٹا بتا کر عزت بناتی ہو لیکن ان کے لیے تم ہمیشہ لڑکی رہتی ہو۔۔۔ صرف اور صرف لڑکی! لفظ لڑکی لیتے ہی لڑکوں کے ذہن میں جو خاکہ بنتا ہے وہ لڑکیاں کبھی سوچ نہیں سکتی۔ آپ بے شک لڑکوں کو جو مرضی کہیں، آپ ان کے لیے خالہ یا چاچو کی بیٹی ہو کر بھی فقط لڑکی ہی ہیں۔ آپ ان کی سوچ نہیں بدل سکتی۔ آپ لاکھ ان کی آنکھیں پڑھنے کا دعویٰ کریں ان کی سوچ نہیں جان سکتی۔ ان کے ارادوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ لڑکوں کو لڑکا ہی رہنے دیں۔ اگر کوئی کیٹگری بنانی ہے تو محرم اور نامحرم کی بنالیں۔ اگرچہ آج کے معاشرے میں محرم بھی محترم رہے مشکل ہی ہے لیکن کم از کم آپ کو اپنی حدود کا خیال تو رہتا ہے۔

جو لڑکا آپ سے ملنے کا بہانہ ڈھونڈتا ہے لیکن رشتہ بھیجتے ہوئے اسے موت پڑنے لگتی ہے تو اسے اپنی زندگی سے فوراً بے دخل کر دیں اس سے پہلے کے ہوس اس کو بالکل اندھا کر دے۔ ایک بات میں نام نہاد عاشقوں کو بھی کہنا چاہوں گی جو محبوباؤں کی شادی کے بعد روتے ہوئے راتیں گزارتے ہیں۔ اگر وہ اتنے ہی سچے ہوتے ہیں تو پہلے کیوں اپنے قدم مضبوطی سے نہیں رکھتے؟ پہلے کیوں آواز بلند نہیں کرتے؟ اگر وہ پہلے اس لڑکی کو اپنا نہیں سکے تو پھر انہیں رونے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ وہ مرد نہیں ہے جو اپنی محبت کو کسی دوسرے کے پہلو میں دیکھ سکے۔۔۔ اگر وہ دیکھ رہا ہے تو اس کے جذبے کھوکھلے تھے۔ قربانیوں اور دانستہ قسم کی بے وفائیوں میں بہت ذرا سا فرق ہے۔ بس آنکھیں کھلتی ہیں تو قربانیوں کی حقیقت بے وفائی کی صورت عیاں ہو جاتی ہیں۔

جو لڑکے کہتے ہیں حاصل کرنے کا نام محبت نہیں تو محبت اس چیز کا بھی نام نہیں کہ کسی کو دیکھا جائے، اس سے رابطے میں رہا جائے، اس سے بات کی جائے، اس سے ملا جائے۔ اگر محبت حاصل کرنے تک نہیں پہنچ سکتی تو پھر محبت کو پاکیزہ ہونا چاہیے پھر محبت کو خاموش ہونا چاہیے۔ آپ کسی کی منزل نہیں بن سکتے تو آپ کو اس کا راستہ کھوٹا کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے!

آپ سمجھتی ہیں کہ یہ جو لوگ آپ کو سمجھا رہے ہیں یہ طنز کر رہے ہیں یا آپ سے دشمنی رکھتے ہیں۔ ایک آپ اور اس شخص کی محبت ہی دنیا میں سچی ہے تو جان لیں کہ وہ وقت بھی دور نہیں جب آپ کے نزدیک سچ کی تعریف ہی بدل جائے گی۔ اس رشتے سے دور رہیں جو آپ کی عزت اتار لے اور آپ کو کوئی نام نہ دے سکے۔ ایسا حوالہ ہمیشہ ماضی میں رہ جاتا ہے کبھی مستقبل نہیں بن سکتا۔

مجھے سمجھ نہیں آتا کہ لڑکا کہتا ہے کہ میں مجبور ہوں تو آپ یقین کیسے کر لیتی ہیں۔ یہ معاشرہ مردوں کا ہے وہ مجبور یا محکوم نہیں ہو سکتے۔ وہ اگر کوئی اسٹینڈ لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں۔ ہم انیس سو ساٹھ میں نہیں رہ رہے جہاں ماں باپ کی دی گئی دھمکیاں لڑکوں پر اثر کر جاتی تھی۔ آج کے دور میں والدین بچوں سے عزت بچاتے نظر آتے ہیں۔ وہ بچوں کی خوشیوں میں خوش ہیں لیکن یہ بچے بھی تو کسی ایک جگہ پر ٹکیں ناں۔ اگر کسی لڑکے نے آپ کے لیے اسٹینڈ نہیں لیا تو اس لڑکے کی مجبوریاں بڑی نہیں تھی بلکہ اس کی نظر میں آپ کی وقعت بہت چھوٹی تھی جو اس کو آپ کو اپنانے کی جرات نہ دے سکی۔ جتنی جلدی آپ یہ جان جائیں گی اتنی ہی سکھی رہیں گی۔ اب اس بات پر پریشان ہونے رونے کی کوئی ضرورت نہیں کہ آپ کو قدر دان نہیں ملا۔ ہر کسی کو قدر دان مل جاتا ہے لیکن صحیح وقت پر۔ کھوکھلی دیواروں پر سر مارنے سے چوٹ ملتی ہے بالکل اسی طرح کم ظرف لوگوں سے رشتہ مانگتے ہوئے بس وقعت گھٹتی ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔

یہ جو سب سے چھوٹی چوری ہے ناں؟ جس سے دل تھوڑا سا مطمئن ہو جاتا ہے، ایک وقتی سہارا مل جاتا ہے۔ جسے ہم نظر کی چوری کہتے ہیں۔ وہی حقیقت میں سب سے بڑی چوری ہے۔ کچھ لمحے چھپ چھپ کر دیکھنے کا جو میٹھا میٹھا مزہ جو لذت ہے وہ بعد میں مصیبت بن جاتی ہے۔ یہ لمحے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ آپ بے شک یہ چوریاں بھول جائیں۔۔۔ زندگی میں بہت آگے نکل جائیں۔۔۔ یہ لمحے آپ کو نہیں بھولتے۔۔۔ خواب بن کر آپ کو ستانے لگتے ہیں! ایسے بُرے خواب جو آپ کا حلق خشک کر سکتے ہیں لیکن آپ کو ہمت نہیں دے سکتے کہ آپ زندگی میں اتنا آگے آ کر ان خوابوں کو کسی کو بتا سکیں۔ آپ ڈرتے ہوئے اٹھتی ہیں اور بس یہ کہتی ہیں کہ بہت برا خواب تھا۔ حالانکہ اگر آپ کے بس میں ہو تو اپنی آنکھیں نکال کر وہ چوری کے لمحے بھول جائیں۔

میں آپ کو یہ نہیں کہتی کہ محبت نہ کریں۔۔۔ محبت آپ کے اختیار سے باہر شے ہے! جس طرح آپ دل کی دھڑکن کو اپنے اختیار میں نہیں رکھ سکتے اسی طرح محبت بھی آپ کے اختیار سے باہر ہے۔ آپ چاہیں نہ چاہیں محبت آپ کے اندر پیراسائٹ کی طرح پلتی رہے گی۔ آپ کو نچوڑتی رہے گی، آپ کو نوچ کھاتی رہے گی مگر ایک منٹ بات سنیں کیا شو آف بھی آپ کے اختیار سے باہر ہے؟ محبت کا اظہار تو آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہے ناں؟ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر آپ جو خود کو گرانے کی حرکتیں کرتے ہیں وہ تو آپ کے اختیار میں ہیں ناں؟ محبت کرنی ہے تو کرتے رہیں۔۔۔ سو مرتبہ کریں لیکن شو آف نہ کریں، اوچھی حرکتیں نہ کریں، خود کو نہ گرائیں۔ محبت کو محبت رہنے دیں، اپنی ذات پر ظلم نہ بنائیں۔ جتنی محبت کا دم کسی اور سے بھرتے ہیں اس کا چوتھائی حصہ صرف چوتھائی حصہ اپنے آپ سے بھی کر لیں۔

اگر کوئی آپ کو بلیک میل کر رہا ہے تو آپ کی اپنی وجہ سے کر رہا ہے۔ آپ نے خود اسے اجازت دی ہے۔ پہلے اپنی کمزوریاں اس کے ہاتھ میں دی ہیں اور پھر خود کو کمزور ہی رہنے دیا ہے۔ کوئی آپ کا تب تک کچھ نہیں بگاڑ سکتا جب تک آپ خود اسے اجازت نہیں

دیتے۔ جس میں سیدھا کام کرنے کا دم خم نہیں ہے وہ الٹا کام کیسے کرے گا؟ خود کو گرانے کی کوشش مت کریں۔ اپنے آپ کو مضبوط رکھیں۔ اسے کہیں جاؤ جو کرنا ہے کرلو۔ ایک دفعہ اسے ڈھیل دے کر دیکھیں وہ اپنی ہی ڈور سے الجھ کر آپ کٹ جائے گا۔ ظلم کو برداشت کرنا خود پر مزید ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ کسی کو اجازت نہ دیں کہ وہ آپ کے دل و دماغ یا جذبات سے کھیل سکے۔ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں میں رکھیں۔

یہ چند بٹنوں کے دبانے سے اپنے آپ کو کسی دوسرے کے حوالے کر دینا ایسا ہی ہے جیسے خودکشی کرنا! یہ خودکشی بہت دھیرے دھیرے ہوتی ہے۔ اس میں موت دیر سے آتی ہے اور تکلیف زیادہ ہوتی ہے۔ آپ بے شک اسے محبت کا نام دیں۔ میں اسے موت کہتی ہوں اور موت پھر درخواست نہیں سنتی۔ آپ لاکھ کہیں اب نہیں۔۔۔ موت ابھی نہیں! وہ نہیں سنتی۔۔۔ بس ایک جھٹکے میں یہ پھندا اپنے گلے سے نکالیں اور اتار پھینکیں۔ اس سے پہلے کہ پھندا خود بخود تو نکل جائے لیکن آپ میں چلنے پھرنے کی سکت بھی باقی نہ رہے۔ جائے موت کو خود کہہ دیں اب نہیں! محبت اب اور نہیں!

خود کو یاد کروائیں کہ آپ بھی انسان ہیں۔ اگر کوئی دوسرا انسان آپ کے لیے اہم ہے تو لاکھ بار ہو لیکن آپ سے کم اہم ہو۔ اپنی اہمیت کا خود ادراک کر کے ایک جھٹکے سے اپنا دامن چھڑانا ہو گا۔ آپ پر فی الوقت خراشیں تو بہت پڑیں گی لیکن سب زخم مندمل ہو جائیں گے۔۔۔ اگر آپ نے آہستہ آہستہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو آپ کے ہاتھوں پر لمس رہ جائے گا، حواس پر خوشبو باقی رہے گی۔ اگر چھوڑنا ہے تو فوراً چھوڑنا ہے ابھی اور اسی وقت چھوڑنا ہے! بغیر بتائے چھوڑنا ہے۔۔۔ کوئی وضاحت، کوئی الوداعی نوٹ نہیں دینا۔ ایک کسک تو اس کے دل میں بھی رہنے دیں۔ تھوڑی تکلیف تو اس کو بھی ہونے دیں۔ اس نے آپ کو یاد نہیں کرنا لیکن کم از کم وہ اس وجہ کی تلاش میں تو رہے جس وجہ سے آپ نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ وجہ اسے ساری زندگی نہیں مل سکے گی اور یہ ادھوراپن کب آپ کی یاد میں بدلے گا یہ اسے خود بھی نہیں پتہ چلے گا۔ جو آپ چاہتی ہیں وہ ہو جائے گا لیکن تب جب آپ اس کی امید نہیں کریں گی۔ اپنی اہمیت پہچان لیں گی۔ اگر اپنی اہمیت خود نہیں جان سکیں گی تو یقین جانیں وہ کبھی نہیں جانے گا۔ کیا آپ اپنے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتی۔۔۔؟

کیا آپ خود سے اتنا بھی پیار نہیں کر سکتی کہ ایک شخص جس کے لیے آپ کچھ نہیں ہیں اُس پر فاتحہ پڑھ لیں۔۔۔ اگر فاتحہ نہیں پڑھ سکتی تو پھر اپنے دل کی مردنی کے لیے تیار ہو جائیں۔ خود کو زندوں میں نہ شمار کرنے والوں کے دل مردہ ہو جاتے ہیں اور مردہ دلوں میں کبھی سُچاپن نہیں سما سکتا۔ اگر وہ آپ کے لیے آواز نہیں اٹھا سکتا تو آپ دونوں میں سے ایک کو بدلنا ہے۔۔۔ جسے آپ آواز اٹھانے پر مجبور نہیں کر سکی اسے بدلنا تو ناممکن ہے پھر خود کو بدلیں۔ ابھی اور اسی وقت بدلیں۔ شروع میں مشکل لگتا ہے ہوا اداس گیت پر آنکھیں نم ہونے لگ جاتی ہیں، اداس شاعری دل میں گھر کرتی ہے، تنہائی پیاری ہو جاتی ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ وقت مرہم بنتا ہے اور سب بھول جاتا ہے۔

اگر آپ اس راستے سے واپس پلٹنا چاہتی ہیں تو میں، میرے لفظ یا کسی اور کی نصیحتیں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ جو کرنا ہے آپ نے خود کرنا ہے۔ آج کے دور میں رابطے بنانا بھی آسان ہے اور قطع تعلق کرنا بھی۔ سب سے پہلے آپ کو اپنے دل کو مضبوط کرنا ہو گا۔ یہ سمجھنا ہو گا کہ آپ کی عزتِ نفس سے زیادہ قیمتی کچھ نہیں ہے۔ آپ کوئی پکوان نہیں ہیں جسے پلیٹ میں ڈال کر اگلے شخص کی بار بار منتیں کی جائیں کہ ہاتھ دھو کر مجھے کھالو۔ آپ ایک جیتا جاگتا وجود ہیں۔ اپنی حدود اور اپنے اصولوں کو از سر نو تازہ کریں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ابھی نہ پردہ گراؤ، ٹھہرو، کہ داستان آگے اور بھی ہے

ابھی نہ پردہ گراؤ۔ ٹھہرو۔۔۔

ابھی تو ٹوٹی ہے کچی مٹی، ابھی تو بس جسم گرے ہیں

ابھی تو کردار ہی بجھے ہیں

ابھی سلگتے ہیں روح کے غم،

ابھی دھڑکتے ہیں درد دل کے

ابھی تو احساس جی رہا ہے۔۔۔

یہ لو بچالو، جو تھک کے کردار کی ہتھیلی سے گر پڑی ہے

یہ لو بچالو، یہیں سے اٹھے گی جستجو پھر بگولا بن کر

یہیں سے اٹھے گا کوئی کردار پھر اسی روشنی کو لے کر

کہیں تو انجام و جستجو کے سرے ملیں گے

ابھی نہ پردہ گراؤ، ٹھہرو!۔۔۔

"آپ کو حیرت نہیں ہوتی کہ آپ نے ایک لڑکی ہو کر اتنا بڑا اسٹیپ کیسے لیا؟ یہ سارا ادارہ کیسے مستحکم کیا؟" سوال پوچھنے والا حیران تھا۔

پاکیزہ نے ٹیبل پر پڑی تصویر ان کی طرف موڑی اور ہاتھ میں تھامے پن کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی "یہ ہیں تسکین فاطمہ میری پھو پھو جنھوں نے اس ادارے کی بنیاد رکھی۔ میں نے صرف ان کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔ ویسے آپ کو حیرت نہیں ہوتی کہ آپ یہ سوال کیسے پوچھ لیتے ہیں کہ ایک لڑکی ہوتے ہوئے؟ مطلب لڑکی ہونا کیا کوئی کمزوری ہے؟"

"کمزوری نہیں ہے لیکن معاشرہ تو مردوں کا ہے۔"

"مرد بھی آسمان سے نہیں آتے، انہیں عورتیں ہی جنم دیتی ہیں۔ لڑکیوں کے خواب بڑے اور آنکھیں چھوٹی تب تک ہوتی ہیں جب تک وہ اپنی سوچ کو غلام رکھتی ہیں، اگر ان کے عزم میں ملاوٹ نہ ہو تو کوئی خواب ایسا نہیں جسے وہ سچ میں نہ ڈھال سکیں۔"

"لڑکوں کے ہاتھوں بلیک میل ہونے والی لڑکیوں کے لیے الگ ادارے کا قیام تو آپ نے خود کیا، اس کا کریڈیٹ آپ کسی اور کو نہیں دے سکتی، ایک دنیا آپ کی موٹیویشنل سپیچز کی دیوانی ہے، آپ کے لیکچر میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی تعداد ہزاروں میں ہوتی ہے، آپ کو کیسا لگتا ہے؟ یہ آئیڈیا آپ کو کہاں سے آیا تھا؟" انٹرویو کرنے والے نے ستائشی نظروں سے بے داغ چہرے اور چمکتی آنکھوں کو دیکھا۔

پاکیزہ نے دائیں گال پر پڑے نشان پر اپنے بال دوبارہ سیٹ کیے اور تلخ سی ہنسی کو بمشکل روکا۔

"خواب پورے ہو جائیں تو اچھا لگتا ہے لیکن خواب آنے والوں کو کوئی بھی خواب آخری نہیں آتا، میری منزل ابھی دور ہے، اور جیسا میں نے کہا کہ میں خواب دیکھتی ہوں تو سمجھ لیجئے کہ یہ آئیڈیا بھی مجھے خواب میں آیا تھا۔"

دماغ نے زیر لب "بھیانک خواب" کی سرگوشی کی تھی۔ ٹیبل اتنا آرام دہ تھا کہ سامنے انٹرویو کرنے والی ٹیم اس کے پیر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ جوتے اتار کر فرش پر تلوے مسل رہی تھی "بھیانک خواب"۔

"آپ مزید کیا کرنا چاہتی ہیں؟" ایک سوال اور آیا۔

"ابھی میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں اس بیداری کو آج کی لڑکی کے دماغ میں پہنچانا چاہتی ہوں۔ لڑکیاں کسی بھی وجہ سے الٹے سیدھے راستے پر چلنا شروع کرتی ہیں اور ان کو راہ نمائی نہیں ملتی تو وہ واپسی کا راستہ بھول جاتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ لڑکیوں کے ہاتھ میں ہمیشہ وہ چاقو رہے، جو لڑکوں کے پھیلائے ہوئے جال کو کاٹنے کی طاقت رکھتا ہو۔"

"کیا صرف ہمیشہ ہی لڑکیاں بے قصور ہوتی ہیں؟"

"نہیں لیکن صرف لڑکیوں کو بلیک میل کیا جاتا ہے اور اکثریت لڑکیوں کی ہی خودکشی کرتی ہے۔"

"آپ کا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں؟"

"میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"انٹرنیٹ پر آپ کا ہر چھوٹا بڑا لیکچر وائرل ہو جاتا ہے، بہت سے لوگ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں، کچھ لوگ سرعام شادی کے خواہاں ہیں، اگر آپ کا شادی کرنے کا ارادہ ہے تو ابھی تک کیوں نہیں؟"

"میں اگر لڑکیوں کو سہارا دینا چاہتی ہوں تو چاہے وہ لفظوں کا سہارا ہی کیوں نہ ہو مجھے کسی مرد کی مدد سے آزاد ہونا چاہیے یہ میرا خیال تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو یہ لڑکیاں کبھی لڑکوں کی طاقت کو ختم ہونے والا سمجھ نہیں سکتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ میں جو کروں خود

کروں۔ایک مثل جو عام ہے اس کو غلط ثابت کروں کہ عورت کی دشمن عورت ہے۔میں عورت سے دوستی کرنا چاہتی تھی اس لیے بس کچھ عرصہ عورتوں کے لیے خود کو وقف کیا۔"

"پھر آپ شادی کرنے والی ہیں؟"

"جی ضرور۔"

"کیا ہم خوش نصیب کا نام جان سکتے ہیں؟"

"وہ ہی جو مرد ہو گا۔"

پاکیزہ کی پی اے نے انٹرویو ٹیم کو سرو کیے برتن اُٹھا دیئے تھے اور پاکیزہ کا لنچ اس کے سامنے رکھا تھا۔

"ایکسکیوز می پلیز" پاکیزہ نے ہاتھ اٹھا کر پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے کہا۔

انٹرویو ٹیم میں شامل لڑکیاں مصافحہ کر کے باہر چل دیں، کمرے میں اب پاکیزہ اکیلی تھی، اس کے کانوں میں گول بالیاں تھیں جو کسی کو بالکل پسند نہیں تھی اور پاکیزہ ہمیشہ انہیں انٹرویو کی تصاویر کے لیے ضرور پہنتی تھی۔ چمچ بھر کر چاول اس نے منہ میں ڈالے، دیئے گئے جواب پاکیزہ کو ماضی میں لے گئے تھے۔

کچھ چیزیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی، انہیں وقت پر چھوڑ دینا چاہیے۔۔۔ہو سکتا ہے مناسب وقت پر وہی چیزیں اختیار میں آجائیں۔پاکیزہ نے اختیار سے باہر چیزوں کو چھوڑ دیا تھا، وہ خیانت کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔۔۔وہ خیانت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ٹھیک وقت کی منتظر تھی۔اس نے کسی اور کو ہم سفر بھی بنانا تھا یہ بھی طے تھا۔اگر وہ غلط نہیں تھی تو اسے یقین تھا اس کے ساتھ غلط نہیں ہو گا۔اس نے نظر اُٹھا کر سامنے گھڑی کی طرف دیکھی اور بے ارادہ چمچ بھر کر رائتہ منہ میں ڈال لیا۔

وہ تھوڑا سا پیٹ بھر کر ہی لیکچر کی ویڈیو ریکارڈ کرنے لگی تھی۔اسے لوگوں سے کہیں زیادہ خود کو تسلی دینی تھی۔

"اگر تمہیں خدا یاد نہیں آتا، اگر تمہارا دل اس کی عبادت میں نہیں لگتا، اگر تم اپنے رب سے جھگڑنا چاہتے ہو، تمہارا ایمان ڈگمگا گیا ہے، تم کن پڑھتے ہو لیکن فیکون پہ یقین نہیں رکھتے تو ایک دن اذان فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک آسمان کا نظارہ کرو۔۔۔دیکھو! وہ کیسے آسمان کے رنگ بدلتا ہے، دیکھو! وہ کیسے ہٹا دیتا ہے اندھیرے کو، دیکھو! وہ کن کہتا ہے تو سارا عالم فیکون کی تشریح بن جاتا ہے۔

کیا وہ رب قادر نہیں کہ تم جو چاہتے ہو وہ تمہیں عطا کر دیتا؟ کیا وہ رب قادر نہیں کہ تمہیں نظر آنے والے اندھیروں کو روشنی میں بدل دیتا؟ کیا اس رب کو نہیں معلوم کالک کیسے مٹائی جاتی ہے؟ کیا وہ دلوں کے داغ دھو نہیں سکتا؟ کیا وہ تمہیں وہ گھٹیا سی چیز نہیں دے سکتا جس کے لیے تم نے طویل سجدے کرنا چھوڑ دیے؟ اس ذات کے ہر حکم پر اپنے دل کو بند کر لیا۔۔۔تمہاری یہ ذلیل سی خواہشیں اس کے بس ایک کُن کی مار ہیں لیکن اس نے کن نہیں کہا۔۔۔تم اس کا شکر ادا کیوں نہیں کرتے۔۔؟ وہ نااہل ماں کی طرح

اپنے بندوں کی خواہشوں پہ کن نہیں کہتا۔۔ سوچو! اگر وہ تمہاری دعاؤں کی آمین کو قبول کر کے تمہیں وہ عطا کر دے جو تم مانگ رہے ہو اور پھر تمہاری دعا کو تمہارے لیے بد دعا بنا دے تو تم کیا کرو گے؟ تم کہاں جاؤ گے؟ اس آسمان اور زمین میں اور کون ہے جو تمہیں تمہاری قبول ہوئی دعا سے پھر بچائے گا؟ کیا وہ اللہ بہتر نہیں جانتا۔۔؟ کیا اس نے تم سے تمہاری خواہشیں لے کر تمہارے لیے بہترین نہیں سوچ رکھا ہو گا؟ وہ تو اپنے دیے گئے مال میں سے جب لیتا ہے تو کہتا ہے اللہ کو قرض دو۔۔۔ پھر وہ تمہاری خواہش لے گا تو تمہیں رول دے گا؟ وہ تمہیں تنہا چھوڑ دے گا؟ ایک دفعہ اس پہ یقین کر کے تو دیکھو۔۔۔ یوسف کو گیارہ بھائیاں میں سے اللہ نے نکالا۔۔ یعقوب کی آنکھوں کی بینائی چلی گئی۔۔۔ لیکن اللہ نے صبر کروایا اور پھر صبر کا پھل کیسے دیا؟ جب یوسف اپنے بھائیوں کے سامنے آئے تو شاہِ مصر تھے۔۔ اللہ کی مصلحتوں کو تم جان سکتے ہو؟ اس نے یونس کو مچھلی کے پیٹ میں زندہ رکھا۔۔۔ وہ اس ذات کے پیارے نبی تھے۔۔۔ نبی بھی آزمائے گئے۔۔۔ تم تو ایک عام سے انسان ہو۔ تم اللہ اللہ کرتے ہو تو وہ تمہیں آزمائے بغیر چھوڑ دے گا؟ وہ تم سے لیے بغیر تمہیں چھوڑ دے گا؟

نہیں! وہ تمہیں آزمائے گا۔۔۔ بس تم یقین رکھو۔ وہ دیتا ہے شکر کرو، وہ لیتا ہے صبر کرو۔۔۔ انتہا پہ نہ جاؤ۔۔۔ انتہا پہ جانا اسے بھی آتا ہے۔۔۔ وہ اندھیری رات اسی کے قبضے میں ہے جس کی کبھی صبح نہیں ہونی!!!۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

آپکی قیمتی رائے کا انتظار رہے گا۔۔

ختم شُد

محبت اب اور نہیں!

مریم جہانگیر کا معاشرے کے ایک نہایت اہم مسئلہ کو اجاگر کرتا ہوا یہ ناول بہت جلد کتابی شکل میں دستیاب ہو گا۔ اپنی کاپی آج ہی بک کرنے کے لئے ہم سے رابطہ کریں۔ رابطہ کے لئے یہاں کلک کریں۔